حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ

خطباتِ حکیم الاسلام

جلد — ۶

آیات احادیث پر مکمل اعراب اور تخریج و تحقیق کے ساتھ ۱۳۰ ایمان افروز خطبات کا مجموعہ جس میں زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق اسلام کی تعلیمات کو حکیمانہ اسلوب میں پیش کیا گیا ہے جس کا مطالعہ قلب و نظر کو پاکیزگی اور فکر و روح کو بصیرت و تازگی بخشتا ہے

مرتب: **مولانا قاری محمد ادریس ہوشیارپوری صاحب مدظلہ**
بانی و مدیر: دار العلوم رحیمیہ ملتان

تخریج و تحقیق

مولانا محمد اصغر صاحب فاضل جامعہ دار العلوم کراچی	**مولانا راشد محمود راجہ صاحب** متخصص فی الحدیث جامعہ فاروقیہ کراچی	**مولانا ساجد محمود صاحب** متخصص فی الحدیث جامعہ فاروقیہ کراچی

تقدیم و نگرانی: **مولانا ابن الحسن عباسی صاحب مدظلہ**

بیت السلام
پبلشرز • کراچی • پاکستان

قرآن وسنت اور مستند علمی کتب کی معیاری اشاعت کا مرکز

- جملہ حقوق .... بحق ناشر محفوظ ہیں
- طبع جدید .... اکتوبر 2011ء
- تعداد 1100
- ناشر .... بیت السلام

بیت السلام
ریاض • کراچی • پاکستان

نزد مقدس مسجد، اردو بازار، کراچی۔ فون 021-32711878
موبائل: 0321-3817[illegible]9 ای میل: barussalam_pk@yahoo.com

علمی معجزہ 9
معجزہ دلیل نبوت ہے 9
آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عملی معجزات کا تفوق ... 11
سب سے بڑا معجزہ 12
حقیقت معجزہ 13
کلامی معجزے کے سامنے اہل کلام کی بے بسی ... 13
انسانی صفات کی حد اعجاز 14
اعجاز کلام 15
معرفت اوصاف متکلم 16
متکلم حقیقی 17
قرآن کریم کی اعجاز نمائی 18
شرائط طلب 19
امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ 19
رعایت مقام 20
شان عمل اور شان اجتہاد 21
شرط معرفت 22
سلب توفیق 23
مشتبہ چندے سے احتراز 24
شانِ اتقیاء 25
کمال دانشمندی 26
عمل بالقرآن سے انبیاء بنی اسرائیل سے مماثل. 26
علمی معجزے کا امتیاز 26
دوام کتاب دوام نبوت کو مستلزم ہے 27
معارضۂ قرآن کا عذاب 27
افتراق امت کے عذاب سے بچنے کا راستہ 28
علوم القرآن 29
کتاب مبین کا خاصہ 30
اصلاحی نصاب 30
مرکز علوم 31
تحریک 31
خلافت تجوید 33
جوہر دنیا 33
امتیازی عطیہ 33
امتیاز مسلم 34
امتیازی کتاب 34
صوت سرمدی 34
عظمت کلام 35
خلافت تجوید وقرات 35
امتیازی حفاظت 36
حفاظت بطریق حفظ 38
حفاظت بطریق کتابت 38
حفاظت بطریق تواتر 39
محیط بالدیانت کتاب 39
سند قرآن پر از روئے قرآن بحث 40
عظیم شہادت 42
عظمت سند 42
تواتر طبقہ 43
ہمہ گیر ابدی حفاظت 43
تغنی بالقرآن 45
تحریک 45
نجوم ہدایت 47
مقام صحابیت 47
سنن صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم 48
سب وشتم کا انجام 48
جامع اضداد زندگی 49
کامل انسانیت کا طبقہ 49

ختم نبوت 50
مکمل میزان اور متوازن ترازو 50
صحابہ رضی اللہ عنہم کا معیار حق ہونا منصوص ہے 52
فرق اسلامیہ کے حق و باطل ہونے کا معیار 52
اطاعت صحابہ رضی اللہ عنہم اطاعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے 53
معیار تو ملی تقلید نہیں ہوتا 54
حق دستیاب بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سے ہوگا 54
ناقدین صحابہ رضی اللہ عنہم کا دین سلامت نہیں رہ سکتا 55
فرقہ ناجیہ اہلسنت والجماعت 56
ذہنی غلامی کے بغیر چارۂ کار نہیں 56
ناقدین صحابہ رضی اللہ عنہم افتراق امت کا سبب ہیں۔ 57
خود اپنے معیار حق ہونے کا ادعاء 58
صحابہ رضی اللہ عنہم کی اجتماعی اطاعت 58
تا قیامت معیار شخصیت رہے گا 58
ضمیمہ 61
ذہنی غلامی اور تقلید 61
آغاز بخاری 63
کلمات تمہید 63
رعایت حفظ 64
امتحان حفظ 65
جلالت کتاب 65
اسماء الرجال 66
میزان حدیث 66
انتخاب احادیث 66
شان قبولیت 67
موضوع کتاب 67
عصمت انبیاء علیہم السلام 67
حفاظت اولیاء 67
غرض کتاب 68
وساطت حدیث 68
بیان القرآن 68
اہمیت فن حدیث 69
حمد و نعت سے ابتداء نہ کرنے کی وجہ 69
ہر حدیث کی ابتداء میں اذکار عشرہ 70
ابتداء کتاب میں اتباع سنت کا اہتمام 71
ترجمۃ الباب اور حدیث میں مناسبت 71
امام رحمۃ اللہ علیہ کا تفقہ 72
درجۂ اجتہاد 73
تشریح حدیث 73
اصل کلی 73
اتفاق نیت 74
ابتداء ظہور عمل 74
ثمرات نیت 75
واقعہ جزئی 75
جامعیت حدیث 75
ضروری تنبیہ 76
دعاء 76
تعلیم و تدریس 78
احوال واقعی 78
شرف انسانی کے بارے میں دعویٰ شریعت 78
شرف انسانی کے بارے میں دعویٰ عقل 79
حکماء کی نظر میں وجہ اشرفیت 79
حکماء کے نظریے کی غلطی 79
علم محض بھی وجہ شرافت نہیں 80
انسان کے علاوہ دیگر مخلوقات کو بھی علم حاصل ہے 80

علم و عقل میں اگر انسان اور دیگر مخلوقات میں کچھ فرق ہے تو خود انسانوں میں بھی باہم فرق ہے 84
تمام مخلوقات میں علم و فہم کے درجات 87
انتقالِ علوم انسانی خصوصیت ہے 88
عظمتِ تعلیم نبوی صلی اللہ علیہ وسلم 89
حصرِ تعلیمِ باطن 89
نبوت تعلیم ہی ہے 91
بلا تعلیم انسانیت ختم ہو جاتی ہے 91
مدارس بقاءِ انسانیت کا ذریعہ ہیں 91
علمِ مستند 92
علمی وراثت کی شرط 92
علوم اسلامیہ کی خصوصیت 93
اہتمامِ استناد 93
بقاءِ سلاسل تعلیم ہی کے ذریعے ممکن ہے 94
تردیدِ باطل تعلیم پر موقوف ہے 94
تعلیم و تعلم کے لحاظ سے برگزیدہ شخصیت 95
افادیتِ مدارس 95
درجاتِ تربیت 95
بلا تعلیم ربانیت پیدا نہیں ہوتی 96
عظمتِ استاد 97
نسبتِ علمی 97
قبولیتِ نسبت 98
عزتِ نسبت 99
تاثیر الاعمال 101
تمہید 101
خواصِ اعیان 101
خواصِ افعال 101
روزے کی خصوصیت 102
زکوٰۃ کی خصوصیت 102
تطہیرِ خواص کی شرط 102
ماہرینِ خواص کی اطاعت 103
نماز کی خصوصیت 104
دیدارِ خداوندی کے مراتب 104
فجر و عصر کی خصوصیت 104
فجر و عصر میں نزولِ ملائکہ کی حکمت 105
خلافتِ آدم پر شبہ کا حاکمانہ جواب 106
خلافتِ آدم پر شبہ کا حکیمانہ جواب 106
ملائکہ پر اتمامِ حجت 109
ذکرِ انسانی پر نظامِ دنیا قائم ہے 109
جلوۂ خداوندی روحِ عبادت ہے 110
دنیا میں تجلیاتِ ربانی کا ظہور 110
تجلیٔ اخروی 111
دربارِ خداوندی کا انعقاد 111
آخرت میں رؤیتِ خداوندی کا مقام 111
دربارِ خداوندی میں اہلِ جنت کی شرکت 111
دربارِ خداوندی میں شرابِ طہور کا دور 112
حضرت داؤد علیہ السلام کی تلاوتِ مناجات 112
جمالِ خداوندی کے دیدار کا سوال 113
نعمتِ مزید 113
یوم المزید اور اس کے آداب 114
رؤیت الباری کے بارے میں معتزلہ کا مسلک 115
مسلکِ اہلِ حق 115
مناظرے میں معتزلہ کی شکست 115
دیدارِ خداوندی میں درجہ بدرجہ ترقی 116
روح کا عروج اور عرش کے سامنے سجدہ 117
دنیوی جذبات کا برزخ میں ظہور 117

دنیوی جذبات کا آخرت میں ظہور 118
سایۂ عرش میں اشتیاقِ نماز 119
لطفِ نماز 119
حقیقی عبادت 119
جذبۂ عبادت کی تسکین 121
مجموعۂ شریعت پر عمل کی تاثیر 121
علم وعمل کی بنیادیں 122
صدقِ طلب 122
حکیمانہ بات 124
احترامِ جلسہ 124
آدابِ دعاء 126
سید الایام 126
شانِ جامعیت 126
اجزائے انسان کی جمعیت 126
جمعِ شرائع 127
اجتماعِ قیامت 127
تعیینِ جمعہ میں اقوام کا امتحان 128
جمعہ میں قبولیتِ دعا کی گھڑی 129
قلبی دعا قابلِ قبول ہے 129
مالِ حرام قبولیتِ دعا میں مانع ہے 129
دعا بالقبول 130
وسعتِ رحمت کے منافی قید سے بھی دعا رد ہو جاتی ہے 131
مانگنے کا ڈھنگ 131
فوری قبولیت 131
اثر یا قبولیت 131
تاخیرِ قبولیت 132
مصلحتِ تاخیر 132
تاخیرِ قبولیت پر تشکر 132
دعا کا اُخروی ذخیرہ 133
دعا میں تفویض 134
دعا کا مقامِ عبادت 134
سوال ممانعت 134
سوالِ محبت 135
خود فرمائش 136
ترکِ تکلف 136
اسلامی بے تکلفی 136
ذلتِ سوال 137
بندہ کے سوال سے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی 138
تعلیمِ دعا 138
علاماتِ قبولیت 139
اہلِ قبولیت سے مشابہت کا اثر 139
اسلامی صورت 140
محبتِ باسمِ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ثمرہ 140
مشابہت کا تمدنی فائدہ 141
سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے کمالِ عشق ومحبت 142
عطیۂ خداوندی کی قدر ومنزلت 142
احترامِ رزق 143
احترامِ لباس 143
ہیبتِ احترام 144
احکامِ شریعت میں فوائدِ اُخروی ودنیوی 144
آثارِ لباس 145
حرفِ آخر 146
الہامی ادارہ اور اس کے فضلاء کی تنظیم 147
قیامِ دارالعلوم، اسباب ومحرکات 147
حسبِ اوّل 148
مرکزِ روحانیت 148

دارالعلوم کی شانِ تجدید 149
مرکزِ اتحاد 149
تنظیم کی ضرورت 149
مقصدِ تنظیم 150
تنظیمِ خدمات 151
وسعتِ دارالعلوم 151
معیارِ اہتمام 151
معیارِ طلباء 152
تنظیم کے فوائد 153
اجلاسِ صد سالہ 154
تقریظ از: حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانیؒ 156
تقریظ از: حضرت مولانا محمد اعزاز علی صاحب 157
تقریظ از: جناب ڈاکٹر محمد زکی الدین صاحب 158
سائنس اور اسلام 161
تمہید 161
فنِ سائنس کا موضوع 163
عناصر کی قوتوں کا باہمی تفاوت اور اس کا اصولی معیار 164
عنصرِ خاک 165
عنصرِ آتش 168
عنصرِ آب 168
عنصرِ ہوا 169
جامع العناصر انسان اور اس کی طاقت 170
عناصر میں انسانی تصرفات 171
عناصر میں انسانی ایجادات 172
انسانی طاقت و تسخیر کا راز اس کی روح میں مضمر ہے .. 175
روحِ انسانی کی لطافت اور حسی نورانیت 176
روحِ انسانی کی معنوی لطافت و طاقت 177
صفاتِ روح سے الٰہیات پر استدلال 178
روح کی طاقتوں کا غلط استعمال 181
قوائے روح کے غلط استعمال کا نتیجہ حرمان و خسران ہے 184
روحانی طاقتوں کے محیر العقول کارنامے 185
مادی تصرف کوئی حقیقی کمال نہیں 187
انسان میں محتاجگی کا اصل مادہ ہے 188
عناصرِ اربعہ کے اخلاق اور ان کی محتاجانہ خاصیتیں .. 188
مٹی اور اس کے جبلی اخلاق 188
آگ اور اس کے جبلی اخلاق 190
ہوا اور اس کے جبلی اخلاق 191
پانی اور اس کے جبلی اخلاق 191
رذائلِ نفس کے چار اصول 192
فضائلِ نفس کے چار اصول 192
اخلاق کا ظہور اعمال کے بغیر ممکن نہیں 192
مادی اخلاق کا مظہر فعلِ امساک ہے 192
روحانی اخلاق کا مظہر فعلِ انفاق ہے 193
صدقہ سے فنا کس طرح حاصل ہو سکتا ہے 193
مادیات سے استغناء ہی تعلق مع اللہ کی بنیاد ہے 195
تعلق مع اللہ کی قوت ہی سے روحانی عجائبات اور خوارق کا ظہور ہوتا ہے 195
سائنس محض کبھی یہ فضا پیدا نہیں کر سکتی 196
سائنس اور اسلام میں وسیلہ و مقصود کی نسبت ہے 197
خلاصہ 198
سائنس اور اسلام کی حقیقتوں کا باہم تقاضہ کیا ہے؟ .. 198
مادیاتِ محضہ کی مضرتیں 200
طلبائے یونیورسٹی کو خطاب و موعظہ 200
مادیات کی مضرتیں رفع کرنے کا طریقہ 200
استحکامِ توحید 201
یادِ حق اور اس کا ابتدائی آسان طریقہ 201

صحبت صلحاء اور اہل اللہ سے رابطہ 202

خلاصۂ بحث 203

مباحث تقریر کا ربط حدیث زیب عنوان سے 204

مباحث حدیث کے لطیف نتائج 205

لطافتِ روح غذا ہی بننے میں منحصر ہے 206

اسلام کی بنیادی حقیقت 206

سائنس کی جڑ بنیاد کیا ہے؟ 207

ایک غلط فہمی کا ازالہ 209

طلبائے یونیورسٹی کے لئے مقامِ عبرت 210

خاتمۂ کلام اور خلاصۂ نصیحت 211

علمی معجزہ

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ. وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَافَّةٍ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

اَمَّا بَعْدُ!..... فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ، وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ، اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ﴾ صَدَقَ اللّٰهُ الْعَظِيْمُ ①

معجزہ دلیلِ نبوّت ہے ..... بزرگانِ محترم! انبیاء علیہم السلام کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے مختلف معجزات دیئے ہیں معجزہ چونکہ دلیلِ نبوت ہوتا ہے۔ تو وہ نبی ہی کے ہاتھ پر ظاہر ہوتا ہے غیر نبی کے ہاتھ پر ظاہر نہیں ہوتا۔ اور گویا یہ فعلِ خداوندی ہے کہ اس کی مثل لانے سے مخلوق عاجز ہوتی ہے۔

چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ معجزہ دیا تھا کہ وہ اللہ کے حکم سے مردوں کو زندہ کرتے تھے۔ تو احیائے موتیٰ ان کا معجزہ تھا۔ اسی طرح اندھے مادرزاد کی آنکھوں پر ہاتھ پھیرتے تھے۔ ان میں بینائی آ جاتی تھی۔ جذامیوں اور کوڑھیوں پر ہاتھ پھیرتے تھے، ان کا بدن صاف ستھرا بن جاتا تھا۔ بلکہ اس دور کے ڈاکٹر اور اطباء عاجز آ گئے تھے اور ان بیماریوں کو لاعلاج سمجھا گیا تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جب یہ معجزہ ظاہر کیا تو دنیا سمجھ گئی کہ یہ اسباب کے درجے کی چیز نہیں ہے ضرور مسبب الاسباب کی طرف سے یہ کوئی کرشمہ اور خرقِ عادت ہے۔ یہ ان کی نبوت کی دلیل تھی۔

موسیٰ علیہ السلام آئے ان کو عصاءِ موسیٰ دیا گیا۔ جس کی خاصیت یہ تھی کہ اسے زمین پر ڈالتے تھے تو وہ اژدھا بن جاتا تھا، ہاتھ میں تھام لیتے تھے تو لکڑی بن جاتی تھی۔

اسی طرح یدِ بیضاء ان کو عطا کیا گیا۔ گریبان میں ہاتھ ڈال کر نکالتے تھے تو سورج کی طرح ان کا ہاتھ چمکتا تھا۔ ہر سو روشنی پھیل جاتی تھی۔ دنیا نے سمجھ لیا کہ یہ چیزیں دوسرا کوئی دکھلانے والا نہیں۔ یقیناً یہ خدا کی طرف سے

---

① پارہ: ۲۷ سورۃ الحدید، الآیۃ: ۲۵.

اس شخص کی نبوت اور رسالت پر دلیل ہے۔ جو سفیر خداوندی ہے اور اس کی سفارت لے کر آیا ہے۔

ابراہیم علیہ السلام نے نبوت کا دعویٰ کیا اور اللہ نے ان کے ہاتھ پر خرقِ عادت ظاہر کی کہ ان کو دہکتی ہوئی آگ میں ڈالا گیا اور آگ بردوسلام بن گئی۔ دنیا نے دیکھ لیا کہ یہ چیز دکھلانے والا رب ابراہیم علیہ السلام کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہے۔ ان کے ہاتھ پر ایک ایسا عجیب معجزہ ظاہر ہوا جو ان کے مبعوث من اللہ ہونے کی دلیل ہے۔ تو نارِ خلیل ان کو دی گئی۔ دیگر انبیاء علیہم السلام کو بھی معجزات دیئے گئے۔ حضرت شعیب علیہ السلام کو ظلہ شعیب دیا گیا قوم نے جب نہ مانا تو ابر آیا اور ابر میں سے انگارے برسے۔ قوم عذاب میں مبتلا ہوئی۔ حضرت ہود علیہ السلام آئے تو ہوا کا معجزہ دیا گیا قوم نے نافرمانی کی تیز آندھی چلی اور سات دن تک چلتی رہی یہ چھوٹی موٹی آندھی نہیں تھی اتنی عظیم آندھی تھی کہ اس نے بستیوں کو اٹھا اٹھا کر پھینکا ہے۔

حدیث میں فرمایا گیا کہ قوم عاد کے جانوروں کی آوازیں فضا میں سنی جاتی تھیں مکانات اوپر جاتے تھے پھر پٹخے جاتے تھے۔ یہ معجزہ تھا جس سے سمجھ لیا گیا کہ یہ شخص بے شک مبعوث من اللہ ہے۔

حضرت صالح علیہ السلام کو ناقہ صالحہ دی گئی۔ قوم نے مطالبہ کیا کہ کوئی دلیل لاؤ کوئی سند لاؤ کہ ہم تمہیں نبی سمجھیں۔ فرمایا۔ جو تم مانگو۔ انہوں نے کہا کہ پتھر میں سے اونٹنی نکالو۔ ظاہر ہے کہ بشر کا یہ کام نہیں ہے کہ پتھر میں سے اونٹنی نکال دے۔ یہ تو اسی ذات کا کام ہے جس کی شان یہ ہے کہ: ﴿یُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَیُخْرِجُ الْمَیِّتَ مِنَ الْحَیِّ﴾ ① زندہ میں سے مردہ نکال دے اور مردہ میں سے زندہ پیدا کردے۔ تو پتھر جیسی ظاہری طور پر ایک بے جان چیز میں سے جاندار کو نکالنا یہ معجزہ تھا آپ یہ معجزہ رات دن دیکھتے رہتے ہیں مگر چونکہ رات دن کا قصہ ہے اس لئے وہ عجیب معلوم نہیں ہوتا انسان کی پیدائش کیا معجزہ نہیں ہے؟ ایک جماد لا یعقل، ایک بے حقیقت قطرہ اس پانی پر نقاشی کرنا، نقش کھینچنا اور گندے قطرے میں سے ایک پاکباز انسان نکال کر تیار کرنا، بے عقل چیز میں سے عاقل انسان پیدا کردینا۔ بے جان چیز میں سے جان دار چیز کو نکالنا، بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ پتھر کے اندر سے اونٹنی نکال دی گئی۔ مگر چونکہ رات دن یہ قصہ ہمارے سامنے ہے۔ اس لئے مشکل اور عجیب نہیں معلوم ہوتا ورنہ معجزات رات دن ظاہر ہوتے رہتے ہیں اور اللہ کی قدرت کی نشانیاں نمایاں ہوتی رہتی ہیں۔ تو حضرت صالح علیہ السلام کا معجزہ ناقہ صالح تھی۔

یوسف علیہ السلام کو قمیص یوسف دیا گیا۔ وہ یعقوب علیہ السلام کے چہرہ مبارک پر ڈالا گیا قمیص کا ڈالنا تھا کہ بارہ برس کی بینائی جو ضائع ہوئی تھی پانچ منٹ بعد لوٹ آئی اور آنکھیں روشن ہوگئیں۔ یہ حضرت یوسف علیہ السلام کا معجزہ تھا۔ داؤد علیہ السلام کو الانۃ (نرمی) حدید کا معجزہ دیا گیا۔ لوہے کو ہاتھوں میں پکڑتے تھے وہ موم کی طرح سے نرم جاتا تھا۔ جس طرح چاہتے اس سے سامان بنا لیتے تھے۔

---

① پارہ: ۲۱ سورۃ الروم، الآیۃ: ۱۹۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کو تسخیر ریاح کا معجزہ دیا گیا۔ ہوائیں مسخر تھیں ان کے حکم سے ہوائیں تخت اڑاتی تھیں۔ سواریاں لے جاتی تھیں۔ ہوا پر وہ کام ہوتا تھا جو زمین پر سواری کو چلانے کا ہوتا ہے۔ اسی کو فرمایا گیا ﴿فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيحَ تَجْرِي بِأَمْرِهِ رُخَاءً حَيْثُ أَصَابَ﴾ ① بہر حال تسخیر ریاح یہ سلیمان علیہ السلام کا معجزہ تھا۔

اسی طرح منطق الطیر کا معجزہ بھی دیا گیا۔ پرندوں کی بولیوں کا جاننا اور سمجھنا اور اس پر احکام مرتب کرنا یہ اعجاز سلیمانی تھا۔ تو داؤد علیہ السلام کو الانۃ حدید یعنی لوہے کو نرمادینے کا معجزہ دیا گیا، سلیمان علیہ السلام کو تسخیر ریاح، موسیٰ علیہ السلام کو عصا اور ید بیضا اور عیسیٰ علیہ السلام کو احیائے موتی کا معجزہ دیا گیا۔ یہ تمام معجزے درحقیقت ان کی نبوت کے دلائل تھے تاکہ یہ سمجھا جائے کہ یہ مبعوث من اللہ ہیں۔ خدا کی طرف سے آئے ہیں اور اس کا پیغام پہنچا رہے ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عملی معجزات کا تفوق …… جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس قسم کے ہزاروں معجزات عطاء کئے گئے۔ اگر عیسیٰ علیہ السلام کو احیائے موتی کا معجزہ دیا گیا کہ ان کے ارشاد سے مردے زندہ ہوتے تھے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر استوانہ حنانہ کو زندگی عطاء کی گئی۔

واقعہ آپ نے سنا ہوگا احادیث میں صراحۃً موجود ہے کہ منبر بننے سے قبل مسجد نبوی میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب خطبہ ارشاد فرماتے تھے۔ تو کھجور کا ایک سوکھا ہوا تنا کھڑا ہوا تھا، جس کو کاٹ دیا گیا تھا اس پر ٹیک لگا کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ ارشاد فرماتے تھے۔ ایک مدت دراز تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر ٹیک لگا کر خطبہ پڑھا، جب منبر تیار ہو گیا اس پر خطبہ پڑھنے کے لئے تشریف لے گئے تو حدیث میں موجود ہے اس ستون میں سے آہ و بکاء کی آوازیں نکلنا شروع ہوئیں اس طرح سے اس نے بلک بلک کر رونا شروع کیا جیسے فراق زدہ انسان روتا ہے۔ اور جب چیخ و پکار بڑھی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم منبر سے اترے، اس پر ہاتھ رکھا اور اس طرح دلاسہ دیا جس طرح سسکتے ہوئے بچے کو چپ کرایا جاتا ہے، وہ چپ ہوا۔ ②

تو عیسیٰ علیہ السلام نے اگر مردے کو زندہ کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزے سے ایک سوکھا ہوا تنا زندہ بنا۔ یہ معجزہ اس سے کہیں زیادہ بلند تر ہے۔ اس لئے کہ انسانی لاش میں بہر حال پہلے جان موجود تھی۔ اگر دوبارہ لوٹ آئے تو اس روح کو اس بدن سے مناسبت تھی۔ اگر نکل سکتی تھی۔ تو داخل بھی ہو سکتی تھی اپنے محل اور مکان میں پہنچ گئی۔ اپنے سانچے میں آ کر ڈھل گئی۔

لیکن کھجور کا ایک تنا زندہ ہو اور زندہ ہو کر وہ آثار ظاہر ہوں جو جاندار میں سے ظاہر ہوتے ہیں اگر فقط اتنی زندگی ہوتی کہ اس پر ہرے پتے لگ جاتے تو کہا جاتا کہ اس کے اندر روح نباتی آ گئی۔ روح نباتی اگر اس کے خشک ہونے کی وجہ سے چلی گئی تھی وہ دوبارہ لوٹ آئی، اس کا محل تھا۔ جیسے مردے میں جان آ جائے۔

---

① پارہ: ۲۳، سورۃ ص، الآیۃ: ۳۶۔

② السنن لابن ماجه، كتاب الصلوة والسنة فيها، باب ماجاء في بدء شان المنبر ج: ۳ ص: ۳۳۴

لیکن جان آئی تو ایسی آئی جو جانداروں کی سی جان ہے۔ یعنی روح حیوانی داخل ہوئی نہ صرف روح حیوانی بلکہ انسانی افعال ظاہر ہوئے۔ تو روح انسانی داخل ہوئی اور انسانی افعال میں سے وہ افعال سرزد ہوئے جو عشاق خداوندی سے سرزد ہوتے ہیں عاشقان الٰہی کی طرح فراق نبوی میں رونا اور چلانا شروع کیا جو ایک عاشق خداوندی کا کام ہے۔ تو ایک کھجور کے خشک تنے میں جان بھی آئی تو انسانوں جیسی بلکہ کامل انسانوں جیسی تو یہ اس سے بڑا معجزہ ہے کہ ایک لاش کے اندر انسانی جان آئے جو انسان ہی کی لاش تھی۔ لاش تو ہو درخت کی اور روح اس میں کامل انسان کی پڑے یہ کہیں زیادہ اونچی بات ہے بہ نسبت اس احیاء موتی کے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی احیائے موتی کا معجزہ دیا گیا۔

اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عصا اور ید بیضاء عطاء کیا گیا کہ ہاتھ روشن ہوتا تھا تو حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی جن کا نام غالباً حنیفؓ ہے وہ جنگل میں جا رہے تھے۔ سخت اندھیرا تھا، راستہ ملتا نہیں تھا۔ حق تعالیٰ سے دعا کی کہ یا اللہ راستے کی کوئی صورت ہو؟ کسی طرح سے مجھے راہ ملے۔

حدیث میں ہے کہ ان کی لاٹھی اس طرح روشن کر دی گئی کہ پورے جنگل میں روشنی پھیلی اور راہ نظر آنے لگی۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض صحبت سے صحابہ کرامؓ میں یہ کرامتیں پائی گئیں۔ یہ معجزہ ہی کا اثر تھا۔ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسمہ کا معجزہ کہلائے گا جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم کے ہاتھ پر ظاہر ہوا۔ تو جتنے بھی انبیاء علیہم السلام کو معجزات دیئے گئے وہ سب کے سب بلکہ بدرجہا زائد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی عطاء فرمائے گئے۔

سب سے بڑا معجزہ...... لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات میں سب سے بڑا معجزہ جو انبیائے سابقین کو نہیں دیا گیا وہ معجزہ فی الحقیقت علمی معجزہ ہے۔ جس کو قرآن حکیم کہا جاتا ہے کہ ایک کتاب اور شریعت لا کر پیش کی جو جامع ہدایات ہے۔ اسلوب بیان کے اعتبار سے دیکھا جائے تو معجزہ ہے اس کی فصاحت و بلاغت وہ ہے کہ دنیا اس کے مقابلہ کرنے سے عاجز رہ گئی، معانی اور مضامین کے لحاظ سے انتہائی جامع ہے کہ اتنا جامع کلام پیش کرنے سے دنیا عاجز آ گئی۔

عرب کے لوگ فصاحت و بلاغت میں بے مثل تھے۔ ان کو دعویٰ تھا کہ ہم عرب ہیں باقی ساری کی ساری دنیا عجم ہے۔ عجم کے معنی گونگے کے ہیں۔ وہ اپنے مقابلے میں پوری دنیا کو گونگا جانتے تھے کہ نہ انہیں بولنا آتا ہے نہ یہ شادی اور غم کی شرح کر سکتے ہیں، نہ وہ اسالیب بیان ان کے ہاتھ میں ہیں جو عربوں کے ہاتھ میں ہیں قصائد لکھتے تھے اور دنیا کو چیلنج کرتے تھے کہ کوئی ہے جو ان کا مقابلہ کرے؟ ان جیسا قصیدہ لائے؟ بیت اللہ میں قصیدے ٹانگے جاتے تھے چیلنج دیا جاتا تھا کہ کوئی ان کا مثل بنا کر لائے۔ یہ گویا اس زمانے میں عام دستور تھا۔ اور عربوں کی فصاحت و بلاغت اس حد پر پہنچ چکی تھی کہ ان کی پانچ چھ برس کی بچیاں ننانوے ننانوے اشعار کے نہایت بدیہہ قصائد برجستہ پڑھ جاتی تھیں۔ یہ سبعہ معلقہ جو درس نظامی میں پڑھائی جاتی ہے یہ وہی سات قصیدے ہیں جو بیت اللہ میں لٹکائے گئے تھے اور چیلنج کیا گیا تھا کہ کوئی ان کا مثل لائے۔

غرض اس زمانے میں عربوں کے اندر فصاحت و بلاغت کا زور تھا، اس وقت کا معجزہ جو جناب نبی صلی اللہ علیہ

وسلم نے لاکر پیش کیا وہ فصاحت و بلاغت ہی کا معجزہ تھا جس کو قرآن کریم کہا جاتا تھا کہ انہوں نے اگر قصائد لٹکا کر چیلنج کیا اللہ نے قرآن اتار کر چیلنج کیا ﴿قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا﴾ ① ”اگر جن اور انسان سب مل کر مجتمع ہو جائیں اور اس قرآن کا مثل بنانا چاہیں تو ان کو قدرت نہیں ہے کہ وہ بنا سکیں“۔ اس لئے کہ یہ بشر کا کلام نہیں ہے یہ خدا کا کلام ہے۔

حقیقتِ معجزہ...... جس سے سب عاجز آجائیں یہ دلیل ہوتی ہے کہ یہ بشر کے قبضہ قدرت کی بات نہیں ہے۔ آج آپ پہچانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ سورج اور چاند خدا کا فعل ہے اس لئے کہ سارے انسان مل کر چاہیں تو سورج کی ایک کرن نہیں بنا سکتے۔ آپ کہتے ہیں زمین خدا کی بنائی ہوئی ہے۔ دلیل یہی دے دیتے ہیں کہ سارے انسان جمع ہو جائیں تو زمین کا ایک ذرہ نہیں پیدا کر سکتے۔ اس کے ذروں کو جوڑ توڑ کر اس سے کام لے لینا تو اور چیز ہے۔ لیکن ایک ذرہ بنا دیں جس میں وہی انبات وغیرہ کی تمام صلاحیتیں ہوں جو زمین میں ہیں دنیا کے سارے فلاسفر جمع ہو کر نہیں بنا سکتے۔ چاند اور سورج تو علویات و فلکیات میں سے ہیں ارضیات میں سے زمین کا ایک چھوٹے سے چھوٹا جز انسان نہیں بنا سکتا۔ درخت کی ایک پتی ایسی نہیں بنا سکتا جس میں وہی خاصیتیں ہوں جو اللہ نے کسی پتے میں رکھی ہوں یہ الگ چیز ہے کہ آپ زمین کے اجزاء میں ترکیب اور تحلیل کر کے اس سے کوئی نئی چیز پیدا کر لیں۔ مگر پیدا کرنے میں آپ اسی زمین کے اور اس کے ذروں کے محتاج رہیں گے۔ خود مادے کو اپنے ہاتھ سے بنالینا اور اس کو ایجاد کر لینا، عدم سے وجود میں لے آنا، یہ انسان اور بشر کی قدرت کی چیز نہیں ہے سارے انسان جمع ہو جائیں نہیں بنا سکتے۔ جس چیز سے سارے انسان عاجز آجائیں اس کی نظیر نہ لاسکیں اسی کو معجزہ کہتے ہیں۔

کلامی معجزے کے سامنے اہل کلام کی بے بسی...... اسی طرح کلام کے سلسلہ میں ساری دنیا کے فصحاء اور بلغاء عاجز آگئے اور وہ عرب عاجز آگئے جنہوں نے دنیا کو چیلنج کیا تھا کہ ہمارے مقابلہ پر کوئی فصاحت و بلاغت کا نمونہ لائے لیکن جب قرآن کی آیتیں پڑھی گئیں تو ہار مان لی اور کہا کہ ”اِنَّ فِيْهِ لَحَلَاوَةً وَّاِنَّ فِيْهِ لَطَرَاوَةً“ ② اس کلام میں عجیب قسم کی حلاوۃ اور شیرینی ہے کہ ہم پیدا کرنا چاہیں تو اس کا عشر عشیر بھی پیدا نہیں کر سکتے۔ غرض اس زمانے کے فصحاء اور بلغاء اس چیز کو مان گئے کہ ہم اس کی نظیر لانے سے عاجز ہیں۔

ورنہ آپ خود اندازہ کیجئے کہ جب چیلنج کیا گیا تو جن لوگوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو گھر سے بے گھر کیا، انتہائی ایذاء رسانی کی لڑائیاں ٹھانیں مقابلے کئے یہ ساری چیزیں تھیں۔ مگر ایک آیت کی نظیر لاکر پیش کر دی ہو، کسی نے یہ نہیں کیا۔ پورا قرآن تو بجائے خود ہے کسی ایک آیت کی نظیر نہیں دے سکے۔ اسی لئے قرآن نے پہلے تو یہ چیلنج کیا کہ: ﴿عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ﴾ ③ ”اس قرآن کا مثل لاؤ“۔

---

① پارہ:۱۵، سورۃ الاسراء، الآیۃ:۸۸۔ ② دلائل النبوۃ باب اعتراف مشرکی مکۃ ... ج:۲، ص:۵۷، رقم:۵۰۵۔ حدیث حسن ہے دیکھئے: تخریج احادیث الاحیاء ج:۲ ص:۳۰۴ رقم:۸۶۰۔ ③ پارہ:۱۵، سورۃ الاسراء، الآیۃ:۸۸۔

پھر تنزل کر کے کہا: ﴿قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ﴾ ① ”تم کہتے ہو کہ یہ اختراع کردہ کلام ہے تو اس قسم کی اختراع کردہ دس سورتیں تم بھی لاؤ“ پھر اور تنزل کیا اور کہا: ﴿فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ﴾ ② ”ایک ہی سورۃ اس جیسی بنا لاؤ“۔

سورت میں یہ بھی قید نہیں لگائی کہ سورت بقرہ جیسی سورت ہو جو ڈھائی پارے کی ہے۔ آل عمران جیسی سورۃ ہو یہ بھی قید نہیں ﴿اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ﴾ ③ کی طرح کی چھوٹی سی سورۃ بنا لاؤ۔ پھر اس سے تنزل کیا اور کہا کہ ﴿فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖٓ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ﴾ ④ ”اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو ایک بات ہی اس جیسی بنا لاؤ“۔ سورت تو بجائے خود ہے۔

تو اندازہ کیجئے اس قوم کے سامنے جو چیلنج دینے کی عادی تھی، اتنے بڑے چیلنج دیئے جائیں وہ دوسرے سارے مقابلے کرے، جتن کرے۔ لیکن کلام کی نظیر نہ پیش کر سکے تو وہ سمجھتی تھی کہ یہ بشر کی طاقت سے خارج ہے اس قدر فصاحت و بلاغت سے کلام کا بھرا ہوا ہونا یہ صرف اعجازِ خداوندی ہے۔

انسانی صفات کی حدِ اعجاز...... آپ اندازہ کیجئے کہ جتنی بھی انسانی صفات ہیں اور انسانی افعال ہیں ان میں ایک حد ایسی نکلتی ہے کہ وہاں پہنچ کر انسان عاجز ہو جاتا ہے۔ ایک حد تک قادر رہتا ہے پھر ایک حد پر جا کر عاجز ہو جاتا ہے اسی حد سے سمجھا جاتا ہے کہ آگے خدائی حدود ہیں۔ مثلاً آپ دیکھتے ہیں گویا آپ میں بصر کی طاقت ہے۔ آپ فرلانگ دو فرلانگ یا میل بھر کی چیز دیکھ لیں گے۔ آسمان کے ستارے دیکھ لیں گے۔ لیکن اس کے بعد؟ اس کے بعد نگاہ عاجز ہوگی اور ایک حد نکلے گی جہاں آپ کی نگاہ عاجز ہو جائے گی۔ آپ تحت الثریٰ کو نہیں دیکھ سکتے، صرف سطح کو دیکھ سکتے ہیں آپ کسی چیز کے اندرونی جوہر کو اپنی بصر سے نہیں دیکھ سکتے۔ بصر عاجز ہے۔ بہرحال آپ کی بصر دیکھے گی اسے دیکھنے کی قدرت ہے مگر ایک حد ایسی نکلے گی جہاں آ کر عجز کا اقرار کرنا پڑے گا کہ ہم نہیں دیکھ سکتے۔ اس سے آگے خدائی حدیں شروع ہو جاتی ہیں۔ ان کو دیکھنے والی صرف اللہ کی ذات ہے۔ اسی کی بصر ہے جو دیکھتی ہے۔

آپ میل دو میل یا پچاس میل کی بات سنیں گے۔ آلات کے ذریعے سے آپ مشرق و مغرب کی خبریں سن لیں گے لیکن آسمان کے اندر کی خبریں اور آوازیں بھی آپ سننے لگیں؟ آپ کی سماعت یہاں آ کر عاجز ہو جائے گی اس سے معلوم ہوا کہ آپ کی سمع و بصر اور تکلم بھی محدود۔ ہر چیز محدود ہے ایک حد کے اندر گھری ہوئی ہے۔ اس حد کے اوپر پہنچ کر آپ اپنے عجز کا اقرار کرتے ہیں۔ اس حد سے باہر خدائی قوتیں ہوتی ہیں۔

یہی صورت کلام کی بھی ہے کہ آپ کلام کرنے کے سلسلہ میں فصیح و بلیغ اور بہترین کلام کریں گے۔ آپ بہترین شاعر بن جائیں گے۔ آپ سے بڑھ کر کوئی اور پیدا ہوگا، وہ آپ سے اچھا کلام کرے گا۔ پھر اس سے اور

---

① پارہ: ۱۲، سورۃ ھود، الآیۃ: ۱۳۔ ② پارہ: ۱۱، سورۃ یونس، الآیۃ: ۳۸۔ ③ پارہ: ۳۰، سورۃ الکوثر، الآیۃ: ۱۔

④ پارہ: ۲۷، سورۃ الطور، الآیۃ: ۳۴۔

بڑھ کر پیدا ہوگا جو اور اچھا کلام کرے گا۔ مگر ایک حد ایسی نکلے گی کہ بشر وہاں عجز کا اقرار کرے گا کہ اتنے دقیق معانی کو میں چار الفاظ میں ادا کرنے پر قادر نہیں ہوں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم "اَفْصَحُ الْعَرَبِ وَالْعَجَمِ" ہیں۔ احادیث میں دقیق سے دقیق مضامین سہل سے سہل تعبیر سے ادا فرما دیئے گئے ہیں، دوزخ و نار کی کیفیات، جنت کی کیفیات، حشر کی کیفیات اور قبر کے احوال وغیرہ جو خالص کیفیاتی چیزیں ہیں ان کو اگر ادا کیا ہے تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سہل الفاظ میں ادا کیا ہے، تعبیر اور عنوان نہایت سہل، اور مضامین نہایت دقیق، ایک عامی آدمی سمجھے گا تو اپنی بساط کے مطابق سمجھے گا۔ اسی کلام کو ایک حکیم پڑھے تو اس میں سے حکمت کی باتیں نکالے گا، اسی کلام کو ایک عارف باللہ پڑھے تو معرفت کی باتیں نکالے گا۔ تو کلام چھوٹا سا ہے مگر مضامین اس میں بھرے ہوئے ہیں۔ احادیث کا ذخیرہ آپ کے سامنے ہے ان کی شرح میں ہزاروں کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان کی حد و نہایت نہیں۔ حدیث ایک ہے۔ ہر عالم نئے سے نئی اس کی شرح کرتا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس کے معانی کی کوئی حد و نہایت نہیں ہے، ایک عالم ایک پہلو لیتا ہے تو اس پہلو سے بے انتہا علوم نکلتے چلے آتے ہیں دوسرا عالم دوسرے پہلو پر غور کرتا ہے تو اس سے بے انتہا علم نکلتا چلا آتا ہے۔ حدیث ایک ہوتی ہے اس کے اندر سے ہزاروں دقائق اور معانی نکلتے آتے ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم "اَفْصَحُ الْعَرَبِ وَالْعَجَمِ" ہیں لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم خود فرماتے ہیں کہ قرآن کریم کے بارے میں میں بھی عاجز ہوں کہ میں ایسا کلام نہیں لا سکتا۔ یہ خدا ہی کا کلام ہے۔ تو ایک حد ایسی پیدا ہوئی کہ خالق ہی اس تعبیر کے اوپر قادر ہے۔ مخلوق کو قدرت نہیں دی گئی۔ تو تمام صفات میں: سمع، بصر، قدرت اور حیات ہو ان میں جیسے ایک حد اعجاز نکلتی ہے تو کلام میں بھی ایک حد اعجاز ہے اور وہی حد اعجاز معجزہ کہلاتی ہے۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن کریم کا معجزہ دیا گیا ہے۔

اعجاز کلام..... قرآن کریم کے معجزہ ہونے کے ثبوت میں مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان میں بڑے بڑے دلائل پیش کئے ہیں۔ موٹی سی ایک بات یہ ہے جو سمجھنے کی ہے۔ ہر شخص اسے سمجھے گا کہ ہر انسان پر مختلف کیفیات آتی ہیں جس کیفیت کا غلبہ ہوتا ہے اس حالت میں جو وہ کلام کرتا ہے وہی کیفیت اس کے کلام میں ہوتی ہے۔ اگر وہ یوں چاہے کہ اس وقت میرے کلام میں دوسری کیفیت آ جائے اسے قدرت نہیں ہوتی۔

مثلاً ایک شخص غمگین بیٹھا ہوا ہے خدانخواستہ کوئی میت ہو گئی، اس کا قلب غم میں ڈوبا ہوا ہے۔ اس وقت وہ جو بھی کلام کرے گا اس میں غم کے اثرات نمایاں ہوں گے اگر وہ یہ چاہے کہ میں اس وقت خوشی کا کلام کروں اسے قدرت نہیں ہو گی۔ اگر وہ تصنع اور بناوٹ کرکے چاہے بھی کہ میں خوشی کا بھرا ہوا کلام کروں ناممکن ہے۔ اس لئے کہ اس پر اس وقت غم کی کیفیت غالب ہے۔ جس چیز کا غلبہ ہوگا، وہی چیز اس کے کلام میں آئے گی۔

اگر ایک شخص پر خوشی ہے اس کے ہاں شادی ہو رہی ہے وہ جب بھی بولے گا۔ اس کے ہر ہر لفظ سے بے

ساختہ خوشی ٹپکے گی۔ اگر وہ یوں چاہے کہ میں ایسا کلام کروں جس سے بے انتہا غم ٹپکتا ہو۔ اس کی قدرت میں نہ ہوگا۔ کیونکہ وہ اس وقت خوشی سے مغلوب ہے۔ تو ہر کیفیت انسان پر جب آ کر غالب ہوتی ہے اس کیفیت کے تحت جب بھی کلام کرے گا تو کلام میں اسی کیفیت کا غلبہ ہوگا۔ ایک کیفیت سامنے آئے گی۔ دوسری مغلوب ہوگی۔

لیکن قرآن کریم کو دیکھا جاتا ہے ایک وقت میں ایک آیت نازل ہوئی اس کی ابتدا میں بے انتہاء جلال خداوندی کا اظہار معلوم ہوتا ہے اور اسی کے ساتھ دوسرے جملہ میں بے انتہاء جمال معلوم ہوتا ہے کہ بے انتہاء بشارتیں اس میں چھپی ہوئی ہیں۔ اگر جنت کا ذکر ہے تو اسی کے ساتھ دوزخ کا ذکر ہے اور جس وقت ہم پڑھتے ہیں تو یہ کیفیات ہمارے قلوب کے اوپر طاری ہوتی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں متضاد کیفیات برابر چل رہی ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان تو ابن الحال ہے، ہر حال اس پر غالب آتا ہے جیسا حال ہوگا ویسا کلام کرے گا۔

لیکن حق تعالیٰ شانہ، پر کوئی چیز غالب نہیں آ سکتی۔ ﴿وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ﴾ ① نہ خوشی غالب آ سکتی ہے نہ غمی، خوشی اور غمی اس کی پیدا کردہ ہے۔ اس لئے جب وہ کلام کریں گے تو اگر چاہیں کہ اس میں خوشی کی کیفیات بھری ہوئی ہوں اس میں پیدا کر دیں گے۔ اگر چاہیں کہ غمی کی کیفیت ہوں تو وہ پیدا کر دیں گے کیونکہ وہ ہر چیز پر ہر وقت قادر ہیں۔ تو قرآن کریم کی ایک ایک آیت کے اندر جو بھی آیت ہوگی کئی متضاد کیفیات پوری قوت کے ساتھ برابری سے سمجھ میں آتی ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کلام بشری طاقت سے خارج ہے بشری کلام نہیں بلکہ اس ذات کا کلام ہے جو ہر چیز کے اوپر غالب ہے اس کی صفات اور اس کی شانیں اس کے اندر بھری ہوئی ہیں جب آدمی پڑھے اور سمجھ کر بصیرت کے ساتھ پڑھے تو کچھ کیفیات قلب پر مترشح ہوتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔

معرفتِ اوصافِ متکلم...... وجہ اس کی یہ ہے کہ ہر کلام میں متکلم کے اثرات چھپے ہوئے ہوتے ہیں۔ کلام کو پڑھ کر آپ پہچان لیتے ہیں کہ یہ کسی عالم کا کلام ہے یا جاہل کا؟ شاعر کا ہے یا غیر شاعر کا؟ اس کے کلام کے طرز بیان اور مضامین کو دیکھ کر آپ پہچان لیتے ہیں کہ یہ فلاں شخص کا کلام ہے یا ایسے شخص کا جس میں فلاں صفت غالب ہے۔ غرض کلام میں متکلم کے اثرات غالب ہوتے ہیں بلکہ کلام میں خود متکلم چھپا ہوا ہوتا ہے۔ اگر متکلم کو دیکھنا ہو اس کا کلام پڑھ لو تو اس کی کیفیت عیاں ہو جائے گی۔

اورنگ زیب کی بیٹی "زیب النساء" یہ بڑی شاعرہ تھی۔ اس کا کلام بہترین ہوتا تھا۔ مشاعرے جب ہوتے تھے تو اس کا کلام بھی پڑھا جاتا تھا۔ تو عاقل خان جو اورنگ زیب کے زمانے کا بڑا عہدہ دار بھی تھا اور بڑا شاعر بھی تھا۔ اس کی زبان سے کہیں یہ جملہ نکلا کہ کاش میں اس شاعرہ کو کہیں دیکھتا جس کا اتنا اونچا کلام ہے، اتنی اس میں بلاغت ہے۔ یہ جملہ زیب النساء کو پہنچا۔ زیب النساء نے اس کا جواب ایک شعر میں دیا۔ اگر تو مجھے دیکھنا چاہتا ہے

---

① پارہ: ۱۲، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۲۱.

تو دیکھ سکتا ہے۔ میں اس کی تدبیر بتلائے دیتی ہوں۔ اس نے یہ شعر لکھ کر بھیجا کہ ؎

درسخن مخفی منم چوں بوئے گل در برگ گل

میں اپنے کلام میں اس طرح سے چھپی ہوئی ہوں جس طرح سے گلاب کی پتیوں میں خوشبو چھپی ہوئی ہے ؎

درسخن مخفی منم چوں بوئے گل در برگ گل　　　ہر کہ دیدن میل دارد درسخن بیند مرا

جو دیکھنے کی خواہش رکھتا ہے وہ میرے کلام میں مجھے دیکھ لے، میں نمایاں ہو جاؤں گی۔ غرض ہر کلام میں متکلم کے اوصاف چھپے ہوئے ہوتے ہیں۔ شعراء کے کلام کی فصاحت و بلاغت کے درجات آپ اسی طرح سے قائم کرتے ہیں کہ اگر بہت اونچا شعر ہے آپ کہتے ہیں کہ کسی بڑے اونچے شاعر کا ہے۔ اگر معمولی کلام ہے آپ کہتے ہیں کہ ہاں تک بندی ہے۔

ایک بات مجھے یاد آئی کہ ہماری اردو زبان میں ایک محاورہ ہے "آنکھیں چار ہونا" اور یہ ایسے موقع پر بولا جاتا ہے جب محبت کا اشارہ کنایہ کرنا ہوتا۔ اس محاورے کو استاذ ذوق نے نظم کیا ہے کہ

آنکھ سے آنکھ ہے لڑتی مجھے ڈر ہے دل کا　　　کہیں یہ جائے نہ اس جنگ و جدل میں مارا

ایک دوسرا شاعر ہندو اس نے بھی یہی مضمون بیان کیا۔ مگر اس مضمون کو اونچا کر دیا۔

وہ کہتا ہے ؎

دل کی نہیں تقصیر مکنڈ آنکھیں ہیں ظالم　　　یہ جا کے نہ لڑتیں وہ گرفتار نہ ہوتا

یہ ایک ہی بات دو شعروں میں ادا کی گئی مگر جاننے والوں نے جان لیا کہ اس مضمون کو دوسرے شعر میں جس پیرائے میں ادا کیا گیا ہے وہ بہ نسبت پہلے پیرائے کے بلند پیرایہ ہے۔ تو کلام کے اندر فصاحت اور بلاغت کے لحاظ سے مراتب اور تفاوت فصحاء و بلغاء سمجھتے ہیں اور وہ جانتے ہیں کہ یہ بہترین کلام ہے اس سے زیادہ بہتر دوسرا نہیں ہوسکتا۔ جب انسانوں کے کلام میں ایسے درجات نکلتے ہیں کہ بعض موقعوں پر لوگ کہتے ہیں کہ یہ سہل ممتنع ہے اس سے آگے اب بہتر نہیں ہوسکتا۔

متکلم حقیقی..... تو اللہ کے کلام میں یہ چیز بدرجہ اولیٰ پائی جانی چاہئے۔ جب وہ کلام کرے تو اس درجے کا بدیع ہو کہ اس سے بہتر نہ ممکن ہو۔ انسانی کلام کتنا ہی بدیع ہو مگر اس سے بہتر ممکن تو ہوگا اس لئے کہ یہ ممکن ہے کہ اس سے بہتر فصیح و بلیغ انسان پیدا ہو جائے۔ لیکن اللہ جو کلام کرے گا یا کلام فرمائے گا اس سے بہتر یوں ممکن نہیں کہ نہ خدا کا نظیر ہے نہ اس کے کلام کا نظیر ہوسکتا ہے نہ اس کے لئے کوئی مثل ہے نہ اس کے کلام کا کوئی مثل ہوسکتا ہے۔ اس لئے فرمادیا گیا کہ ﴿لَا يَأْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ﴾ ①. اس کے کلام کے مثل کوئی نہیں لا سکتا۔

اس لئے کہ اس کی ذات و صفات کا مثل کوئی موجود نہیں ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ وَّهُوَ السَّمِيْعُ

---

① پارہ: ۱۵، سورۃ الاسراء، الآیۃ: ۸۸.

الْبَصِیْرُ﴾ ① ”اس کی ذات کی کوئی مثل اور نظیر نہیں ہے، وہ سمیع اور بصیر ہے“۔

جب ذات بے چون اور بے چگون ہے اور صفات کی کوئی نظیر نہیں ہے تو پھر افعال کی کوئی نظیر کیسے ہوگی؟ تو صفات میں سے کلام بھی ہے۔ کلام کرنے کا حق تو اللہ ہی کا ہے۔ ہم اور آپ متکلم تو اس کے پرتوے بن گئے ہیں اگر کلام کا پرتو نہ پڑے تو ہمیں متکلم ہونا نصیب نہیں ہوسکتا۔ سمع اور بصر اس کی صفت ہے۔ اس کا پرتو پڑا تو ہم بھی سمیع اور بصیر کہلائے۔ موجود حقیقی وہ ہے۔ اس کے وجود کا پرتو پڑ گیا تو ہم بھی موجود کہلانے لگے۔ ورنہ ہم میں کوئی اپنا ذاتی اور اصلی وجود نہیں ہے۔ تو جب ہماری ہر چیز حق تعالیٰ کے پرتو سے ہے، اصل صفات اس کی، ظلی صفات ہماری ہیں، اصل وجود اس کا ظلی وجود ہمارا، اصل کلام اس کا، ظلی کلام ہمارا تو اصل فصاحت و بلاغت اس کی ہوگی ہماری فصاحت و بلاغت ظلی ہوگی۔

غرض جب اصل فصاحت و بلاغت ہمارے اندر ہے ہی نہیں تو ظاہر ہے کہ ایک کا ظل دوسرے ظل کے مشابہ ہوسکتا ہے۔ اصل کے مشابہ تو جب ہو جب کوئی دوسرا اصل پیدا ہو اور اصل ایک ہے تو اصل کلام ایک ہی رہے گا۔

حق تعالیٰ شانہٗ نے حقیقت میں جیسے افعال کے معجزے ظاہر فرمائے زمین ایک معجزہ ہے، آسمان ایک معجزہ ہے، چاند اور سورج ایک معجزہ کہ جن کی نظیر لانے کی کسی کو قدرت نہیں، تو کلام کا معجزہ بھی ظاہر فرمایا اور وہ قرآن کریم ہے جس کا مثل ناممکن تھا۔ نہیں لایا گیا اور آج تک نہیں لایا گیا۔

دنیا کی اقوام نے دن رات مقابلے کیے مگر اس جیسا کلام لا کر پیش کر دیں جس میں ویسی ہی معنویت ہو اتنے ہی پہلو بھرے ہوئے ہوں، اتنی ہی جامعیت ہو اور اتنی ہی فصاحت و بلاغت ہو یہ کوئی نہ کرسکا۔ یہ اس کی دلیل ہے کہ یہ معجزہ ہے یعنی خدا کا کلام ہے بشر کا کلام نہیں ہے۔

قرآن کریم کی اعجاز نمائی...... پھر یہ معجزہ ہی نہیں بلکہ معجزہ گر بھی ہے۔ یعنی قرآن کریم نے معجزات بنائے اس واسطے کہ قرآن کریم پر عمل کرنے سے بڑے بڑے اکابر اولیاء پیدا ہوئے ان اولیاء کے ہاتھ پر کرامتیں ظاہر ہوئیں تو قرآن خود ہی معجزہ نہیں ہے بلکہ لوگوں کے ہاتھ پر معجزے نمایاں بھی کرتا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ نبی کے ہاتھ پر جو خرق عادت ظاہر ہوتی ہے اسے معجزہ کہتے ہیں۔ ولی کے ہاتھ پر خرق عادت ظاہر ہو اسے کرامت کہتے ہیں۔ ابوحنیفہ، سفیان ثوری رحمہما اللہ تعالیٰ وغیرہ یہ اکابر مجتہدین گزرے ہیں یہ انبیاء نہیں تھے مگر نبیوں جیسے کام کیے ایک ایک نے کروڑوں انسانوں کے دلوں کو ایمان سے رنگا اور ایک ایک خطہ کو ایمان و اسلام سے رنگین بنا دیا۔

صوفیاء کے طبقے پر نگاہ ڈالو۔ ایک حضرت شیخ معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں کسی مسلمان کی نہیں بلکہ ایک عیسائی کی شہادت ہے۔ جس کا نام مسٹر آرنلڈ ہے، اس نے ”پریچنگ آف اسلام“ کتاب لکھی ہے وہ لکھتا ہے کہ ایک حضرت شیخ معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کے دست مبارک پر ننانوے لاکھ آدمیوں نے

---

① پارہ: ۲۵، سورۃ الشوریٰ، الآیۃ: ۱۱.

ہندوستان میں اسلام قبول کیا ہے۔ تو ایک فرد نے ننانوے لاکھ کو مسلم بنایا۔ خود حضرت شیخؒ کے خلفاء کے ہاتھ پر جو لوگ اسلام لائے ان کی تعداد الگ ہے۔ تو ایک شیخ معین نے وہ کام کیا جو انبیاء بنی اسرائیل کرتے تھے کہ جس خطے میں بیٹھ گئے، لاکھوں اور کروڑوں کو باایمان بنایا۔ ایمان کی روشنی پیدا کر دی، تو جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اس معجزے اور اس پر عمل کی بدولت لوگ ایسے مقامات پر پہنچے ولایت کے ان مرتبوں پر پہنچے جن کے ہاتھوں پر خرق عادت اور کرامتیں ظاہر ہوئیں، الہامات ظاہر ہوئے۔

شرائع ظلیہ...... یہ جتنے ائمہ مجتہدین ہیں اگر انبیاء علیہم السلام پر اصلی شریعتیں ظاہر ہوئیں تو ان مجتہدین کے قلوب پر ظلی شریعتیں ظاہر ہوئیں۔ یعنی انہوں نے انہی شریعتوں میں سے استنباط کر کے مستقل احکام دیئے۔ انہی شریعتوں میں اجتہاد کر کے احکام نکالے اور کتابوں کی کتابیں بھر دیں۔

یہ کتاب وسنت سے کوئی الگ چیز نہیں ہے۔ کتاب وسنت کی کلیات میں جو چیزیں چھپی پڑی تھیں۔ مجتہد کے فہم نے ان کو اندر سے نکال کر کے نمایاں کر دیا یہ الہامی چیزیں تھیں۔ حق تعالیٰ نے ان کے قلوب میں ڈالیں، انہوں نے ان کو واضح کر دیا۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ...... مجھے امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ جو امام شافعی رحمہ اللہ علیہ کے شاگرد ہیں کا واقعہ یاد آیا۔ استاذ بھی امام ہیں اور شاگرد بھی امام ہیں۔ اور دونوں صاحب مذہب اور صاحب فقہ ہیں۔ امام شافعیؒ کا فقہ حجاز میں پھیلا اس لئے کہ ان کی ابتداء حجاز میں ہوئی انتہا مصر میں جا کر ہوئی۔ مصر کی اکثریت شوافع کی ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ مغربی ممالک کی طرف گئے۔ تو نجد اور یمن کے اندر حنبلیت پھیلی ہوئی ہے۔ لاکھوں انسان فقہ حنبلی پر چل رہے ہیں۔

چونکہ امام شافعیؒ کا اخیر زمانہ مصر میں گزرا ہے اور امام احمدؒ سے ملاقات کئے ہوئے عرصہ ہو گیا تھا۔ تو امام شافعیؒ نے امام احمد بن حنبلؒ کے نام خط لکھا۔ ”بہت عرصہ ہو گیا تم سے ملے ہوئے اور ملنے کو جی چاہتا ہے۔ اگر مصر آنے کی کوئی صورت بن پڑے تو کوشش کرو مصر آ جاؤ۔ جی چاہتا ہے کہ اخیر عمر میں تمہیں ایک دفعہ اور دیکھ لوں“۔

امام احمد نے جواب لکھا کہ ”میں حاضر ہو رہا ہوں“۔ دن اور تاریخ متعین کر دی کہ میں فلاں تاریخ کو حاضر ہو رہا ہوں۔ چنانچہ مقررہ وقت پر امام احمد بن حنبلؒ مصر کے لئے روانہ ہوئے اور اسی تاریخ کو مصر پہنچے جس کا وعدہ لکھا تھا۔ امام شافعیؒ استقبال کے لئے شہر سے باہر نکلے۔ جب امام نکلے تو جتنے علماء تھے سب کے سب امام شافعیؒ کے ساتھ چلے۔ علماء جب چلے تو جتنے احکام اور زعماء تھے وہ بھی ساتھ ہوئے۔ حتیٰ کہ بادشاہ وقت بھی استقبال کے لئے آ گیا ایک بڑا عظیم جتھہ گویا ملک کے اجلہ اور اکابر استقبال کے لئے آئے اور پورے مصر میں خوشی تھی کہ آج امام وقت ہمارے ہاں مہمان ہو رہے ہیں۔ امام شافعیؒ کی بچیوں کا یہ حال تھا کہ چھوٹی چھوٹی بچیاں کودتی پھرتی ہیں کہ ہمارے ہاں امام وقت مہمان ہونے والا ہے۔ خدا خدا کر کے امام احمدؒ پہنچے اور امام شافعیؒ کے ہاں قیام کیا۔

امام شافعیؒ نے کھانا لا کے رکھا۔ امام شافعیؒ کی مہمان نوازی مشہور اور تاریخی چیز ہے۔ ان کی مہمان نوازی کے عجائبات تاریخ کا حصہ ہیں۔ غرض امام شافعیؒ نے بہت شغف اور توجہ کے ساتھ مہمان نوازی کی اور کھانا لا کر رکھا۔

امام احمد بن حنبلؒ نے کھانا، کھانا شروع کیا مگر اس طرح سے کھایا جس طرح کوئی سات وقت کا بھوکا کھاتا ہے اور کافی مقدار میں خوب پیٹ بھر کے کھایا اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ معلوم نہیں کتنے وقت کا کھانا نہیں ملا۔ وہ زمانہ تقویٰ اور طہارت کا ہے۔ تو امام شافعیؒ کی بچیوں نے گھر میں امام شافعیؒ پر اعتراض کیا کہ تم کہتے تھے کہ امام وقت ہے یہ کیسا امام وقت ہے جو پیٹ بھر کے کھانا کھاتا ہے یہ عوام الناس کا کام ہے کہ پیٹ بھر کے کھائیں۔ اتقیاء کا یہ کام نہیں ہے۔ وہ تو سنت کے تابع ہوتے ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہؓ اور تابعین کی سنت یہ ہے کہ بقدر ضرورت کھالیا۔ لیکن اس طرح سے گر پڑ کے کھانا کہ معلوم ہو بہت وقت کا بھوکا ہے یہ شان اتقیاء کی نہیں ہے۔ تو یہ کیسا امام وقت ہے؟

امام شافعیؒ سے جواب نہیں بن پڑا۔ فرمایا کہ: حیرت مجھے بھی ہے۔ مگر میں بول یوں نہیں سکتا کہ میں میزبان ہوں۔ اگر میری زبان سے یہ نکلا کہ بھائی کم کھاؤ۔ تو یہ موضع تہمت ہوگا کہ میں شاید اپنی روٹی بچانا چاہتا ہوں۔ اس لئے میرے بولنے کا موقع نہیں مگر حیرت مجھے بھی ہے کہ احمد بن حنبلؒ میں یہ تغیر کیسے پیدا ہوا؟ کھانے کی طرف اس طرح سے متوجہ کیسے ہوئے؟

رعایت مقام...... اتقیاء کے کھانے کی شان یہ ہے کہ حضرات صحابہؓ کے بارے میں فرمایا گیا کہ: جب جہاد میں جاتے تھے تو یہ نہیں تھا کہ سامان رسد کے طور پر وہاں انڈے کیک اور پیڑیاں پہنچی تھیں۔ کچھ سوکھے ٹکڑے زنبیلوں میں بھرے ہوئے ہیں بہت بھوک لگی چبا کر کھالئے۔ کسی کے پاس وہ بھی نہیں کچھ کھجوریں پڑی ہوئی ہیں وہ کھالیں۔ یہ بھی نہ ہوا تو بعض کے پاس گٹھلیاں بھری ہوئی ہوتی تھیں گٹھلیاں منہ میں ڈال لیں گویا نفس کو بہلا دیا کہ ہم کچھ کھا رہے ہیں اور نفس سمجھ گیا کہ مجھے میری غذا مل گئی تو غذائیں یہ تھیں اور چوبیس گھنٹے جہاد میں مصروف تھے۔ یہ روحانی و معنوی قوت ہوتی تھی۔

حضرت قطب عالم شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ملفوظات میں لکھا ہے کہ میں ایک ایسے شخص سے واقف ہوں جو چالیس برس سے ایک بادام یومیہ پر افطار کرتا ہے۔

اندازہ کیجئے ایک بادام بھی کوئی غذا ہے۔ شراح لکھتے ہیں کہ وہ خود حضرت شیخ ہیں۔ اپنے کو چھپانے کے لئے ایسے لکھا کہ میں کسی ایسے شخص سے واقف ہوں جو چالیس برس سے ایک بادام یومیہ پر افطار کرتا ہے اور حالت یہ تھی کہ ان کے تراجم میں موجود ہے رات کو جب ذکر اللہ کرتے تھے تو اتنی بلند آواز سے ذکر کرتے تھے کہ سرائے میں ذکر کرتے تھے، دو فرلانگ پر شہر ہے ہر گھر میں اس طرح پر آواز پہنچتی تھی جیسے ہمارے دروازے پر بیٹھے ہوئے ذکر کر رہے ہیں یہ ان کی قوت کی حالت تھی۔ یہ روحانی و معنوی قوت تھی۔

اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں حدیث میں فرمایا کہ: دو دو مہینے ایسے گزرتے تھے کہ بیت نبوت میں دھواں بھی نہیں اٹھتا تھا اسود ین پر گزر ہوتا تھا ایک کھجور کھالی، ایک کٹورا پانی پی لیا، یہ غذا ہوتی تھی اور جب صوم وصال رکھنے پر آئے تو یہ بھی ختم ہو جاتی تھی۔ ①

بہر حال انبیاء علیہم السلام کی شان بھی کھانے پینے کے بارے میں انتہائی تقلیل کی ہے، صحابہ، اولیاء اور اتقیاء کی شان بھی انتہائی قلت کی ہے۔ اتقیاء کی یہ نظیریں سامنے تھیں، ان کو سامنے رکھ کر لڑکیوں نے اعتراض کیا کہ احمد بن حنبل ؒ کیسا متقی شخص ہے؟ اور کیسا امام ہے جس نے پیٹ بھر کے کھانا کھایا؟

امام شافعیؒ سے اس کا کوئی جواب نہیں بن پڑا اور فرمایا کہ حیرت مجھے بھی ہے مگر میں میزبان ہونے کی وجہ سے بول نہیں سکتا۔ خیر وہ بات ختم ہو گئی۔

عشاء کا وقت آیا اور امام احمد بن حنبلؒ نماز پڑھنے کے لئے مسجد میں تشریف لے گئے۔ تو امام شافعیؒ کی بچیوں نے امام احمد کے لئے بستر لگایا اور لوٹا بھر کر پانی کا رکھا تا کہ رات کو تہجد کے لئے انھیں تو تکلیف نہ ہو۔ لوٹا بھرا بھرایا مل جائے۔ رات کا یہ سب سامان کر کے بچیاں چلی گئیں۔

امام احمدؒ تشریف لائے چارپائی پر لیٹ گئے۔ صبح کی نماز کو جب اٹھ کر گئے۔ بچیاں بستر تہہ کرنے آئیں تو معلوم ہوا لوٹا اسی طرح بھرا ہوا رکھا ہے۔ اب تو ان کے غصہ کا پارہ انتہائی طور پر چڑھ گیا اور انہوں نے امام شافعیؒ کا دامن پکڑ کے کہا کہ یہ تمہارے شاگرد جن کو تم کہتے تھے کہ امام وقت ہے اور اتقیاء امت میں سے ہیں کیسا متقی ہے کہ پیٹ بھر کے یہ کھانا کھائے؟ اور رات کے اوقات میں نوافل پڑھنے کی اسے توفیق نہ ہو؟ تہجد یہ نہ پڑھے؟ یہ کیسا نئی قسم کا امام ہے۔ اب امام شافعیؒ سے بھی ضبط نہ ہو سکا آخر احمد بن حنبلؒ کے استاذ تھے۔ تو بیٹھ کر کہا کہ:

اے احمد بن حنبل! یہ تغیر تم میں کب سے پیدا ہوا۔ میں کل سے دیکھ رہا ہوں اور صبر کر رہا ہوں تم نے پیٹ بھر کے کھانا کھایا۔ میں اس لئے نہیں بولا کہ میں میزبان تھا۔ میرے اوپر تہمت آتی۔ بہر حال میں نے صبر کیا۔ لیکن اب جب دیکھا کہ رات کو تہجد تک کی توفیق نہیں ہوئی، تو میرے سے نہ رہا گیا۔ تو تمہارے حالات میں یہ تغیر کب سے پیدا ہوا۔؟ یہ تو افسوسناک حالات ہیں۔ امام احمد بن حنبلؒ ہنسے اور عرض کیا، حضرت! واقعہ وہ نہیں ہے جو آپ سمجھے ہوئے ہیں۔

شانِ عمل اور شانِ اجتہاد..... فرمایا کیا واقعہ ہے؟ کہا کہ: واقعہ یہ ہے آپ کو میرے زیادہ کھانے کے اوپر اعتراض ہوا۔ حقیقتاً میں نے زیادہ کھایا ہے اور کافی کھایا۔ عمر بھر میں کبھی اتنا نہیں کھایا تھا جتنا یہاں کھایا۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ جب آپ کا دسترخوان بچھا تو اتنی حلال کی کمائی تھی اس کے اوپر آسمان سے انوار و برکات کی بارش تھی میں نے عالم میں اتنی پاک کمائی نہیں دیکھی۔ میں نے ارادہ کیا جتنا زیادہ سے زیادہ کھا سکوں کھالوں

---

① دلائل النبوة للامام البيهقي باب ذكر اخبار رُوِيَتْ في زهده ... ج: ١، ص: ٣٣١ رقم: ٢٩٨.

ممکن ہے پھر ایسی پاک غذا مجھے نصیب نہ ہو۔ اس وجہ سے میں نے زیادہ کھایا چاہے مجھے سات دن روزے رکھنے پڑیں۔ مگر اتنا منور اور بابرکت لقمہ حلال میں نے آج تک عالم میں نہیں دیکھا۔ اور فرمایا کہ اس کھانے کی دو برکتیں میرے اندر نمایاں ہوئیں ایک علمی اور ایک عملی۔ عملی برکت تو یہ نمایاں ہوئی کہ میں نے آج عشاء کے وضو سے تہجد پڑھی اور صبح کی نماز بھی پڑھی یہ وجہ ہوئی لوٹا استعمال نہ کرنے کی وہ بھرا ہوا رہ گیا۔ میں رات بھر عبادت میں رہا۔

اور علمی برکت یہ پیدا ہوئی کہ قرآن حکیم کی ایک آیت سے فقہ کے سو مسئلے نکالے اور علوم کے دروازے مجھ پر کھل گئے۔ یہ ثمرہ حلال کی غذا کی برکت تھی۔

شرط معرفت...... حقیقت یہ ہے کہ نورِ معرفت حلال غذا سے پیدا ہوتا ہے۔ پہلی شرط یہ ہے کہ لقمہ حلال کا ہو۔ ایمانی و روحانی قوتیں لقمہ حلال کے تابع ہیں۔ انسان کا پیٹ حوضِ بدن ہے۔ حوض میں جو بھرا جائے گا نلوں اور نالیوں میں بھی وہی آئے گا۔ اگر پیٹ میں پاک غذا ہے تو قلب میں پاک آثار آئیں گے اور دماغ میں بھی، تو اس بھی پاک نکلیں گے اور اگر لقمہ حلال نہیں ہے تو پھر وہی ظلمت اور کدورت ملے ہوئے اقوال و افعال ہوں گے اور ویسی ہی حرکات بھی ہوں گی۔ اسی لئے اہل اللہ سب سے زیادہ لقمہ حلال کا اہتمام کرتے تھے کہ ہماری کمائی پاک ہو۔ اس کمائی سے ہی قلب میں نورِ معرفت پیدا ہوتا ہے۔ ورنہ قساوت پیدا ہوتی ہے۔

ہمارے یہاں دیوبند میں ایک بزرگ تھے شاہ جی عبداللہ صاحب ان کا نام تھا۔ بے پڑھے لکھے امی محض تھے۔ مگر صاحب نسبت بزرگوں میں تھے انہوں نے اپنے گزر اوقات کا ذریعہ گھاس کھودنا مقرر کر لیا تھا۔ گھاس کھود کر گٹھڑی بیچتے تھے۔ اور گٹھڑی کی قیمت چھ پیسے مقرر کی ہوئی تھی۔ نہ ایک پیسہ کم لیتے تھے نہ ایک پیسہ زیادہ لیتے تھے۔ دیوبند میں جتنے لوگ اپنے جانوروں کے لئے گھاس خریدتے تھے، منڈی میں پہنچتے تو سینکڑوں گٹھڑیاں گھاس کی ہوتی تھیں، مگر سب منتظر رہتے تھے کہ ہم شاہ جی کی گٹھڑی خریدیں گے۔ ہر ایک اس کی کوشش میں ہوتا تھا اور سمجھتا تھا کہ ہمارا جانور ان کا لایا ہوا گھاس کھائے گا تو گھر میں برکت ہوگی۔ جب شاہ جی عبداللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نظر پڑتے تو لوگ ان کی طرف دوڑتے تھے، بس جس نے جا کر پہلے ہاتھ لگایا، شاہ جی وہیں گٹھڑی ڈال دیتے تھے اور چھ پیسے لے لیتے تھے۔

ان چھ پیسے کی تقسیم ان کے ہاں کیا تھی؟ دو پیسے تو اسی وقت صدقہ کر دیتے۔ ان دو پیسوں میں اس زمانے میں کچھ پائیاں ملتی تھیں تو وہ ایک ایک دو دو بچوں کو، یتیموں کو، بیواؤں کو غریبوں کو دیتے کھڑے کھڑے تقسیم کر دیتے۔ اور دو پیسے روز ان کے گھر کا خرچ تھا۔ کچھ آٹا لے لیا، کچھ نمک، لکڑی وغیرہ سستا زمانہ تھا تو دو پیسے روز میں گھر والوں کا خرچ ہو جاتا تھا۔

اور دو پیسے جو بچتے تھے۔ انہیں جمع کیا کرتے تھے۔ سال بھر میں جب وہ چھ، سات روپے بن جاتے اس رقم سے ہمارے اکابر حاجی امداد اللہ صاحب، حضرت مولانا رشید احمد صاحب، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب اور

مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہم کی دعوت کیا کرتے تھے۔

مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے صدر مدرس ہیں۔ یہ فقط عالم ہی نہیں عارف باللہ بلکہ صاحب کشف وکرامت بزرگوں میں سے تھے۔ ان کا مقولہ میں نے اپنے بزرگوں سے سنا کہ سال بھر ہمیں شاہ جی" کی دعوت کا انتظار رہتا تھا کہ کب وہ دن آئے کہ ان کے گھر کا کھانا کھائیں اور فرمایا جس دن کھانا کھاتے تھے۔ تو چالیس چالیس دن قلب میں نور رہتا تھا اور قلب میں جذبہ پیدا ہوتا تھا کہ یہ بھی عبادت کر لیں، نوافل پڑھ لیں، تلاوت کر لیں۔ ہر وقت طاعت وعبادت کو جی چاہتا تھا۔ اس اکل حلال کی یہ برکت قلوب میں نمایاں ہوتی تھی۔

سلب توفیق..... لقمہ حلال درحقیقت ایسی چیز ہے کہ اسی سے توفیق پیدا ہوتی ہے۔ آج کی بے عملی لاعلمی کے سبب سے نہیں ہے۔ علم تو عام ہو گیا۔ ہر شخص جانتا بوجھتا ہے۔ پھر بھی بدعملی ہے؟ توفیق کے سلب ہونے کی وجہ سے۔ اور توفیق لقمہ حرام یا مشتبہ لقمہ کی وجہ سے سلب ہوتی ہے اکل حلال پورا میسر نہیں ہے۔ بقول غالب کے۔

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد   پر طبیعت ادھر نہیں آتی

اس لئے کہ مشتبہ غذاؤں نے طبیعت پر بندش عائد کر رکھی ہے۔ جس کی وجہ سے توفیق سلب ہو جاتی ہے۔ غرض آج کے گناہوں کا سبب لاعلمی نہیں ہے۔ بلکہ طبیعت کی قساوت یا ظلمت یا عدم توفیق یا سلب توفیق یہ چیزیں باعث بنی ہیں۔ اس لئے کہ لقمہ صحیح نہیں رہا۔

میں دیکھا کرتا ہوں یہاں تو نہیں مگر ادھر اپنے نواح میں دیکھا۔ یہ جو آج کل شوگر مل ہر جگہ ہیں۔ ہمارے ہاں دیوبند سے لے کر دہلی تک ہر اسٹیشن پر ایک شوگر مل ہے۔ اس کی وجہ سے گنے کی کاشت بڑھ گئی۔ تو گنے ریل گاڑی اور بیل گاڑیوں میں بھر بھر کے جاتے ہیں۔ بعض مل والوں نے اپنی چھوٹی چھوٹی ریلیں چلا رکھی ہیں تو وہ کھیتوں میں گھومتی ہیں اور وہاں سے گنا مل میں پہنچاتے ہیں تو مال گاڑی کے ڈبے ہر وقت بھرے ہوئے کھڑے رہتے ہیں۔ تو میں نے دیکھا کہ مسافر جب اترتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ مال گاڑی گنوں سے بھری کھڑی ہے تو کوئی بیس گنے کھینچ لایا، کوئی چالیس کوئی پچاس اور کھا رہے ہیں۔ میں حیرت سے دیکھا کرتا ہوں کہ یہ لوگ گویا یوں سمجھ کے کھا رہے ہیں کہ ان کے باپ کا مال ہے۔ انہیں کوئی احساس نہیں کہ یہ غیر کا مال ہے۔ ہمارے لئے اس کا کھانا حلال نہیں یا حرام ہے۔ کوئی حس باقی نہیں جیسے جانور، مثلاً بیل جس کھیت میں گھسا منہ مارتا ہوا چلا گیا، اسے اس کی کیا تمیز کہ میرے مالک کا کھیت ہے یا غیر کا۔ یہی حالت انسانوں کی ہو گئی کہ بس کھانے کی چیز سامنے آنی چاہئے۔ پھر حلال ہو یا حرام۔ بے تحاشا اس کی طرف دوڑ پڑتے ہیں۔ تو میں سوچا کرتا تھا۔ یا اللہ! ان کے قلوب کی کیا کیفیت ہوگی؟ اس قسم کے مال سے سوائے قساوت، ظلمت اور تاریکی کے اور کیا پیدا ہو سکتا ہے۔ لقمہ حرام سے نیکی کا جذبہ نہیں ابھر سکتا۔ نیکی کا جذبہ ہمیشہ لقمہ حلال سے ابھرے گا۔

پچھلے زمانے میں اہل اللہ جب بیعت کرتے تھے، پہلی شرط یہ لگاتے تھے کہ لقمہ حلال بھی میسر ہے یا نہیں؟ اگر تمہاری غذا مشتبہ ہے تو سارا دن بھی ذکر اللہ کرو گے تو قلب کے اوپر آثار نمایاں نہیں ہوں گے۔ غرض لقمہ حلال کا بڑا اہتمام کیا جاتا تھا۔ میرے عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ پاک کمائی سے نور معرفت پیدا ہوتا ہے اور پاک کمائی کی طرف جذبہ؟ یہ ظاہر بات ہے کہ اتباع انبیاء علیہم السلام سے ہی پیدا ہوسکتا ہے۔ لقمہ حلال کی قرآن کریم میں بھی جگہ جگہ تاکید کی گئی ہے فرمایا ﴿وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ﴾ ① ایک دوسرے کا مال باطل کے ساتھ مت کھاؤ۔ حق کے ساتھ کھاؤ، جائز طریق پر کھاؤ، ناجائز طریق پر مت استعمال کرو۔ یہ چوری، ڈکیتی، رشوت، جوا سب اسی لئے تو ممنوع ہوئیں کہ یہ کمائیاں ناجائز ہیں۔ ان کے کھانے سے قلب پر برا اثر پڑے گا، مشتبہ کمائی سے برا اثر پڑے گا۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں کہ میں مال کے مصارف کو دیکھ کر مداخل کا پتہ چلا لیتا ہوں۔ یعنی جن مواقع میں صرف ہوتا ہے۔ ان مواقع کو دیکھ کر پہچان لیتا ہوں کہ یہ مال کیسے مواقع سے آیا ہوگا۔ اگر پاک جگہ پر خرچ ہو رہا ہے۔ میں سمجھ لیتا ہوں کہ پاک طریق پر کمایا گیا ہے۔ اگر ناپاک مواقع پر صرف ہو رہا ہے، میں سمجھ لیتا ہوں کہ یقیناً ناجائز طریق پر کمایا گیا ہے، پاک مال کبھی بھی ناپاک جگہ پر خرچ نہیں ہوسکتا۔ جیسا کہ ناپاک مال پاک جگہ پر نہیں لگ سکتا۔

مشتبہ چندے سے احتراز...... دارالعلوم دیوبند میں بمبئی کے ایک سیٹھ آئے تھے۔ لکھ پتی لوگوں میں سے تھے دارالعلوم کو دیکھا۔ بہت خوش ہوئے پسند کیا اور اعلان کیا کہ پچیس ہزار روپیہ بھیجوں گا۔ تو ہمارے بزرگوں نے اس کے اوپر کوئی زیادہ خوشی کا اظہار نہیں کیا۔ جیسے مثلاً یہ ہوتا کہ انہوں نے اعلان کیا تھا تو اس پر کوئی شکریہ ادا کیا جاتا یا کوئی دعائیہ کلمات کہے جاتے، جس سے ان کا دل بڑھتا۔ بس چپ ہو کر بیٹھ گئے۔ تو مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ اس بے چارے نے تو کتنی جی داری کا ثبوت دیا۔

پچیس ہزار، یہ آج سے پینتالیس برس پہلے کی بات ہے پینتالیس برس پہلے پچیس ہزار کی قیمت ایسی ہی ہے جیسے آج اسی ہزار۔ پھر دینی مدارس میں پچیس ہزار کی رقم آئے تو ان کے مصارف تھوڑے ہوتے ہیں۔ اس لئے بلحاظ مصارف وہ رقم بہت تھی۔ تو بجائے اس کے کہ ان کا کوئی شکریہ یا دعا وغیرہ کے کلمات یا خوشی کا کچھ غیر معمولی اظہار ہوتا۔ سارے ہی چپ بیٹھ گئے۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ خیر وہ سیٹھ صاحب اعلان کر کے چلے گئے۔ ایک مہینہ گزرا، دو مہینے گزرے میں نے مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا کہ آپ نے یاددہانی نہیں فرمائی۔ دارالعلوم کو اگر اتنی رقم مل جاتی تو دارالعلوم کے بہت سے کام چلتے۔ ایک شخص نے وعدہ کیا اعلان کیا کم سے کم وعدہ کی یاددہانی فرما دیں میری بات سن کر وہ خاموش ہو گئے۔ پھر مجھے حیرت ہوئی کہ اس شخص کو نہ شکریہ نہ دعا دی اور

---

① پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ. ۱۸۸.

اب بھی یاددہانی کے لئے کہہ رہا ہوں تو چپ۔ پھر میں نے کسی دوسرے وقت یاد دہانی کرائی کہ کم سے کم ایک خط تو لکھ دیں کہ بھائی یہ رقم بھیج دیں۔ اس وقت کچھ منہ بنا کر فرمایا کہ "یہ رقم دارالعلوم میں آ نہیں سکتی"۔

میں نے کہا: آخر کیوں؟ فرمایا: ان کا سارا کام سود بٹے پر چلتا ہے۔ آبکاری کے محکمے میں ان کی ملازمت ہے اور اسی قسم کی ان کی ساری کمائی ہے۔ وہ کمائی یہاں نہیں آئے گی نہ یہاں چلے گی اور نہ انہیں بھیجنے کی توفیق ہوگی۔ ہم کیوں یاددہانی کرائیں۔ اس وقت میرے ذہن میں آیا کہ ان حضرات کو ہمیشہ ایسی کمائی کا چندہ قبول کرنے سے انکار رہتا تھا۔ جس کو یہ مشتبہ سمجھتے تھے۔ اور وہ اس بناء پر کہ اگر چندہ صرف کیا گیا تو طلباء پر بھی وہی اثر پڑے گا، ان کے علم میں برکت نہیں رہے گی، ان کی معرفت ختم ہو جائے گی۔ اس واسطے گریز کرتے تھے۔

بہرحال اہل اللہ کے ہاں یہ مسئلہ ہمیشہ بہت ہی زیادہ قابلِ توجہ رہا ہے کہ کمائی مشتبہ نہ ہونی چاہئے۔ پاک ہونی چاہئے اس لئے کہ اسی پر توفیق اور اعمال کا دارومدار ہے۔ تو تقلیل تو بجائے خود ہے کہ حلال میں سے بھی کم سے کم ہو۔ یہ تو خیر بڑوں کی شان ہے۔ لیکن ہم کم سے کم اتنا تو دیکھیں کہ کمائی حرام اور مشتبہ نہ ہو۔

شانِ اتقیاء..... تو میں نے عرض کیا کہ آج بے عملی لاعلمی کے سبب سے نہیں بلکہ دوسرے اسباب ہیں ہمارے اندر احتیاط باقی نہیں ہے۔ تقویٰ اور طہارت چھوڑ فتویٰ بھی باقی نہیں کہ فتویٰ کے مطابق ہماری کمائیاں صحیح ہوں۔ سب کو میں نہیں کہتا الا ماشاء اللہ ایسے آج بھی موجود ہیں جو برابر اپنی کمائی میں احتیاط کرتے ہیں اور قیامت تک موجود رہیں گے۔ یہ امت خالی نہیں ہوگی۔ حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: "مَثَلُ اُمَّتِیْ کَمَثَلِ الْمَطَرِ لَا یُدْرٰی اَوَّلُهٗ خَیْرٌ اَمْ اٰخِرُهٗ" ①

میری امت کی مثال ایسی ہے جیسا کہ بارش۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ زمین کے لئے بارش کا پہلا قطرہ زیادہ نافع ہوا یا بیچ کا یا اخیر کا۔ یعنی میری امت میں خیریت مشترک ہے۔ کمی اور زیادتی کا فرق رہے گا۔ لیکن خیر سے امت کبھی خالی نہیں ہوگی۔ اس لئے متقیوں سے یہ امت کبھی خالی نہیں ہوسکتی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وعدہ دیا ہے فرمایا: "لَاتَزَالُ طَآئِفَةٌ مِّنْ اُمَّتِیْ مَنْصُوْرِیْنَ عَلَی الْحَقِّ لَا یَضُرُّهُمْ مَّنْ خَالَفَهُمْ وَلَامَنْ خَذَلَهُمْ حَتّٰی یَاْتِیَ اَمْرُ اللّٰهِ." ② میری امت میں ہمیشہ ایک طبقہ رہے گا جو منصور من اللہ ہوگا، مؤید من اللہ ہوگا، حق کہتا اور سنتا رہے گا، حق ہی پر عمل کرتا رہے گا۔ اس کے خلاف کرنے والے اس کو گزند نہیں پہنچا سکیں گے۔ یہاں لفظ طائفہ فرمایا یعنی چھوٹی جماعت یہ تو ہوگا کہ وہ کم ہو جائیں گے۔ مگر موجود رہیں گے۔ یہ ناممکن ہے کہ امت میں باقی نہ رہیں گے۔

اسی طرح فرمایا: "لَا تَجْتَمِعُ اُمَّتِیْ عَلَی الضَّلَالَةِ." ③ فرمایا: میری امت ساری کی ساری مل کر گمراہی پر جمع نہیں ہوگی اہل حق اس میں ضرور باقی رہیں گے اور اس امت سے حق کبھی منقطع نہیں ہوگا۔ اس لئے یہ تو

---

① المسند للامام ابی یعلیٰ، ج:۷، ص:۲۹۵، رقم: ۳۳۸۱۔ ② السنن للامام ابن ماجه بالمقدمة، باب اتباع سنة رسول اللہ ﷺ، ج:۱، ص:۳، رقم: ۱۰۔ ③ المعجم الکبیر للطبرانی، ج:۱۲، ص:۷۸.

نہیں کہا جا سکتا کہ خدانخواستہ سارے کے سارے (ایسے مشتبہ حرام کمائی والے) ہی ہیں مگر ہاں اکثریت ایسوں کی ہوگئی ہے۔ قلیل طبقہ ہے جو احتیاط برتتا ہے اور تقویٰ وطہارت کو پیش نظر رکھتا ہے۔ تو بات اس پر یاد آئی تھی کہ لقمہ حلال سے ہی انسان میں توفیق ہوتی ہے نہ صرف عمل کی بلکہ اس سے علم اور معرفت بھی پیدا ہوتی ہے۔

کمال دانشمندی..... تو امام شافعیؒ اس وقت خوش ہوئے اور لڑکیوں سے کہا کہ دیکھا تم نے کہ امام وقت ہمارے ہاں مہمان ہے؟ یہ امام کی شان ہے کہ وہ قلیل کھائے تب اس میں سے دین پیدا کر لیتا ہے۔ کثیر کھائے تب اس میں سے دین پیدا کر لیتا ہے۔ تو دیندار حقیقی معنی میں وہی ہے کہ اس کو دنیا جہاں بھی ملے وہ اس میں سے اپنے لئے دین پیدا کر لے۔ یہ بدعقلی ہے کہ آدمی دین کو بھی دنیا بنا لے اور دانش مندی یہ ہے کہ دنیا میں سے اپنے حق میں دین اور خیر نکال لے۔

غرض امام شافعیؒ اس پر بہت خوش ہوئے اور پھر فرمایا کہ دیکھو! امام وقت ہمارے ہاں مہمان ہے۔ بات اس پر یاد آئی تھی کہ اکل حلال اور قلیل کھانے میں بہرحال ایک نور اور ایک معرفت ہے اور اس سے آدمی چلتا ہے۔

عمل بالقرآن سے انبیاء بنی اسرائیل سے مماثلت..... تو قرآن کریم ایک معجزہ ہے اس پر چل کر لوگ ولی بنے، کامل بنے اور امت اولیاء سے بھر گئی اور ایسے ایسے اولیاء کاملین پیدا ہوئے جو ”کَاَنْبِیَآءِ بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ“ تھے، وہ نبی نہیں تھے مگر انہوں نے کام ایسے کئے جیسے نبیوں کے ہوتے ہیں۔ نبیوں پر اگر وحی آتی تھی تو ان پر الہام ہوا۔ نبیوں کے ہاتھوں پر اگر معجزے ظاہر ہوئے تو ان کے ہاتھوں پر کرامتیں ظاہر ہوئیں۔ نبیوں نے اگر اصل شرائع پیش کیں تو انہوں نے شرائع وضعیہ پیش کیں جنہیں اجتہادی شرائع کہتے ہیں۔ تو انبیاء علیہم السلام سے مماثلت پیدا ہوگئی۔ اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”کَاَنْبِیَآءِ بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ“ ①

یہ حدیث گو سند کے لحاظ سے ضعیف ہے۔ مگر اس کے ہم معنی اور بھی حدیثیں ہیں۔ مضمون قدر مشترک کے طور پر ثابت ہے کہ اس امت کے اولیاء، اتقیاء اور علماء کارناموں اور کارگزاری کے سلسلہ میں انبیاء علیہم السلام کے مثل ہوئے ہیں۔ یہ ان کی ساری چیزیں عمل بالقرآن سے پیدا ہوئی ہیں۔

تو بات اس پر چلی تھی کہ قرآن خود ہی معجزہ نہیں ہے بلکہ معجزے بناتا بھی ہے۔ یعنی معجزے کی شبیہ چیزیں اولیاء کے ہاتھ پر نمایاں ہوتی ہیں جب وہ عمل بالقرآن کرتے ہیں۔ تو قرآن کریم معجزہ ہے جو نبوت کی دلیل ہے۔

علمی معجزے کا امتیاز..... اس سے ایک اور بات واضح ہوئی۔ وہ یہ کہ انبیاء علیہم السلام کو عملی معجزات دیے گئے تھے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو عملی معجزات کے ساتھ ساتھ یہ علمی معجزہ بھی دیا گیا۔ عمل کی خاصیت یہ ہے کہ عامل جب دنیا سے رخصت ہوتا ہے تو اس کا عمل بھی ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن علم کی خاصیت یہ ہے کہ عالم دنیا سے اٹھ جاتا ہے۔ مگر اس

---

① علامہ پٹنی اس حدیث کے بارے میں فرماتے ہیں: قال شيخنا الزركشي لا اصل له ولا يعرف في كتاب معتبر. دیکھئے: تذکرة الموضوعات، ج: ۱ ص: ۲۰۔

کا علم باقی رہتا ہے۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عملی معجزات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے ساتھ ختم ہو گئے۔ لیکن علمی معجزہ قرآن کریم ہے جو آج تک باقی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ نبوت کی دلیل آج بھی دنیا میں موجود ہے۔ تو جس دعوے کی دلیل آج موجود ہے۔ وہ دعویٰ آج بھی ثابت ہے۔ اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو آج بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ اگر کوئی دلیل مانگے تو معجزہ پیش کر دیں گے اور وہ قرآنی معجزہ ہے۔

دوامِ کتاب دوامِ نبوت کو مستلزم ہے...... موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اگر یہ کہا جائے کہ آج ان کی نبوت پر ایمان لے آؤ اور دلیل مانگی جائے تو نہ عصاءِ موسیٰ ہے نہ یدِ بیضاء ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات میں آج نہ احیاءِ موتی ہے نہ ابرء اکمہ وابرص ہے، جس کا قرآن کریم نے ذکر کیا ہے۔ شعیب علیہ السلام کی نبوت کو پیش کیا جائے تو ان کی نبوت کی کوئی دلیل موجود نہیں۔ لیکن اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو پیش کیا جائے اور دلیل کا مطالبہ ہو تو یہ دلیل موجود ہے، یہ معجزہ کلامی اور علمی ہے۔ جو عالم کے دنیا سے اٹھنے کے بعد ختم نہیں ہوا بلکہ آج بھی بدستور موجود ہے اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت بھی ابدی ہے جو قیامت تک باقی رہے گی۔ اس لئے کہ اس کی دلیل قائم ہے۔ غرض اور انبیاء علیہم السلام کی نبوتیں حق ہیں اور اپنے اپنے زمانے میں سچی ہیں مگر آج ان کے دلائل عالم میں موجود نہیں ہیں لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی دلیل آج دنیا میں موجود ہے اس لئے نبوت قائم ہے اور اس کے بارے میں چیلنج کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہا جائے گا کہ قرآن کی وجہ سے یہ نبوت دائمی اور ابدی ہے اب کوئی نبی آنے والا نہیں ہے تو خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت چونکہ قیامت تک باقی رکھنی تھی اس لئے دلیلِ نبوت وہ دی گئی جو باقی رہ سکے ختم نہ ہونے پائے۔ اور وہ "علمی معجزہ" ہے۔

معارضۂ قرآن کا عذاب...... معجزے کی شان یہ ہے کہ جب کوئی قوم کسی معجزے کے مقابل آئی ہے، جبھی فنا ہو گئی۔ صالح علیہ السلام سے معجزہ مانگا گیا کہ پتھر میں سے اونٹنی نکال کر دو۔ انہوں نے باذن اللہ اونٹنی نکال کر دکھلائی۔ قوم نے اونٹنی کا مقابلہ کیا اور اس کو ختم کیا۔ تو قوم کے اوپر عذاب آیا اور اس کا صفایا کر دیا گیا۔ غرض جب بھی دنیا میں معجزے کے مقابل کوئی قوم آئی ہے جبھی گر گئی۔ قرآن کریم ایک معجزہ ہے۔ یہ الگ چیز ہے کہ ہم اپنی سستی یا غفلت سے عمل میں کوتاہی کریں۔ لیکن خدانخواستہ اگر کوئی قوم مدمقابل آئے گی اور قرآن کے معارض پڑے گی۔ تو یقیناً خسارے میں پڑے گی یقیناً کسی نہ کسی عذاب میں پڑے گی۔ وہ عذاب چاہے کسی بھی نوعیت کا ہو اس امت پر وہ عذاب تو نہیں آئیں گے جو پچھلی امتوں پر آئے ہیں۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: "لَيْسَ عَذَابُ أُمَّتِي الْخَسْفُ وَالْمَسْخُ وَالرَّجْفُ إِنَّ عَذَابَهَا الْقَتْلُ وَالْفِتَنُ وَالزَّلَازِلُ." ① "میری امت کا عذاب یہ نہیں ہے کہ صورتیں مسخ کر دی جائیں۔ جیسے پچھلی امتوں کی گئیں یا پوری امت زمین میں دھنسا دی جائے یہ نہیں ہوگا یا پتھر برسا کر ختم کر دی جائے یہ نہیں ہوگا یہ عذاب ختم کر دیے گئے"۔

---

① مسند الشهاب القضاعي، ج: ۳، ص: ۳۸۵، رقم: ۹۰۱۔

میری امت کا عذاب کیا ہے؟ فتنے پھیلیں گے، ایک دوسرے کو مزہ چکھائیں گے، ایک دوسرے کے مد مقابل آئیں گے۔ ﴿قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ﴾ ① فرماتے ہیں: اللہ اس پر قادر ہے کہ اس امت پر اوپر سے عذاب برسا دے، نیچے سے عذاب ابھار دے۔ یا ان کے اندر عذاب ڈال دے۔ وہ کیا ہے؟ ﴿يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا﴾ ② ان میں گروہ بندی پیدا کر دے۔ ایک پارٹی دوسرے کو مزہ چکھاتی رہے، چین سے نہ بیٹھے، یہ عذاب آج بھی موجود ہے۔ یہ جبھی ہوگا جب لوگ قرآن "جو معجزہ ہے" کے معارضے پر آئیں گے۔ قرآن کریم کو ماننے پر آئیں، اختلافات ختم ہو جاتے ہیں، معارضہ کرنے پر آئیں نزاعات پیدا ہوتے ہیں۔ نزاعات کا برا اثر پھر امت ہی کے اوپر پڑتا ہے۔

افتراقِ امت کے عذاب سے بچنے کا راستہ...... اگر اس کو مان کر سارے طبقات اس پر جمع ہو جائیں اور اس کی شرح حدیث ہے، اس پر جمع ہو جائیں اور آئمہ وعلماء راسخین نے جو جو مسائل اس سے استنباط کئے ہیں اس پر جمع ہو جائیں تو فی الحقیقت قوم کو کوئی گمراہ کرنے والا اور مٹانے والا نہیں ہے۔ اس کی قوت بنی بنائی ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: "تَرَكْتُ فِيْكُمُ الثَّقَلَيْنِ لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدِيْ اَبَدًا اِنْ تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا" فرماتے ہیں کہ میں دو چیزیں تم میں چھوڑ کر جاؤں گا، اگر تم ان دونوں چیزوں سے تمسک کرتے رہو گے۔ تو کبھی گمراہ نہیں ہو گے، کبھی مغلوب نہیں ہو گے۔ "كِتَابُ اللّٰهِ وَسُنَّتِيْ." ③ اللہ کی کتاب اور میری سنت۔ یعنی اسوہ اور میرا طریق عمل، جب ان دو کو اختیار کر لو گے۔ تو ان دو کو ثقلین فرمایا گیا۔ یہ وزنی چیزیں ہیں یہ ہٹنے والی نہیں ہیں۔ مٹنے والی نہیں ہیں۔

جب طوفان آتا ہے۔ اگر آدمی تنکے کا سہارا پکڑے تو تنکا بھی بہہ جائے گا اور آدمی بھی بہہ جائے گا، کوئی درخت بہتا ہوا آ رہا ہے گو بڑا نظر آئے مگر وہ بھی بہتا ہے، اسے پکڑے گا تو یہ بھی بہہ جائے گا۔ لیکن اگر آدمی کسی عظیم الشان چٹان کی پناہ لے۔ تو چٹان کو طوفان نہیں ہلا سکتا۔ تو اس شخص کو بھی نہیں ہلا سکتا۔ اس لئے کہ وہ ثقیل اور وزنی چیز ہے تو کتاب وسنت کو ثقلین کہا گیا۔ یعنی یہ دو اتنی وزنی چیزیں ہیں کہ اپنی جگہ سے ٹلنے اور ہٹنے والی نہیں ہیں۔ انکو کوئی دوسرا نہیں ہلا سکتا۔ اگر ان دو چیزوں کو ہم مضبوط تھام لیں۔ تو یہ اتنی ثقیل اور وزنی چیزیں ہیں کہ پھر طوفان ہمیں بہا نہیں سکتا۔ یقیناً ہم اپنی جگہ اٹل ہو جائیں گے۔ ایک قوی حجت ہمارے ہاتھ میں آ جائے گی۔

اگر ہم عقلی حجت پیش کریں تو جس سے بھی ہم کوئی معقول بات کہیں گے وہ کہے گا میں تم سے زیادہ عقلمند ہوں میں بھی ایک معقول بات پیش کرتا ہوں۔ ہم طبعی بات پیش کریں گے، وہ کہے گا میرے اندر بھی طبیعت ہے،

---

① پارہ: ۷، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۶۵۔ ② پارہ: ۷، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۶۵۔

③ السنن للامام الترمذی، ابواب المناقب، باب مناقب اہل بیت ... ج: ۱۲، ص: ۲۵۸، رقم: ۳۳۲۰۔

ہم اپنے مزاج کی بات منوانا چاہیں گے، وہ کہے گا میرے اندر بھی مزاج موجود ہے میری بات آپ کیوں نہ مانیں۔ لیکن جب آپ ایسی چیز پیش کریں گے جو سب مزاجوں سے بالاتر اور سب طبیعتوں سے اونچی ہوگی اور وہ کتاب اللہ اور سنت رسول ہیں۔ یہ وہ ایسی وزنی اور اٹل چیزیں ہوں گی کہ ان کے آگے جھکنا پڑے گا۔ تو ایک قوی حجت اللہ نے ہمارے ہاتھ میں عطا کی ہے۔

اور وہ قرآن و سنت ہے کہ یہ اٹل چیز ہے اپنی جگہ سے ٹلنے والی نہیں ہے۔ بہرحال قرآن کریم معجزہ بھی ہے اور معجزہ نما بھی ہے، اس پر عمل کرکے آدمی خود معجزہ نما بھی بن سکتا ہے۔ ہزاروں اولیاء بنے، ہزاروں کاملین تیار ہوئے۔ اسی کتاب و سنت کے عمل نے تیار کئے یہ خود مستقل ایک حجت ہے۔

تو قرآن کریم کو علم کے درجے میں دیکھو تو اعلیٰ ترین علم اس میں ہے، عمل کے درجے میں دیکھو تو اعلیٰ ترین عمل کی کتاب ہے اس کا وظیفہ پڑھو تو وظیفے کی بہترین کتاب ہے اس میں سے حکمت نکالو تو بہترین حکمت کی کتاب ہے آج اس کے علم و حکمت سے کتب خانے بھرے ہوئے ہیں۔

علوم القرآن...... امام اوزاعیؒ نے لکھا ہے کہ کثرت تصنیف اس امت کی خاصیت ہے دنیا کی کسی امت نے تصانیف کا اتنا بڑا ذخیرہ جمع نہیں کیا جتنا اس امت نے کیا ہے۔ تصانیف کے راستے ڈال دیئے ہیں، تاتاری جنگ کے موقع پر تاتاریوں نے بغداد پر حملہ کیا ہے تو بغداد میں کتنے کتب خانے تھے یہ تو آپ تاریخ میں دیکھیں تو تعداد آپ کو معلوم ہوگی۔ صرف ایک کتب خانے کا مورخین حال لکھتے ہیں کہ بغداد کے کنارے پر جو دجلہ دریا بہتا ہے، اس کا پل توڑ دیا گیا تھا تاکہ دشمن اندر نہ آسکے۔ لیکن بہرحال دشمن اندر پہنچ گئے اور بغداد کو فتح کرلیا۔ پل ٹوٹا ہوا تھا۔ تاتاریوں کو آنے جانے کی ضرورت تھی دریا گہرا تھا تو مسلمانوں کے ایک کتب خانے کو لے کر اس کی کتابیں سے دریا کو بھرنا شروع کیا پاٹتے پاٹتے اتنی چوڑی سڑک بنائی کہ چار پانچ گاڑیاں برابر برابر آجاسکتی تھیں۔ صرف ایک کتب خانے کی کتابوں کا یہ عالم تھا۔

نیز مورخین لکھتے ہیں کہ ان کتابوں کی روشنائی سے دھل دھل کر پانی جو بہا ہے تو ایک مہینے تک علماء کو روشنائی لانے کی ضرورت نہیں تھی۔ دریا کا پانی اتنا سیاہ ہوگیا تھا کہ اس سے بے تکلف لکھا جاسکتا تھا۔ تو اندازہ کیجئے جس شہر کے ایک کتب خانہ کا یہ حال ہو اس شہر کے دوسرے کتب خانے کتنے ہوں گے۔ اس ملک میں کتنے ہوں گے۔

اندلس "اسپین" کی حکومت جب تباہ ہوئی ہے تو ایک عیسائی عورت نے اس کی تاریخ لکھی ہے جس کا نام "خَاصِرُ الْاَنْدَلُسِ وَ غَارِبُهَا" ہے تو اس میں تعصب دکھلایا ہے کہ عیسائیوں نے تعصب میں آکر ارادہ کیا کہ مسلمانوں کا لٹریچر تباہ کیا جائے۔ اگر یہ کتابیں باقی رہ گئیں۔ تو ان کا عروج پھر ممکن ہے۔ اس لئے ایک مستقل مہم قائم کی گئی کہ ان کتب خانوں کو ختم کیا جائے۔ اس مقصد کے لئے افراد چنے گئے۔ ایک محکمہ قائم کیا گیا کہ کتب خانوں کو جلا دیا جائے یا دریا برد کیا جائے اور ضائع کیا جائے۔ اس کے لئے ایک مستقل انچارج آفیسر مقرر ہوا۔

تو وہ لکھتی ہے کہ کتب خانوں کی کتابیں لدی جاتی تھیں اور جلائی جاتی تھیں۔ پچاس برس میں جا کر پورے ملک کے کتب خانے ختم ہوئے ہیں، تو اندازہ کیجئے کتنے کتب خانے ہوں گے، ہندوستان کے کتب خانے، آپ کے پاکستان کے کتب خانے، بہت سے قدیم کتب خانے ہیں، جن کو کیڑے چاٹ رہے ہیں، پڑھنے والا کوئی نہیں، ہزاروں کتب خانے اب بھی موجود ہیں جو کیڑوں کی نذر ہو رہے ہیں۔ اسی طرح حجاز کے کتب خانے، نیز مصر کے کتب خانے، مصری حکومت چھاپتے چھاپتے تنگ آ گئی ہے۔ مگر سلف کی کتابیں عشر عشیر بھی نہیں چھپی ہیں، ہزاروں، لاکھوں کی تعداد میں اب بھی باقی ہیں جو چھپ سکتی ہیں۔ یہ اتنا ذخیرہ اس قرآن وسنت ہی کی بدولت تو قائم ہوا۔ یہ علماء نے جو تصانیف کی ہیں۔ یہ قرآن ہی کی تو شرح ہو رہی ہیں۔

کتابِ مبین کا خاصہ...... تو قرآن وحدیث کا اندازہ کیجئے کہ یہ اسلوب بیان کتنا جامع اور بلیغ ہے کہ اس کی شرح ہوتے ہوتے ہزاروں کتب خانے جمع ہو گئے۔ اب بھی عشر عشیر ہوا ہے۔ ہزاروں لاکھوں کتابیں اب بھی باقی ہیں جو شرح طلب ہیں تو اس سے قرآن کے علم کا اندازہ ہوتا ہے کہ یہ علم معجزے کا علم ہے کسی انسان کے علم کی تعبیر میں علم کا اتنا ذخیرہ نہیں ہوتا کہ اس کی شرح ہوتے ہوتے صدیاں گذر جائیں اور اس کی شرح ختم نہ ہو۔ یہ کتاب مبین ہی کا خاصہ ہے۔ خدائی کتاب ہے اور اسی کے علم ہی کی یہ صورت ہو سکتی تھی کہ علماء، حکماء، عرفاء، اور صوفیاء ہزاروں طبقات کھڑے ہوئے اور اس کی شرح کی اور وہ شرح ہوتی جا رہی ہے۔ حدیث میں فرمایا گیا کہ: "لَا تَنْقَضِیْ عَجَائِبُہٗ." ①

قیامت آ جائے گی مگر قرآن کریم کے عجائبات ختم نہیں ہوں گے برابر چلتے ہی رہے گے اور نکلتے ہی رہیں گے اور آج بھی علماء ہزاروں تصنیف کرتے جا رہے ہیں اور استدلال آیات سے یا احادیث ہی سے ہوتا ہے۔ تو اندازہ کیجئے ایک ایک آیت مستقل ایک سمندر معلوم ہوتا ہے۔

مسلمانوں نے نہ صرف تصانیف کی ہیں بلکہ فنون کی بنیاد ڈالی۔ بیسیوں فنون اور علوم ایجاد کئے ہر ہر فن کے اندر پھر لاکھوں کتابیں ہوئیں۔ تو یہ معجزہ نہیں تو کیا ہے؟ کہ ایک چھوٹی سی کتاب ہے کہ اس کتاب کے اندر سے اتنا علم نکلتا چلا آ رہا ہے کہ لاکھوں کتب خانے بھر گئے، لاکھوں کتابیں بن گئیں اور آج بھی بنتی جا رہی ہیں اور جو نیا مسئلہ یا حادثہ سامنے آتا ہے اس میں سے اس کا حکم نکلتا چلا آتا ہے یہ سوائے اعجاز کی قوت کے اور کون سی قوت ہے؟

اصلاحی نصب...... بہر حال قرآن کریم معجزہ ہے اور مسلمان کی یہ خوش قسمتی ہے کہ حق تعالیٰ نے یہ معجزہ انہیں عطاء فرمایا اور اللہ کا ایک تبرک جو اس کے اندر سے نکل کر آیا ہے وہ ان کے اندر موجود ہے۔ وہ آج بھی اس کی طرف توجہ کریں تو ان کا علم عمل اور تقویٰ پھر اونچے درجے تک پہنچ سکتا ہے اور اس کے آثار پھر ویسے ہی نمایاں ہو سکتے ہیں جیسا کہ کسی زمانے میں نمایاں ہوئے تھے۔

---

① السنن للترمذي، كتاب فضائل القرآن، باب ماجاء في فضل القرآن، ج: ۱۰، ص: ۱۴۷.

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: "لَا یَصْلُحُ اٰخِرُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اِلَّا بِمَا صَلُحَ بِهٖ اَوَّلُهَا." ② اس امت کے اخیر کی اصلاح بھی اسی چیز سے ہوسکتی ہے جس چیز سے امت کے اول کی اصلاح ہوئی ہے۔ تو امت کا اولین طبقہ صحابہ کرام کا ہے۔ ان کی اصلاح کا ضامن یہی قرآن ہوا ہے۔ ان کے کتب خانے میں قرآن کے سوا اور کوئی کتاب نہیں تھی یا قرآن تھا یا اللہ کے رسول کا کلام تھا جو ان کے سینوں میں محفوظ تھا۔ اسی نے ان کی اصلاح کی۔ زمانہ جاہلیت کو تبدیل کیا، اس میں انقلاب پیدا کیا۔ انقلاب پیدا کرنے والی یہی کتاب مبین تھی۔ جو قوم کہ دنیا کی تمام اقوام میں ذلیل سمجھی جاتی تھی، حقارت کی نگاہوں سے عربوں کو دیکھا جاتا تھا۔ وہ پچاس برس کے اندر اندر اتنی اونچی بن گئی کہ قیصر و کسریٰ کے تخت الٹ دیے، حکومتوں میں انقلاب پیدا کر دیے، دنیا میں جہالت کی بجائے علم کو فروغ دیا اور پھیلا دیا۔ یہ انقلاب ان کے اندر اس کتاب مبین ہی نے پیدا کیا۔ اس کے سوا کوئی اور کتاب نہیں تھی اسی کا علم اور اسی کا عمل تھا۔ جس نے انہیں اتنا آگے بڑھایا تو جو چیز ان کی اصلاح کا ذریعہ بنی وہی آج ہماری بھی اصلاح کا ذریعہ بنے گی۔

مرکزِ علوم...... میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ دوسرے علوم اور فنون کی تعلیم چھوڑ دیں۔

تمام علوم و فنون آپ حاصل کریں۔ آپ سائنس، فلسفہ، ہندسہ، ریاضی اور علوم طبعیہ و عقلیہ بھی حاصل کریں۔ لیکن ہر علم کا کوئی معیار اور مرکز بھی تو ہونا چاہئے جس کے ارد گرد وہ علوم گھومیں۔ سارے علوم کا اگر مرکز آپ دین کو بنالیں گے کہ ہم اس کی ترویج و تبلیغ اور فروغ کے لئے یہ تمام چیزیں حاصل کر رہے ہیں یہ سب چیزیں آپ کے حق میں دین بنتی چلی جائیں گی، دنیا ہی کار آمد نہیں ہوگی بلکہ دنیا کے ساتھ آخرت کا اجر و ثواب بھی مرتب ہونا شروع ہو جائے گا۔ اگر دین اور کتاب و سنت کو مرکز بنایا جائے اور تمام علوم و فنون اس کے ارد گرد گھمائے جائیں، جن کا مقصد یہ ہو کہ اس علم کو آگے بڑھانا ہے اس کے ذریعے سے لوگوں کی اصلاح کرنی ہے اور اس کے ذریعے سے لوگوں کو صالح بنانا ہے تو ہر علم و فن کام دے گا اور ہر علم و فن باعث اجر اور باعث اصلاح و تقویٰ بنے گا۔

تحریک...... بہرحال اس وقت یہ چند کلمات میں نے قرآن کریم کے متعلق اس لئے عرض کیے کہ دار القرآن میں یہ جلسہ ہو رہا ہے تو وہ لوگ مبارک ہیں جنہوں نے دار القرآن قائم کر کے قرآن کے فروغ کا راستہ ڈالا۔

قرآن کے الفاظ کا اور اس کے لب و لہجے کے پہنچانے کا۔ اور یہی پھر آگے قرآنی علوم کو پہنچانے کا ذریعہ بنتا ہے۔ تو وہ افراد یقیناً قابل مبارکباد ہیں جنہوں قرآن کی تبلیغ اور ترویج کے لئے ادارے قائم کرنے کی کوشش کی اور قائم کیے۔ اسی میں ہمارے لئے صلاح اور فلاح ہے۔ اس وقت یہ چند جملے اس ذیل میں ذہن میں آ گئے تھے جو میں نے عرض کیے حق تعالیٰ ہمیں اور آپ کو قرآن کریم پر چلنے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطاء فرمائے۔ آمین۔

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ بِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ اَللّٰهُمَّ اَعِذْنَا مِنَ الْفِتَنِ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا

---

① شرح بلوغ المرام، ج: ۱ ص: ۲۹۸۔

بَطْنٍ. اَللّٰهُمَّ اجْعَلِ الْقُرْاٰنَ إِمَامًا لَّنَا وَاجْعَلْهُ حُجَّةً لَّنَا وَارْزُقْنَا عَمَلَهٗ بِفَضْلِکَ الْعَظِيْمِ يَارَبَّ الْعَالَمِيْنَ، اَللّٰهُمَّ تَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ وَاَلْحِقْنَا بِالصّٰلِحِيْنَ غَيْرَ خَزَايَا وَلَا مَفْتُوْنِيْنَ وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ بِرَحْمَتِکَ يَا اَرْحَمَ الرّٰحِمِيْنَ. ①

---

① ۲ ربیع الاول، ۱۳۰۹ھ

خلافتِ تجوید

"اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ. وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ، وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ، اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا، وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا.

اَمَّا بَعْدُ! فَقَدْ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: تَبَرَّکْ بِالْقُرْاٰنِ فَاِنَّہٗ کَلَامُ اللّٰہِ وَخَرَجَ مِنْہُ اَوْ کَمَا قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ①

جوہرِ دنیا..... بزرگانِ محترم! یہ دنیا دو چیزوں سے آباد ہے، وہی دو چیزیں اس دنیا کا جوہر اور روح ہیں۔ ایک اللہ کا کام اور ایک اللہ کا کلام۔ ایک طرف آپ کے سامنے یہ دنیا کھڑی ہوئی ہے، زمین کا فرش بچھا ہوا ہے، آسمان کا خیمہ اوپر تنا ہوا ہے، آسمان میں سورج اور چاند کے انڈے روشن ہیں۔ جن سے اس دنیا میں روشنی اور جگمگاہٹ ہے۔ مختلف قسم کی جاندار اور بے جان مخلوق اس میں آباد ہے اور بس رہی ہے۔ یہ سب چیزیں اللہ کا کام ہیں، یہ اس کی صنعت و صناعی اور کاریگری ہے جو آپ کے سامنے کھڑی ہوئی ہے۔ یہ سب چیزیں فی الحقیقت اللہ کے انعامات اور اس کے تبرکات ہیں۔ سورج اور چاند بھی اللہ کا ایک عطیہ اور تبرک ہے، زمین اور آسمان بھی اللہ کا ایک عطیہ اور تبرک ہے۔ لیکن ان میں سے کوئی چیز بھی اللہ کے اندر سے نکل کر نہیں آئی۔ اللہ کے پیدا کئے ہوئے سے پیدا ہوئی ہے، لیکن خدا کے اندر سے نکل کر نہیں آئی اس نے ایک معدوم شے کو وجود دیا، تخلیق کی، پیدا کیا اور نمایاں فرما دیا تو اس کی ایجاد سے ہی یہ ساری چیزیں آپ کے سامنے موجود ہیں۔

امتیازی عطیہ..... لیکن وہ تبرک اور عطیہ جو اللہ کے اندر سے نکل کر آیا ہے اس کے باطن سے نکل کر ظاہر ہوا اور آپ کے سامنے آیا وہ اللہ کا کلام ہے۔ تو یہ ساری چیزیں مخلوق کہلائیں گی۔ لیکن کلام مخلوق نہیں ہو سکتا۔ جب آپ کوئی چیز بناتے ہیں تو آپ کہتے ہیں کہ میں نے یہ چیز بنائی، میں نے عمارت بنائی، چارپائی بنائی، برتن بنایا۔ لیکن جب کلام کرتے ہیں تو یوں نہیں کہا کرتے کہ میں نے اپنے کلام کو بنایا یا میں نے اپنے کلام کو پیدا کیا۔ بلکہ یہ کہتے ہیں کہ میں نے کلام کیا۔ تو کلام متکلم کے اندر سے سرزد ہوتا ہے، صادر ہوتا ہے۔ بنایا نہیں جاتا۔ باہر کی چیز بنائی

---

① کنز العمال لعلی المتقی الھندی، ج: ۱، ص: ۳۳۶، رقم: ۲۳۶۴۔

جاتی ہے۔ جس کو وجود دیا جاتا ہے تو یہ زمین اور آسمان اللہ کے اندر سے نکل کر نہیں آئے، اس کے پیدا کئے سے پیدا ہوگئے اور نمایاں ہوگئے۔ لیکن کلام خداوندی خود اس کی ذات میں سے نکلا ہے اور نکل کر ہمارے سامنے آیا تو سب سے بڑا تبرک اور عطیہ جو بلاواسطہ اللہ کے اندر سے نکل کر آیا، وہ آج مسلمانوں کے ہاتھ میں موجود ہے۔

امتیازِ مسلم...... تو یہ ایک مسلمانوں کا امتیاز اور خوش قسمتی ہے کہ براہ راست عطیہ خداوندی اور تبرک الٰہی ان کے ہاتھ کے اندر موجود ہے۔ اللہ کے اندر سے نکلا اور ان کے اندر داخل ہوگیا۔ اسی واسطے حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”تَبَرَّکْ بِالْقُرْاٰنِ فَاِنَّهٗ کَلَامُ اللّٰهِ وَخَرَجَ مِنْهُ اَوْکَمَا قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ“ ”قرآن سے برکت حاصل کرو، اس لئے کہ وہ اللہ کا کلام ہے اور اس کے اندر سے نکل کر آیا ہے“۔

کلام خداوندی یوں تورات بھی ہے، انجیل اور زبور بھی ہے۔ لیکن حقیقی معنی میں کلام وہ ہوتا ہے جس سے تکلم کیا جائے اور بولا جائے۔ تورات سے حق تعالیٰ بولے نہیں بلکہ الواح لکھ کر موسیٰ علیہ السلام کے پاس بھیج دیں۔ اسی طرح انجیل بھی کلام خداوندی ہے مگر اس کا تکلم واقع نہیں ہوا۔ عیسیٰ علیہ السلام کے قلب مبارک پر اس کا الہام کردیا گیا۔ الفاظ منزل من اللہ نہیں ہیں۔ مضمون حق تعالیٰ کا ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے مبارک الفاظ میں اسے پڑھ کر سنایا۔ اسی طرح سے زبور کے ساتھ بھی تکلم واقع نہیں ہوا۔

امتیازی کتاب...... قرآن کریم کی یہ خصوصیت ہے کہ اللہ نے اس کا تکلم کیا، اسے پڑھ کر سنایا۔ اسی واسطے قرآن کریم میں قرات کی نسبت اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف کی، تلاوت کی نسبت بھی اپنی طرف کی اور تکلم کی نسبت بھی اپنی طرف کی۔ فرمایا گیا: ﴿فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ﴾ ① ”جب ہم قرآن کریم کی قرات کریں تو اے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! سنتے رہو اور اس کی پیروی کرو“

کہیں فرمایا: ﴿نَتْلُوْا عَلَیْکَ مِنْ نَّبَاِ مُوْسٰی وَفِرْعَوْنَ بِالْحَقِّ﴾ اے پیغمبر! ہم آپ کے اوپر تلاوت کرتے ہیں موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ اور فرعون کا قصہ۔ بہرحال حق تعالیٰ نے اپنے آپ کو تالی اور تلاوت کنندہ بھی کہا اور قاری بھی اپنے آپ کو کہا اور حافظ بھی اپنے آپ کو کہا۔ فرمایا: ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ ② ”اور ہم نے ہی یہ کلام اتارا ہے اور ہم ہی اس کے حافظ اور نگہبان ہیں“۔

تو حافظ بھی وہ ہیں، قاری بھی وہ ہیں اور تلاوت کرنے والے بھی وہ ہیں تو یہ خصوصیت قرآن کریم کی ہے کہ اس کی تلاوت بھی اللہ کی طرف سے واقع ہوئی، اس کا تکلم بھی ان کی طرف سے واقع ہوا، اس کی قرات بھی ان کی طرف سے واقع ہوئی۔

صوتِ سرمدی...... کلام کے لئے بہرحال کچھ آواز کی ضرورت پڑتی ہے۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جب

---

① پارہ: ۲۹، سورۃ القیامۃ، الآیۃ: ۱۸۔

② پارہ: ۱۴، سورۃ الحجر، الآیۃ: ۹۔

پوچھا گیا کہ: ”كَيْفَ يَأْتِيْكَ الْوَحْيُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟“ ① ”یارسول اللہ! آپ پر وحی کس طرح سے آتی ہے؟ کیا کیفیت ہوتی ہے؟“ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”يَأْتِيْنِيْ مِثْلَ صَلْصَلَةِ الْجَرَسِ.“ ② میرے اوپر وحی اس طرح سے آتی ہے جیسے گھنٹہ بجا کر جب چھوڑ دیا جاتا ہے، تو اس میں ایک قسم کی گونج ہوتی ہے جو کئی منٹ تک اس کی آواز آتی رہتی ہے میں ایسی ایک گونج دار آواز سنتا ہوں۔

کہیں یہ فرمایا چکنے پتھر کے اوپر اگر ایک لوہے کی زنجیر ڈال کر اسے کھینچا جائے تو ایک مسلسل جھنجھناہٹ پیدا ہوتی ہے، میں اس قسم کی آواز سنتا ہوں جس سے واضح ہوتا ہے کہ قرآن کریم کی تلاوت میں کسی قسم کی صوت اور آواز کا بھی دخل ہے اگرچہ اس کی کیفیت ہم نہیں بیان کر سکتے۔ مگر بہر حال تکلم کے لئے صوت ہوتی ہے تو صوت سرمدی کے ساتھ قرآن کریم سنایا گیا۔

عظمتِ کلام...... جبرئیل علیہ السلام نے اولاً کلام کو سنا۔ حدیث میں ہے کہ جب حق تعالیٰ وحی فرماتے تو اس کی ہیبت اور عظمت سے تمام ملائکہ پر غشی طاری ہو جاتی ہے خود جبرئیل علیہ السلام پر بھی اس کی ہیبت وعظمت اور جلال سے غشی طاری ہوتی تھی۔ سب سے پہلے حضرت جبرئیل علیہ السلام افاقہ پاتے تھے، اس کے بعد دوسرے ہوش میں آتے تھے تو ملائکہ پوچھتے تھے ﴿مَاذَا قَالَ رَبُّكُمْ﴾ ③ ”کیا فرمایا تمہارے پروردگار نے؟“ ﴿قَالُوا الْحَقَّ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ﴾ ④ کہتے ”حق فرمایا اور وہ ”علی وکبیر“ ہے“۔

خلافتِ تجوید وقرات...... اس سے واضح ہوتا ہے کہ کوئی کلام جبرئیل علیہ السلام سنتے تھے اس سماع کی ہیبت سے ہی غشی طاری ہوتی تھی تو تکلم کے ساتھ صورت اور آواز واقع ہوتی ہے، جب آواز عظیم اور ہیبت ناک ہوتی ہے تو اس کی ہیبت سے ضروری ہے کہ غشی طاری ہوتی ہے۔ اگر گرج زور سے ہو جائے تو یقیناً دل دہل جاتے ہیں اور بعض دفعہ آدمی بے ہوش ہو جاتا ہے آدمی تو آدمی۔ آواز جب زوردار آتی ہے تو اس سے پہاڑ تک شق ہو جاتے ہیں، عمارتیں گر جاتی ہیں مکانات گر پڑتے ہیں۔ تو قرآن کریم کی آواز جب سنائی دیتی تھی تو ملائکہ جیسی طاقت ور مخلوق بھی ہیبت زدہ ہو کر بے ہوش ہو جاتی تھی۔

بہر حال قرآن کریم کی تلاوت واقع ہوئی اور تکلم واقع ہوا اور کوئی خاص قسم کی آواز بھی تھی جس سے تکلم ہوتا تھا۔ جس کو ملائکہ سنتے تھے اور بعض اوقات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی سنا۔ تو قرآن کریم میں ایک طرف الفاظ ہیں، ایک طرف اس کے معنی ہیں اور ایک طرف اس کا تکلم اور لب ولہجہ ہے۔ الفاظ کی حفاظت حفاظ نے کی ہے۔ بحمد اللہ آج اس کا ایک ایک لفظ، اس کا ایک ایک اعراب اور ایک ایک نقطہ محفوظ ہے اور لکھا پڑھا موجود ہے۔ بعض قرآن کریم چھاپے گئے ہیں جن میں رکوعات کی تعداد اور سورتوں کی تعداد، حروف کی اور لفظوں کی تعداد اور زیر وزبر

---

① ② الصحیح للبخاری، کتاب بدء الوحی، باب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ ﷺ، ج: ۱، ص: ۲، رقم: ۲۔ ③ پارہ: ۲۲ سورۃ السبا، الآیۃ: ۲۳۔ ④ پارہ: ۲۲ سورۃ السبا، الآیۃ: ۲۳۔

کی تعداد تک لکھی گئی ہے۔ اس کو حفاظ نے محفوظ کیا۔ اس کے معانی کی علماء اور فقہاء نے حفاظت کی۔ اس کو اللہ تعالیٰ نے جو کچھ قانونی حیثیت دی تھی، اس کو علماء نے سمجھا اس کے لب ولہجہ اور طرز ادا کی قراء اور مجودین نے حفاظت کی۔

جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حق تعالیٰ سے سنا جبریل علیہ السلام سے سنا تو ایک خاص لب ولہجے سے سنا، پھر اسی لب ولہجے سے آپ نے تلاوت فرمایا اور اپنے صحابہ کو آپ نے سکھلایا۔ اس میں سے بہت سے قراء اور مجودین ہیں ان مجودین نے سنا اور سن کر دوسروں کو سنایا اور سکھلایا۔ تو قرآن کریم کی طرز ادا کی مجودین نے حفاظت کی۔ اگر الفاظ میں حفاظ خلفاء خداوندی ہیں اور معانی میں اگر خلفاء الٰہی علماء ہیں تو اصوات اور طرز قرات میں خلفاء ربانی قراء اور مجودین ہیں جنہوں نے طرز ادا کی حفاظت کی۔ اس کے رسم الخط کی حفاظت کی۔ وہ اسی انداز میں آج بھی لکھا جاتا ہے جس انداز میں قرن اول میں لکھا گیا۔ مثلاً آپ الرحمٰن لکھیں گے تو یہ لکھنا مکروہ اور ممنوع ہے کہ میم کے ساتھ الف ملا کر "الرحمان" لکھا جائے میم کے ساتھ نون ملا کر لکھیں گے اور میم پر کھڑا زبر دے دیں گے۔ یہ اصل رسم الخط ہے۔ تو اسی طرح پورے رسم الخط کی حفاظت کی گئی۔ علماء رسم الخط نے اس کے قواعد منضبط کئے اور اس کو ایک فن کی صورت دی۔ تو پورے ایک طبقے نے اس کی حفاظت کی۔

اس کی حکمتوں کی حفاظت حکماء اسلام نے کی۔ اسکے اندر تاریخ کے جتنے جملے موجود ہیں، ان کی تفصیلات مؤرخین نے بیان کیں۔ اس میں جتنے حقائق موجود ہیں، ان کو صوفیاء کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نے منضبط کیا۔ تو قرآن کریم کے ایک ایک پہلو کی حفاظت کے لئے مستقل ایک ایک طبقہ کھڑا ہو گیا۔ الفاظ کے لئے حفاظ، معانی کے لئے علماء، رسم الخط کے لئے علماء رسم الخط، آواز اور طرز ادا کے لئے قراء اور مجودین، حکم اور مصالح کے لئے حکماء، حقائق کے لئے صوفیاء، اور علل واسرار کے لئے فقہاء۔ تو ایک ایک طبقے نے ایک ایک پہلو کی حفاظت کی اسی طرح سے قرآن کریم محفوظ ہوا۔ ﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ﴾ ① "ہم ہی نے قرآن اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں"۔

امتیازی حفاظت...... تو حقیقی حفاظت تو حق تعالیٰ شانہٗ کی ہے۔ لیکن اللہ کی جتنی صفات اور کمالات ہیں، وہ اس دنیا میں بذیل اسباب نمایاں ہوتے ہیں۔ خالق بلاشبہ حق تعالیٰ ہیں لیکن تخلیق مرد وعورت کے ملنے سے واقع ہوتی ہے تو سبب تخلیق مرد وعورت ہیں اور خالق حق تعالیٰ ہیں۔ ماں باپ کو خالق نہیں کہا جائے گا، سبب تخلیق کہا جائے گا۔ رزاق بلاشبہ حق تعالیٰ ہیں لیکن رزق رسانی کا ذریعہ زمین کو بنایا، اس سے غلہ اگتا ہے۔ کاشتکار اس میں محنت کرتا ہے تو کاشتکار ظاہر میں محنت کرتا ہے۔ حقیقت میں کاشتکاری حق تعالیٰ فرماتے ہیں جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا: ﴿ءَأَنتُمْ تَزْرَعُونَهُ أَمْ نَحْنُ الزَّارِعُونَ﴾ ② "تم زراعت کرتے ہو کہ ہم زراعت کرتے ہیں؟"۔

تم نے بیج ڈال دیا، اس بیج کی منوں مٹی کے نیچے حفاظت کرنا، اس میں سے کونپل نکالنا، کونپل میں مادے اور جوہر

---

① پارہ: ۱۴، سورۃ الحجر، الآیۃ: ۹۔ ② پارہ: ۲۷، سورۃ الواقعۃ، الآیۃ: ۶۴۔

رکھنا، پھر اس کو پھل میں دانہ پیدا کرنا، یہ کاشتکار کا کام ہے یا ہمارا کام ہے؟ تو محض دانہ ڈال دینا یہ کاشت نہیں ہے۔ اس میں سے بنانا، بنا کر درخت نکالنا، درخت میں سے پھل نکالنا، اصل کاشتکاری یہ ہے۔ تو فرماتے ہیں: ﴿ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗۤ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ﴾ ① ”تم زارع اور کاشتکار ہو کہ ہم کاشتکار ہیں؟ ہم کھیتی کرتے ہیں کہ تم کرتے ہو؟“۔

اور فرمایا: ﴿ءَاَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَهٗۤ اَمْ نَحْنُ الْخٰلِقُوْنَ﴾ ② تم خالق ہو کہ ہم خالق ہیں؟ تمہارا کام اتنا ہے کہ نر و مادہ مل گئے۔ رحمِ مادر میں کیا ہو رہا ہے؟ کس طرح سے مخلوق بنائی جا رہی ہے؟ کس ترتیب سے اسے ابھارا جا رہا ہے؟ یہ تو کرنے والا جانتا ہے۔ وہی کرتا ہے، خود اس ماں کو خبر نہیں جس کے پیٹ میں یہ ساری مشینری چل رہی ہے اور کارخانہ چل رہا ہے۔ تو اس اندھیری کوٹھری میں پانی کے اوپر نقاشی کرنا یہ اسی صانعِ حکیم کا کام ہے جس کی قدرت لامحدود ہے۔ اسی طرح سے کلام کو تکلم کرنا، فرمایا تم تکلم کرتے ہو، ظاہر میں تم ہو مگر حقیقت میں کلام ہمارا ہوتا ہے۔ حفاظت بظاہر تم کر رہے ہو مگر حقیقت میں ہماری حفاظت ہے۔ ظاہر میں تم قاری ہو مگر حقیقت میں ہم قاری ہیں جو قرآن کریم کی قرأت کر رہے ہیں۔ تو حفاظتِ خداوندی بذیلِ اسباب نمایاں ہو رہی ہے۔

آج کے دور میں جب کہ قرآن کریم کی طرف لوگوں کی توجہ نہیں ہے یعنی سو میں سے ایک دو کی ہے۔ مجموعی طور پر توم متوجہ نہیں ہے جیسا کہ توجہ کا حق ہے، قرآن کی تعلیم پر کوئی مادی وعدہ نہیں ہے کہ آپ نے اگر قرآن پڑھ لیا تو آپ کو کوئی بڑا عہدہ مل جائے گا یا قرآن پڑھ لیا تو چند لاکھ روپے آپ کو مل جائیں گے یا کوئی جاگیر آپ کو مل جائے گی؟ کوئی اس قسم کا وعدہ نہیں۔ اس کے باوجود یہ دار العلوم کس طرح سے قائم ہیں؟ یہ حافظ خانے کس طرح سے قائم ہیں؟ ہزاروں آدمی کیوں چلے آ رہے ہیں؟ یہ محض قرآن کا معجزہ ہے کہ کوئی وعدہ نہیں اور دلوں پر دباؤ پڑ رہا ہے کہ آؤ پڑھو اور پڑھاؤ، بظاہر اس میں کوئی دنیوی مفاد نہیں ہے پھر بھی آنے پر مجبور ہیں۔ یہ وہی حفاظتِ خداوندی ہے کہ دلوں میں ڈالا جا رہا ہے۔ وہ آ رہے ہیں اور پڑھ رہے ہیں اور قرآن کی حفاظت ہو رہی ہے۔

پھر حفاظت بھی چھوٹے بچوں سے کرائی جا رہی ہے۔ عموماً قرآن کریم پڑھنے والے چھوٹے بچے ہی ہوتے ہیں۔ بڑے آدمی اگر پڑھتے تو یہ تہمت آ سکتی تھی کہ وہ حفاظتِ قرآن کی غرض سے پڑھ رہے ہیں اور ان کی طرف حفاظت منسوب ہوتی کہ اگر یہ عقلاء اور بڑے بوڑھے متوجہ نہ ہوتے تو قرآن محفوظ نہ ہو سکتا۔ تو وہ اگر حفاظت کرتے تو ان کے ارادے کی طرف نسبت ہوتی کہ انہوں نے کچھ سوچ سمجھ کر حفاظت کی ہے۔ لیکن بچوں سے حفاظت کرائی جا رہی ہے۔ جنہیں یہ بھی خبر نہیں کہ اس کے پڑھنے سے فائدہ کیا ہے؟ اور حفاظت ہو رہی ہے تاکہ اس کی حفاظت کی نسبت خالص اللہ کی طرف ہو کہ وہ حفاظت کرنے والے ہیں، بچے حفاظت کرنے والے نہیں ہیں۔ تو بڑوں کے ذریعے حفاظت ہوتی تو حفاظت کی نسبت ان کی طرف ہوتی جس سے تہمت آتی۔ اس لئے عادت اللہ یوں چلی کہ چھوٹے بچے پانچ پانچ، چھ چھ اور سات سات برس کے جن سینوں کے اندر قرآن کریم محفوظ

---

① پارہ: ۲۷ سورۃ الواقعۃ، الآیۃ: ۶۴۔ ② پارہ: ۲۷ سورۃ الواقعۃ، الآیۃ: ۵۹۔

ہے تا کہ یہ حفاظت براہِ راست اللہ کی حفاظت سمجھی جائے، بہر حال فرمایا گیا: ﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحٰفِظُونَ﴾ ① ”ہم نے ہی یہ قرآن اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں“۔ تو حقیقی حفاظت حق تعالیٰ شانہٗ کی طرف سے ہو رہی ہے۔

حفاظت بطریق حفظ...... اور اس کے ایک ایک پہلو کی حفاظت کے لئے ایک ایک مستقل طبقہ کھڑا ہو گیا جس نے حفاظت کی۔ تو یہ قراء اور مجودین بھی فی الحقیقت قرأت کے اندر خلفاء خداوندی ہیں۔ ان کی سند بھی جا کر اللہ تعالیٰ ہی کی طرف پہنچتی ہے۔

اسلام کی یہ خصوصیت ہے کہ اس میں ہر چیز استناد کے ساتھ ہے۔ قرآن کریم ہے، حدیث ہے، فقہ ہے اصولِ فقہ ہے۔ سب چیزیں سند کے ساتھ ہیں۔ حدیث کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک ٹکڑے کی سند ہم سے لے کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتی ہے۔ ایک ذرا سا جملہ آپ روایت کریں گے اس کی سند نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ جائے گی۔ محدثین نے حدیث کے راویوں میں سے چار لاکھ راویوں کی تاریخ مدون کر دی۔ ان کا کیریکٹر ان کا کردار، ان کا حافظہ، ان کا ضبط، ان کی عدالت اور ان کے نام و نسب محفوظ کر دیئے کہ یہ راویانِ حدیث ہیں۔

اسی طرح سے قرآن کریم کی حفاظت سند کے ساتھ کی گئی ہے۔ یہ جتنے قراء اور مجودین ہیں، ان کو سند دی جاتی ہے۔ مثلاً میں نے خود مولانا قاری عبدالوحید صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے قرآن کریم پڑھا اور تجوید کے ساتھ پڑھا تو اس کی سند میرے پاس محفوظ ہے۔ تو مجھے قاری عبدالوحید صاحب نے پڑھایا۔ ان کو قاری عبدالرحمن صاحب الہ آبادی نے پڑھایا۔ ان کو قاری عبداللہ صاحب مکی نے پڑھایا، ان کو قاری ابراہیم رشید مصری نے پڑھایا اور پھر آگے ان کے استاد، یہاں تک کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک سند پہنچ گئی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں نے اسکو بواسطہ جبرئیل حق تعالیٰ سے حاصل کیا اور جبرئیل کہتے ہیں کہ میں نے براہِ راست حق تعالیٰ سے سنا۔ تو ایک قاری کی سند اللہ تک پہنچ جاتی ہے۔ تو جس طرح سے قرآن کریم کے الفاظ کی سند محفوظ ہے اسی طرح سے اس کے لب و لہجے کی سند بھی محفوظ ہے اس کے معانی اور علوم کی سند بھی محفوظ ہے اس کے کلام کے جتنے پہلو ہیں وہ سب سند کے ساتھ محفوظ ہیں، ایک ایک نقطہ تک اس کا حفاظت کیا گیا ہے۔ تو فرمایا: ﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحٰفِظُونَ﴾ ② ”ہم نے اس کو نازل کیا، اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں“۔ تو حفاظت کا یہی طریقہ ہوتا ہے کہ زبان سے پڑھا جائے یا لکھا جائے تو حق تعالیٰ کی طرف سے تکلم بھی واقع ہوا اور لکھا بھی گیا۔

حفاظت بطریق کتابت...... حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ قرآن کریم سب سے پہلے لوحِ محفوظ کے اوپر لکھا گیا ہے۔ جیسا کاتب ہے ویسی ہی اس کی کتابت ہے۔ ویسے ہی اس کے حروف ہیں۔ بعض سیر کی روایتوں میں ہے کہ لوحِ محفوظ میں قرآن کریم لکھا گیا اور اس کا ایک ایک حرف کوہِ قاف کے برابر ہے۔ تو جیسا اس کا لکھنے والا

---

① ② پارہ: ۱۴، سورۃ الحجر، الآیۃ: ۹۔

ہے ویسے ہی اس کے حروف ہیں۔ جبریل علیہ السلام نے لوحِ محفوظ کو دیکھ کر قرآن حفظ کیا۔ پھر اسی قرآن کو حضرت اسرافیل علیہ السلام کی پیشانی پر لکھا گیا یہ گویا ان پر انعام کیا گیا۔ تو اسرافیل علیہ السلام کی پیشانی پر اور لوحِ محفوظ میں بھی درج ہے اور جبریل علیہ السلام کے قلب میں درج کیا گیا۔ اس کے بعد میں پھر بیت العزت میں قرآن اتارا گیا۔ یہ آسمانِ اول کے اوپر یعنی آسمانِ دنیا میں ایک مقام ہے۔ پورا قرآن آسمانِ دنیا کے اوپر بیت العزت میں اتار دیا گیا۔ اور وہاں سے پھر تئیس برس میں رفتہ رفتہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر نازل ہوا۔ ایک ایک آیت، دو دو آیت حسبِ موقع حسبِ واقعہ اتری گئی۔ تو گویا اللہ سے چلا لوحِ محفوظ تک آیا پھر جبرئیل تک آیا، پھر بیت العزت میں آیا، پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا۔

حفاظت بطریقِ تواتر...... اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو پڑھایا، صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے تابعین کو پڑھایا، تو قرآن کریم میں تواتر بھی طبقہ کا ہے۔ ایک تو ضابطے کا تواتر ہوتا ہے حدیث متواتر اس کو کہتے ہیں جس میں کم سے کم تین تین آدمی روایت کرتے چلے آ رہے ہوں اور اخیر تک تین کا عدد محفوظ رہے۔ بہرحال تین ہو یا تین سے زیادہ۔ یہ اعلیٰ ترین تواتر سمجھا جاتا ہے۔ لیکن قرآن کریم میں تین تین کا نہیں بلکہ ہزاروں ہزار کا ہے۔ ہر قرن میں ہزاروں لاکھوں حافظ رہے۔ ہر قرن کے اندر ایک طبقے نے دوسرے طبقے سے سنا، دوسرے نے تیسرے سے سنا۔ اسی طرح سے سند چلی۔

محیط بالدیانت کتاب...... تو مروی عنہ جس سے روایت کی گئی وہ حق تعالیٰ شانہ ہیں، راوی اول وہ جبرئیل علیہ السلام ہیں۔ پھر حفاظت کے ساتھ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ مبارک پر اس کو اتارا گیا۔ جس کو ایک جگہ ارشاد فرمایا گیا: ﴿وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ o نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ o عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ﴾ ① ”یہ اللہ رب العزت کا نازل کردہ ہے۔ اس کو لے کر روح الامین نازل ہوئے اور قلبِ محمدی کے اوپر لے کر آئے“۔

حق تعالیٰ شانہٗ کی صفت اس کے اسماء میں سے امین ہے کہ وہ امانت والا ہے۔ حضرت جبریل کی صفت روح الامین، وہ خود امانت والے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت محمد الامین ہے کہ امانت والے۔ اور یہ امانت کا لفظ وہ تھا جس کو اپنوں نے ہی نہیں بلکہ غیروں نے بھی تسلیم کیا۔ نبوت سے پہلے تمام کفارِ مکہ آپ کو امین کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم آتے تو کہتے: ”جَآءَ مُحَمَّدٌ الْاَمِيْنُ“ ② ”امانت والا آ گیا“۔

تو کلام امین سے چلا، امین کے قلب پر اترا۔ تو امانت کے ساتھ اوپر سے نیچے تک پہنچ گیا۔ سند میں یہی دیکھا جاتا ہے کہ راوی اور مروی عنہ پوری عدالت لئے ہوئے ہوں، پورا ضبط لئے ہوئے ہوں پوری امانت داری کے ساتھ پہنچائیں۔ تو اللہ سے بڑھ کر امانت والا کون ہو سکتا ہے اور جبرئیل علیہ السلام سے بڑھ کر امین کون ہو سکتا ہے؟ اور خاتم الانبیاء سے بڑھ کر انسانوں میں امانت والا کون ہو سکتا ہے؟ تو تین امینوں کے اندر یہ کلام رہا پھر سند کا سلسلہ چلا۔

---

① پارہ: ۱۹، سورۃ الشعراء، الآیۃ: ۱۹۲ تا ۱۹۴. ② المستدرک للحاکم، کتاب المناسک، ج: ۳ ص: ۲۰۸.

سندِ قرآن پر ازروئے قرآن بحث...... اسی واسطے ایک جگہ قرآن کریم میں اس کی سند بیان کی گئی ہے۔ جیسا کہ محدثین کوئی حدیث بیان کریں تو راویوں کے اوپر نقد تبصرہ کرتے ہیں کہ اس کے راوی کیسے ہیں پہنچانے والے کیسے ہیں جس درجہ کا راوی ہوگا اسی درجے کی روایت ہوگی۔ تو ایک سورۃ میں مستقل طور پر قرآن کریم کی سند پر بحث کی گئی ہے۔ فرمایا گیا: ﴿اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۝ ذِیْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِی الْعَرْشِ مَكِيْنٍ ۝ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ﴾ ①

گویا راوی اول جبریل علیہ السلام ہیں۔ اس لئے ان کا وصف بیان کیا گیا۔ چنانچہ فرمایا گیا ﴿اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ﴾ ② ''یہ کہا ہوا ہے ایک رسول کا جو کریم ہے''۔ تو لفظ ''رسول'' سے تعبیر کیا گیا۔ ظاہر ہے کہ رسول کس کے ہیں؟ اللہ ہی کے رسول ہیں اللہ تعبیر فرما رہے ہیں۔ ہر شخص اپنا رسول اور قاصد اسے بناتا ہے جس پر پورا اطمینان ہو۔ اگر ذرا بھی بے اعتباری ہوا سے قاصد نہیں بنایا جا سکتا۔ معمولی معمولی باتوں پر اسے قاصد بناتے ہیں جس پر پورا اطمینان ہو، وہ دوستوں میں شمار ہوتا ہو، دشمن اور بدخواہ نہ ہو۔ سچا ہو، امانت دار ہو۔ تو اول تو لفظ رسول سے حضرت جبریل کی تعریف کی گئی کہ وہ ہمارے رسول ہیں۔ رسالت خود ایک بزرگی اور برگزیدگی کی چیز ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ رسول بھی کیسے ہیں؟ کریم ہیں۔

جن کے اخلاق میں کرم داخل ہے۔ ان کی عادت میں کرم داخل ہے۔ تو رسول بھی ہیں اور کریم بھی ہیں۔ کریم النفس ان کا جوہر ہے تو دو لفظ فرمائے گئے ایک رسول اور ایک کریم جس سے گویا جبریل علیہ السلام کی شان واضح کی گئی۔

لیکن یہ سوال ہو سکتا تھا کہ ایک شخص رسول بھی ہے، کریم بھی ہے، نیک نفس ہے۔ بلکہ نیک نیت ہے۔ مگر اتنا کمزور ہے کہ اگر کلام لے کر آئے تو کسی نے دباؤ ڈالا تو ممکن ہے کہ دباؤ میں بات بدل ڈالے، دباؤ میں آکر مرعوب ہو جائے۔ تو نیک نیت بھی ہے، امانت دار بھی ہے مگر دل کا کمزور ہے۔ سچی بات کہنے لگا تھا مگر دوسرے نے تلوار دکھلائی کہ یہ کیا کہتا ہے؟ دباؤ میں آکر اس نے کچھ کا کچھ کہہ دیا۔ تو بعض دفعہ ایک شخص نیک نیت ہے، کریم النفس بھی ہے۔ مگر بے حد کمزور ہے۔ اندیشہ ہوتا ہے کہ شاید دب کر کلام میں تبدیلی کر دے۔ اس لئے ایک جملہ اور فرمایا:

﴿ذِیْ قُوَّةٍ﴾ ③ رسول بھی ہے، کریم بھی ہے، طاقت ور ہے، کمزور اور ضعیف نہیں ہے کہ کوئی اس پر دباؤ ڈال کر کچھ کا کچھ کہلوائے بہرحال تین باتیں ہوئیں کہ جبریل میں رسالت بھی ہے، کرامت بھی ہے اور قوت بھی ہے جبریل ایسے نہیں ہیں کہ کسی کے دباؤ میں آکر کچھ کا کچھ کہہ دیں۔ سنجیدگی سے کہیں گے، امانت سے کہیں گے اور جو پیغام دیا گیا ہے وہی پہنچائیں گے۔ لیکن پھر بھی ایک احتمال ہو سکتا تھا کہ ایک شخص نیک نیت بھی ہے، کریم النفس بھی اور باقوت بھی ہے۔ لیکن اس نے دور سے کلام کو سنا اور کچھ کا کچھ سن لیا۔ جب روایت کی تو پوری طرح وہ روایت نہ کر سکا جو اصل متکلم کا کلام تھا۔ اس نے میل دو میل، فرلانگ دو فرلانگ سے سنا۔ آواز آ رہی تھی مگر دور کی

---

① پارہ: ۳۰، سورۃ التکویر، الآیۃ: ۱۹، ۲۰، ۲۱۔ ② پارہ: ۳۰، سورۃ التکویر، الآیۃ: ۱۹۔

③ پارہ: ۳۰، سورۃ التکویر، الآیۃ: ۲۰۔

آواز تو دور کی ہوتی ہے۔ ہوسکتا ہے۔ کہ غلط فہمی ہوجائے آواز پوری طرح کان میں نہ پڑے۔ یہ ایک احتمال ہوسکتا تھا اس واسطے ایک جملہ اور بڑھایا ﴿عِنْدَ ذِی الْعَرْشِ مَکِیْنٍ﴾ ① جبریل عرش والے کے پاس ہی رہتے ہیں کہیں دوری اور بعد نہیں ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ دور بیٹھ کر کچھ کا کچھ سن لیں۔ تو قرب بھی انتہائی ہے کہ ان کا مکان اور جگہ اور رتبہ بھی عرش والے کے پاس ہے جیسا کہ حدیث میں ارشاد فرمایا گیا کہ: جبریل علیہ السلام کا مقام سدرۃ المنتہیٰ ہے۔ اور یہ ساتویں آسمان کے اوپر ہے سدرۃ کے آگے پھر جنتوں کے علاقے شروع ہوتے ہیں۔ پھر اس کے اوپر سمندر ہے جس کے اوپر عرش عظیم واقع ہے۔ بہرحال کائنات کا دائرہ جس کو مکلّف کہا جاتا ہے وہ آسمانوں کے نیچے نیچے ہے تو آسمان کے اوپر جا کر حضرت جبریل کا مقام ہے۔ اب پرواز اگر ہوتی ہوگی تو کہیں اوپر ہی ہوگی۔ نیچے بھی آتے ہیں اوپر بھی جاتے ہیں۔ اس لئے فرمایا گیا کہ: ﴿عِنْدَ ذِی الْعَرْشِ مَکِیْنٍ﴾ ② ”عرش والے ہی کے پاس مقیم ہیں“۔

لہٰذا دوری اور بعد کا کوئی سوال نہیں۔ تو ایک راوی کی یہ شان نکل کہ اس میں رسالت بھی ہے، کرامت بھی ہے، قوت بھی ہے اور قرب خداوندی بھی ہے۔ بعد کا کوئی احتمال نہیں ہے۔

مگر پھر بھی ایک احتمال ہوسکتا تھا کہ ایک شخص رسول ہے، کریم ہے، طاقت ور ہے، اللہ کا مقرب بھی ہے۔ لیکن اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ یعنی اس کا منصب کوئی نہیں۔ منصب والا جب بولتا ہے، اس کی طرف توجہ کی جاتی ہے۔ ایک بڑے سے بڑا آدمی ہو طاقت ور بھی ہو مگر اس کے پاس کوئی عہدہ نہ ہو، کوئی ضابطے کی بڑائی اس کے پاس نہ ہو تو اس کے کلام کو توجہ سے نہیں سنا جائے گا۔ اگر میں ایک جملہ بولوں اس کی کوئی وقعت نہیں ہوگی۔ لیکن اگر کسی ملک کا سربراہ وہی جملہ بولے، تو سیاست کی بساط الٹی چلی جاتی ہے۔ اس کے معنی ہوتے ہیں ملکوں میں اس سے انقلابات واقع ہوجاتے ہیں۔ اس لئے کہ ایک صاحب منصب نے کلام کیا۔ تو آدمی نیک بھی ہے، بزرگ بھی ہے، مقرب خداوندی بھی ہے، حقانی بھی ہے۔ مگر منصب دار اور عہدہ دار نہیں، کوئی منصبی رتبہ نہیں ہے، تو اس کا کلام زیادہ قابل توجہ نہیں ہوتا۔ تو جبریل علیہ السلام کے متعلق ممکن تھا کہ کوئی یہ کہتا کہ بڑے درویش ہیں، بڑے اعلیٰ درجہ کے مقرب ہیں، عرش کے قریب رہتے ہیں، نیک بھی اور بزرگ بھی ہیں، کامل امانت دار ہیں مگر عہدہ وغیرہ تو ہے نہیں۔ اس لئے ان کی ذمہ دارانہ شان نہیں ہے کہ ان کے کلام کو توجہ سے سنا جائے اس لئے حق تعالیٰ نے ایک جملہ اور بڑھایا۔

﴿مُطَاعٍ﴾ ③ سارے ملائکہ کے سردار بھی ہیں اور واجب الاطاعت ہیں، سارے فرشتے ان کے آگے جھکے ہوئے ہیں، آسمانوں میں ان کی حکومت ہے، سید الملائکہ ہیں تو ظاہر بات ہے جب متکلم، قاصد اور بولنے والا اپنی ذات سے بزرگ ہو، صاحب امانت ہو، باہر سے اس کو رسالت ملی ہوئی ہو اور اوپر سے اتنا بڑا عہدہ دار کہ ساتوں آسمانوں میں اس کی حکمرانی بھی ہو۔ اس کی ذمہ داری اور اس کا منصب بھی ہو، تو اتنی بڑی شخصیت جب

---

① پارہ: ۳۰ سورۃ التکویر، الآیۃ: ۱۹. ② پارہ: ۳۰ سورۃ التکویر، الآیۃ: ۱۹. ③ پارہ: ۳۰ سورۃ التکویر، الآیۃ: ۲۱.

پیام پہنچائے گی تو اس میں کوئی دخل وفصل کا خطرہ نہیں ہوسکتا۔ کسی قسم کا کوئی اندیشہ نہیں ہوسکتا، اس کے بعد پھر فرمایا: ﴿ثَمَّ اَمِیْنٍ﴾ ① ان سارے اوصاف کے اوپر یہ ہے کہ وہ امانت دار ہیں اور اس کی شہادت کون دے رہا ہے؟ اللہ میاں شہادت دے رہے ہیں۔ یہ جبریل کو کون کہہ رہا ہے کہ وہ بزرگ بھی ہیں، مطاع بھی ہیں۔ صاحب قرآن کہہ رہے ہیں۔ تو حق تعالیٰ ان کی صفت فرما رہے ہیں۔

عظیم شہادت...... اگر کسی بڑے آدمی کی بڑائی کوئی چھوٹا آدمی بیان کرنے لگے تو وہ بڑائی نہیں سمجھی جاتی یوں کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی تعریف خود کرنا چاہتا ہے ؎

مادح خورشید مداح خود است

اگر سورج کی کوئی تعریف کرنے لگے تو یہ کہا جائے گا کہ اسے اپنی تعریف منظور ہے، سورج محتاج تعارف نہیں ہے۔ تو کسی بڑے آدمی کا تعارف اگر چھوٹا کرائے، وہ درحقیقت اپنا تعارف کرا رہا ہے۔ بڑا تو خود ہی متعارف ہے۔ لیکن اگر بڑا تعارف کرائے یہ فی الحقیقت ایک عظیم شہادت ہے۔ تو جبریل علیہ السلام کا مثلاً میں تعارف کرانے لگوں۔ تو یہ کہا جائے گا کہ میں اپنے تعارف اور اپنی عزت کا خواہاں ہوں کہ ایک بڑے آدمی کا نام لے رہا ہوں ایک بڑی شخصیت کا نام لے رہا ہوں۔ جبریل علیہ السلام کا تعارف وہ کرائے جو خود جبریل کا خالق ہے جو جبریل کا معبود ہے، وہ فرماتے ہیں کہ جبریل رسول بھی ہیں، کریم بھی ہیں۔ ذی قوت بھی ہیں، امانت دار بھی ہیں، مقرب بارگاہ بھی ہیں، عہدے دار بھی ہیں یعنی سید الملائکہ بھی ہیں۔ ان کو ہم نے قاصد اور پیغمبر بنا کر بھیجا۔ تو بھیجنے والے حق تعالیٰ جن کا علم لامحدود ہے۔ ان کے علم کی کوئی حد و نہایت نہیں۔ جن کو بھیجا گیا وہ صاحب امانت ہیں اور جن کے پاس بھیجا گیا وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جن کو نبوت کا عہدہ دیا گیا کہ عالم بشریت میں اس سے بڑا کوئی با کمال نہیں۔

عظمت سند...... اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فقط نبی ہی نہیں بلکہ خاتم النبیین ہیں۔ خاتم کے معنی یہ ہیں کہ جو نبوت کے درجات کا منتہی ہو۔ یعنی نبوت کے سارے مراتب ان کے اوپر آ کر ختم ہو جائیں۔ کوئی ایسا درجہ باقی نہ رہے کہ کسی اور شخصیت کی ضرورت پڑے کہ وہ اس درجے کو لے کر سامنے آئے۔ تو خاتم النبیین کا یہ مطلب ہے کہ نبوت کے کمالات کے جتنے درجات اور جتنے مراتب ہیں وہ اس ذات میں ہیں وہ اس ذات اقدس پر ختم ہو گئے۔

نبوت کی بنیاد دو ہی چیزوں کے اوپر ہے۔ ایک کمالات علمی اور ایک کمالات اخلاق، جن سے عمل کا سلسلہ چلتا ہے۔ تو علم کے بارے میں تو فرمایا گیا: ”اُوْتِیْتُ عِلْمَ الْاَوَّلِیْنَ وَالْاٰخِرِیْنَ“ ”اگلوں اور پچھلوں کے تمام علوم آپ کو عطاء کئے گئے“۔

اور اخلاق کے بارے میں فرمایا گیا ﴿وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ﴾ ② ”تو اخلاق بھی خلق عظیم“۔ اور

---

① پارہ: ۳۰ سورۃ التکویر، الآیۃ: ۲۱۔ ② پارہ: ۲۹ سورۃ القلم، الآیۃ: ۴۔

آپ کا علم اتنا جامع کہ اولین وآخرین کا تمام علم آپ کو دے دیا گیا۔

ظاہر بات ہے کہ جو ذات بابرکات علم میں بھی ساری مخلوق سے اکمل ہو، اخلاق میں بھی ساری مخلوق سے اکمل ہو۔ تو اس کی نبوت بھی انبیاء علیہم السلام میں سے سب سے زیادہ مکمل ہوگی۔ اس لئے آپ فقط نبی ہی نہیں بلکہ خاتم النبیین ہیں۔ یعنی آپ کی ذات بابرکات پر نبوت کے مراتب ختم کر دیے گئے۔

تو ایسی ذات کے اوپر قرآن نازل ہو جو کمالات بشریہ میں سب سے زیادہ اکمل ہو۔ اور ایسی ذات قرآن کو لے کر آئے جس کی حق تعالیٰ تعریف فرمائیں کہ ایک راوی میں جتنے اوصاف ہو سکتے ہیں وہ سب ان میں موجود ہوں اور قرآن کریم کو بھیجنے والی ذات حق تعالیٰ کی ہو جو سارے کمالات کا مصدر اور سرچشمہ ہے۔ تو اوپر سے لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک قرآن کریم کی سند اتنی مکمل ہے کہ اس میں کسی نقد و تبصرہ کی گنجائش نہیں۔

تواتر طبقہ...... اس کے بعد جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کو قرآن پڑھایا تو صحابہؓ نے طبقے کے طور پر اس کو لیا۔ یعنی اِکے دُکے نے حفظ نہیں کیا۔ بلکہ جماعتوں کی جماعتیں اور طبقات کے طبقات حافظ قرآن ہوئے۔ انہوں نے پھر بعد والے طبقات کو حافظ بنایا اور طبقہ در طبقہ حافظ بنتے چلے گئے۔ اسی طرح آج تک تواتر طبقہ کے ساتھ یہ قرآن کریم چلا آ رہا ہے کہ ایک ایک اور دو دو یا بیس بیس اور چالیس چالیس نہیں سو سو اور پچاس پچاس نہیں بلکہ ہزاروں ہزار حفاظ ہر قرن میں موجود رہے۔ اوپر کے قرن سے لیتے رہے اور نیچے کے قرن کو دیتے رہے۔ تو جو کلام خداوندی اس حفاظت کے ساتھ آئے اور قیامت تک چلتا رہے اس میں کسی دخل وفصل یا تحریف کی گنجائش نہیں۔ اگر کوئی تحریف کرنے والا تحریف کرے گا۔ چونکہ حفاظت کے سامان کافی ہیں اس لئے اس کی تحریف کھل جائے گی چنانچہ بہت سے محرفین پیدا ہوئے جنہوں نے معنی کے لحاظ سے بھی تحریف کرنا چاہی لیکن دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر دیا گیا۔

ہمہ گیر ابدی حفاظت ...... حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر صدی پر مجدد کا وعدہ کیا گیا ہے: ”اِنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ لِهٰذِهِ الْاُمَّةِ عَلٰى رَأْسِ كُلِّ مِائَةِ سَنَةٍ مَّنْ يُّجَدِّدُ لَهَا دِيْنَهَا“ ① ہر صدی کے اوپر اللہ مجدد بھیجے گا۔ مجدد کے لئے کوئی شخص واحد ہونا ضروری نہیں۔ جماعتیں بھی مجدد بن کر آئی ہیں افراد بھی مجدد بن کر آئے ہیں۔ دین کے جس گوشے میں لوگوں نے خلط واقع کیا اور تنقیص واقع کیا۔ انہوں نے آکر اسی کو کھول دیا۔

تو ہر صدی پر مجددوں کا وعدہ دیا ہے خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ”كَيْفَ تَهْلَكُ اُمَّةٌ اَنَا اَوَّلُهَا وَالْمَسِيْحُ آخِرُهَا وَالْمَهْدِيُّ وَسَطُهَا.“ ② وہ امت کیسے ہلاک ہو جائے گی جس کی ابتداء میں میں ہوں اور اخیر میں مسیح ہیں اور بیچ میں مہدی ہیں۔ تو اول وآخر کی بھی حفاظت بتلائی گئی ہر صدی کی حفاظت بتلائی گئی۔

---

① السنن لابی داؤد، کتاب الملاحم، باب مایذکر فی قرن المائة ج: ۱۱ ص: ۳۶۲.

② مشکاة المصابیح، کتاب المناقب، باب ثواب هذه الامة، ج: ۳، ص: ۱۷۴، رقم: ۶۲۷۸.

پھر ہر صدی کے اندر اندر وعدہ دیا گیا: ”یَحْمِلُ ھٰذَا الْعِلْمَ مِنْ کُلِّ خَلَفٍ عُدُوْلُہٗ یَنْفُوْنَ عَنْہُ تَحْرِیْفَ الْغَالِیْنَ وَانْتِحَالَ الْمُبْطِلِیْنَ وَتَاْوِیْلَ الْجَاھِلِیْنَ۔“ ① ہر قرن اور زمانے کے اندر اس علم کو اٹھاتے رہیں گے، اسلاف میں سے اخلاف رشید، نیک خلف، نیک سلف سے لیتے رہیں گے۔ اس علم کو امانت داری کے ساتھ سلف سے خلف قبول کرتے رہیں گے غلو کرنے والے کے غلو کو توڑ دیں گے۔ غلو کرنے والے جو تحریفیں کریں گے اور معانی کے اندر جو تحریف واقع کر دیں گے اس کو مٹائیں گے اور دروغ بافیوں اور جاہلانہ تاویلات کا پردہ چاک کرتے رہیں گے۔ بہر حال اس امت میں وعدہ دیا گیا کہ قیامت تک ایک طبقہ حقانی ضرور باقی رہے گا جو بعینہٖ قرآن کو مع اس کے لفظ و بیان اور مع اس کی شرح کے دیتا رہے گا تو سلف سے خلف تک پہنچتا رہے گا۔

جہاں یہ کہا گیا کہ امت میں فرقے ہوں گے اور اختلافات رونما ہوں گے وہاں یہ بھی وعدہ دے دیا گیا کہ قیامت تک ایک فرقہ ضرور حق کے اوپر رہے گا اور اپنے ذوق، وجدان اور دلائل سے لوگ سمجھتے رہیں گے کہ یہ فرقہ حقانی ہے۔ اس کے افعال و اعمال اور اس کی علامات بتلاتی رہیں گی کہ یہ حقانی ہے اور لوگ اس کی طرف رجوع کرتے رہیں گے۔ غرض ایک طبقہ ہمیشہ باقی رہے گا جو صحیح مزاج کے ساتھ دین کو باقی رکھے گا اور صحیح ذوق کے ساتھ اس کو قائم رکھے گا۔ ”لَا یَضُرُّھُمْ مَنْ خَذَلَھُمْ وَلَا مَنْ خَالَفَھُمْ حَتّٰی یَاْتِیَ اَمْرُ اللّٰہِ۔“ ② نہ ان کو رسوا کرنے والا رسوا کر سکے گا نہ ذلیل کرنے والا ذلیل کر سکے گا۔ وہ ایک ہی چیز کہتے رہیں گے کہ: ”مَا اَنَا عَلَیْہِ الْیَوْمَ وَاَصْحَابِیْ“ ③ جس کے اوپر آج کے دن میں (رسول صلی اللہ علیہ وسلم) اور میرے صحابہؓ ہیں۔

اسی کے مطابق لفظ اور معنی اور حقائق و کیفیات دنیا کے سامنے پیش کرتے رہیں گے۔ بہر حال یہ وعدہ دیا گیا اور جہاں اختلافات کی خبر دی گئی وہیں ساتھ اس فرقہ حقانی کی بھی خبر دی گئی۔ اس سے واضح ہوا کہ یہ دین خاتم النبیین کا دین ہے۔ قیامت تک باقی رہے گا کیونکہ درجات نبوت آپ کی ذات بابرکات پر ختم کر دیئے گئے۔ اب کوئی درجہ باقی نہیں رہا کہ کسی شخصیت کو لا کر اسے پورا کیا جائے۔

بہر حال قرآن کریم کی حفاظت خداوندی کے سلسلہ میں مجددین کے وعدے الگ ہیں۔ ائمہ ہدایت کے وعدے الگ ہیں، خلفاء کے وعدے الگ ہیں اور خلف عدول کے وعدے الگ ہیں، صلحاء کے وعدے الگ ہیں کہ یہ برابر بھیجے جاتے رہیں گے اور دین کی حقانیت قائم رہے گی۔ تو یہ ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ ④ میں بتلایا گیا کہ جہاں قرآن کریم کے الفاظ محفوظ کئے گئے اور جہاں اس کا رسم الخط محفوظ کیا گیا، وہیں اس کے

---

① السنن الکبریٰ للبیہقی ج: ۱۰ ص: ۲۰۹، مجمع الزوائد ج: ۱ ص: ۱۴۰۔ ② الصحیح للبخاری، کتاب المناقب، باب سوال المشرکین ان یریھم...... ج: ۱۱، ص: ۲۷۳، رقم: ۳۳۶۹۔ ③ السنن للامام الترمذی، ابواب الایمان، باب ماجاء فی افتراق ھذہ الامۃ، ج: ۹، ص: ۲۳۵، رقم: ۲۵۶۵۔ ④ پارہ: ۱۴ سورۃ الحجر، الآیۃ: ۹۔

علوم اور معانی بھی محفوظ کیے گئے، وہیں اس کے احکام بھی محفوظ کیے گئے۔ تو اول سے لے کر آخیر تک اور ظاہر سے لے کر باطن تک قرآن کریم کا ایک ایک پہلو محفوظ ہے اور محفوظ چلا جائے گا۔

بہر حال یہ بات میں نے اس پر عرض کی کہ یہ دار القرآن قائم کیا گیا، بہر حال یہ بھی ایک خلافت خداوندی ہے۔ یہ الفاظ اور لب و لہجے کی خلافت ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے چلی ہے۔ قراء اور مجودین نے اسی لب و لہجے کے حفاظت کی کوشش کی ہے۔ نوعیت ایک رہتی ہے گو شخصی طور پر کچھ نہ کچھ فرق واقع ہوتا ہے۔

تغنی بالقرآن...... اس واسطے قرآن کریم کے بارے میں فرمایا گیا کہ مَنْ لَّمْ یَتَغَنَّ بِالْقُرْاٰنِ فَلَیْسَ مِنَّا"
② ''جو قرآن کریم کے ساتھ تغنی نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے''۔

مگر تَغَنِّیْ کے معنی یہاں موسیقی کے نہیں ہیں۔ گانے بجانے کے طرز پر پڑھنے کے متعلق دھمکی دی گئی ہے۔ اگر کوئی قرآن کو مزامیر کی صورت سے پڑھے تو اسے عذاب کی دھمکی دی گئی ہے تو قرآن کا غنا الگ ہے، گانے بجانے کا غنا الگ ہے۔ قرآن کریم کی تغنی کی یہ تفسیر کی گئی ہے کہ اتنے درد آمیز لہجے کے ساتھ پڑھے کہ قرآن کی کیفیات ایک قلب سے دوسرے قلب میں پہنچنے لگیں۔ تو وہ ایک خاص درد، ایک خاص لب و لہجہ ہے، قراء اور مجودین وہی اختیار کرتے ہیں۔

چنانچہ جب قرآن پڑھا جاتا ہے تو واقعہ یہ ہے کہ دنیا کی سینکڑوں قسم کی موسیقیاں ہیں۔ ہر ملک کی موسیقی الگ ہے لیکن قرآن کا غنا وہ ہے کہ کسی موسیقی پر منطبق نہیں اور کسی موسیقی میں وہ تاثیر نہیں جو اس میں تاثیر ہے اگر صحیح معنی میں کوئی پڑھنے والا موجود ہو اس سے دل کھنچتے ہیں۔ تو فرمایا گیا "مَنْ لَّمْ یَتَغَنَّ بِالْقُرْاٰنِ فَلَیْسَ مِنَّا۔"

کہیں فرمایا گیا "زَیِّنُوا الْقُرْاٰنَ بِاَصْوَاتِکُمْ فَاِنَّ الصَّوْتَ الْحَسَنَ یَزِیْدُ الْقُرْاٰنَ حُسْنًا۔" ①
قرآن کریم کو خوش آوازی کے ساتھ پڑھو۔ اس سے قرآن کا حسن بڑھ جاتا ہے۔ تو خوش آوازی میں اوپر والوں کی تقلید کرنی پڑے گی کہ جس انداز کی خوش آوازی صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے چلی آ رہی ہے اور تابعین سے چلی آ رہی ہے اور سلسلہ بسلسلہ پہنچی ہے۔ اسی کے ساتھ تغنی کرو۔ اسی کے ساتھ حسن صورت اختیار کرو۔ تو قرآن کریم کی آواز اور لب و لہجہ اور طرز ادا تک محفوظ کیا گیا۔

تبریک...... اور وہ قراء و مجودین مبارکباد کے مستحق ہیں۔ جنہوں نے یہ خلافت خداوندی سنبھالی۔ تو ایک خلافت علمی ہے، ایک خلافت اخلاقی ہے، ایک خلافت عملی ہے اور یہ خلافت صوتی ہے کہ آواز کے لحاظ سے بھی دنیا میں اللہ کے خلیفہ موجود ہیں کہ اس کے کلام کو اسی کے انداز سے پڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس واسطے مبارک باد کے مستحق ہیں

---

① الصحیح للبخاری، کتاب التوحید، باب قوله تعالیٰ واسروا قولکم او اجهروا به، ج: ۲، ص: ۵۵، رقم: ۶۹۷۳.

② الحديث اخرجه الدارمي ولفظه: حسنوا القرآن..... كتاب فضائل القرآن، باب التغني بالقرآن، ج: ۱۰، ص: ۳۱۰، رقم: ۳۵۶۵.

اور دارالقرآن بھی مبارکباد کا مستحق ہے جس نے قراء اور مجودین بنانے کا ایک راستہ پیدا کیا۔ اس فن شریف کو پھیلانے کا ارادہ کیا۔ بہر حال یہ اس کی برکات میں سے ایک برکت ہے کہ آپ حضرات یہاں جمع ہیں اور قرآن سننے کے لئے جمع ہوئے۔ قراء اور مجودین کی محفل منعقد ہوئی۔ کلام خداوندی پڑھا گیا۔ تو حقیقت میں یہ کلام اللہ کا ہے۔

جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ بدر میں جب کفار کے اوپر کنکریاں پھینکی تھیں تو آپ کے بارے میں فرمایا گیا تھا ﴿وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى﴾ ② اے نبی! جب آپ کنکریاں پھینک رہے تھے وہ آپ نہیں پھینک رہے تھے۔ وہ تو ہم پھینک رہے تھے۔ یعنی اعضاء آپ کے تھے ہمارے کمالات کا ظہور ہو رہا تھا اور مظہر آپ بنے ہوئے تھے۔ تو زبانیں ہماری ہیں، کلام خدا کا ہے اور انسان مظہر بنا ہوا ہے۔ اس واسطے یہ ادارہ مستحق مبارکباد ہے جس نے قراء اور مجودین جمع بھی کئے اور آئندہ پیدا کرنے کا سلسلہ بھی ڈالا۔ حق تعالیٰ شانہٗ کامیاب فرمائے اور اس ادارے سے بہت سے مجودین پیدا ہوں اور قرآن کریم کے پڑھنے کی اور اس فن تجوید کی اشاعت ہو اور لوگوں کے دلوں میں یہ گھر کرے اور پھر لوگ مائل ہوں اور اس کے علم و عمل کی طرف متوجہ ہوں۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ. اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَعَافِنَا وَاعْفُ عَنَّا وَاهْدِنَا سُبُلَ السَّلَامِ وَاَخْرِجْنَا مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ وَجَنِّبْنَا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ اَللّٰهُمَّ وَتَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ وَاَلْحِقْنَا بِالصّٰلِحِيْنَ غَيْرَ خَزَايَا وَلَا مَفْتُوْنِيْنَ وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ. بِرَحْمَتِكَ يَآ اَرْحَمَ الرّٰحِمِيْنَ ①

---

① پارہ: ۹ سورۃ الانفال، الآیۃ: ۱۰۔ ② حزب: ۳۳، ربیع الاول، ۹ ۱۳۸ھ

نجوم ہدایت

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ. وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

اَمَّا بَعْدُ! فَقَدْ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَصْحَابِيْ كَالنُّجُوْمِ بِاَيِّهِمُ اقْتَدَيْتُمُ اهْتَدَيْتُمْ (اَوْ كَمَا قَالَ عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ) ①

مقام صحابیت...... آفتاب نبوت کی تاثیر وتربیت اور تعلیم وتمرین سے امت کے استفادہ اور منور ہونے کے متفاوت درجات ومراتب کھل جاتے ہیں جن کا معیار آفتاب سے قرب اور بعد ہے یعنی جو اس سے قریب تر ہے وہ اتنا ہی نورانی تر اور متاثر تر ہے اور جتنا آفتاب سے دور ہے اتنا ہی اس کے فیض سے کم مستفید ہے۔

مثلاً طلوع آفتاب کے بعد جو چیز سب سے زیادہ اور سب سے پہلے آفتاب کے آثار سے متاثر ہوتی ہے وہ فضا ہے۔ وہ چونکہ خلقۃً اپنی ذات سے شفاف ہے اور ادھر آفتاب کے سامنے بلاواسطہ حاضر ہے۔ اس لئے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ وہ اس کے نور وحرارت کا اثر لیتی ہے۔ وہ اس درجہ منور ہوتی ہے کہ باوجود اس کے چمک اٹھنے کے خود اس کی چمک آنکھوں کو نظر نہیں آتی بلکہ آفتاب ہی کی دھوپ اور شعاعیں نظر پڑتی ہیں۔ اگر فضا میں نگاہ اٹھائی جائے تو فضا کا جو حصہ بھی سامنے آئے گا اس میں آفتاب ہی دکھائی دے گا۔ خود فضا کی ہستی نظر نہ پڑے گی۔ گویا وہ اس کے نور میں اس درجہ مستغرق اور فنا ہو جاتی ہے کہ اس کا اپنا نور کسی کی آنکھ میں نہیں آتا بلکہ آفتاب اس میں سے ایسا دکھائی دیتا ہے کہ گویا بلاواسطہ دکھائی دے رہا ہے۔ حالانکہ فضا اپنی بے حد وسعت کے ساتھ بیچ میں حائل ہے۔

ٹھیک یہی صورت روحانی آفتاب سے استفادہ کی بھی ہے کہ اس کے عالمگیر آثار سے متاثر تو سب ہوتے ہیں مگر سب سے زیادہ متاثرہ وہ طبقہ ہوتا ہے جو بلاواسطہ اس سے قریب ہو کر نور لیتا ہے اور وہ طبقہ صحابہ کرام ؓ کا طبقہ ہے جو فضا کی مانند ہے کہ زمین سے بالاتر ہے اور فلک شمس یعنی آسمان نبوت سے فروتر ہے وہ فضا کی طرح خلقی طور

---

① الابانة الكبرى للامام ابن بطة، باب التحذير من استماع كلام قوم يريدون نقض الاسلام، ج: ۲، ص: ۲۲۰ رقم: ۷۰۹۔

پر خود شفاف ہے جو محض اس کے نور ہی کو دکھا دینے کی نہیں بلکہ عین آفتاب کو دکھلانے کی کامل استعداد رکھتا ہے۔ جیسا کہ احادیث میں آپ نے فرمایا کہ: سارے نبیوں کے صحابہ میں میرے صحابہ منتخب کر لئے گئے۔ یا جیسے عبد اللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ان کے دل شفاف تھے، ان کا علم گہرا تھا، ان میں تکلفات نہ تھے، انہیں اقامت دین کے لئے پوری امت میں سے چن لیا تھا۔ ان کا نقش قدم واجب الاتباع ہے وغیرہ۔ جس سے حضرات صحابہ کرامؓ کی کمال قابلیت کھلتی ہے جو انہیں انوار نبوت کو جذب کرنے کیلئے عطاء ہوئی تھی۔ پس وہ فطری شفافی اور کمال قرب کے لحاظ سے بمنزلہ فضا کے ہوئے جو شفاف ہے اور ساری دنیا کی نسبت سے آفتاب سے قریب تر بھی ہے کہ بلا واسطہ نور آفتاب جذب کرتی ہے۔ پس انہوں نے ان شفاف سینوں سے اس درجہ آفتاب نبوت کا نور و اثر قبول کیا کہ فضا کی طرح سر تا پا نور بن گئے اور جیسا کہ فضا آفتاب سے متصل اور ملحق ہو کر اس درجہ منور ہو جاتی ہے کہ وہ خود نظر نہیں آتی۔ یعنی وہ خود اپنے کو نہیں دکھلاتی بلکہ صرف آفتاب اور اس کی شعاعوں اور چمک دمک ہی کو نمایاں کرتی ہے۔ ایسے ہی صحابہؓ کرام اپنی فطری قابلیتوں کی بناء پر اس درجہ پاک قلوب، عمیق العلم، قلیل التکلف اور بے غل وغش بنا دیئے گئے تھے گویا ان میں خود ان کی کوئی ذاتی خصوصیت باقی نہیں رہی تھی۔ وہ صرف سنن نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مجسم نمونے بن گئے تھے۔

سنن صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم...... اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے عقیدہ وعمل کو اپنے عقیدہ وعمل کے ساتھ ختم کر کے انہیں معیار حق قرار دیا اور اعلان فرمایا کہ سنن نبوت اور سنن صحابہ ایک ہی ہیں جس سے نمایاں ہو جاتا ہے کہ صحابہ اکرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی دینی خصوصیات، خصوصیات نبوی تھیں۔ چنانچہ امت کے بہتر (۷۲) فرقوں کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سوال کیا گیا کہ ان بہتر (۷۲) میں وہ ناجی فرقہ کونسا ہے؟ تو فرمایا: "مَا اَنَا عَلَیْہِ وَ اَصْحَابِیْ" ① "جس پر آج کے دن میں اور میرے صحابہؓ ہیں"

گویا اپنے عقیدہ وعمل کے ساتھ انکے عقیدہ وعمل کو اس طرح ملا کر بتلایا کہ ان کے عقیدہ وعمل اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عقیدہ وعمل کی نوعیت ایک ثابت ہوگئی اور فرقوں کے حق و باطل ہونے کا معیار آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنی بابرکات اور حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کو ٹھہرایا۔

سب وشتم کا انجام...... پھر جیسے فضا تک کوئی گندگی نہیں پہنچتی اور پہنچائی بھی جائے تو وہ لوٹ کر پہنچانے والے ہی پر گرتی ہے۔ فضا اس سے گندی نہیں ہوتی۔ ایسے ہی حضرات صحابہ کرامؓ کا طبقہ روحانی فضا کی مانند ہے۔ امت کی تنقیدوں سے بالاتر ہے۔ اگر ان کی شان میں کوئی طبقہ سب وشتم یا گستاخی یا سوءِ ادب یا جسارت و بے باکی یا ان پر اپنی تنقیدی تحقیر کی گندگی اچھالے گا تو اس کی یہ ناپاکی اسی کی طرف لوٹ آئے گی۔ اس فضاء شفاف پر اس کا کوئی اثر نہ ہوگا۔ بہر حال حضرات صحابہؓ فضاء قریب کی مانند ہیں کہ انہیں شفافی میں بھی آفتاب سے مناسبت ہے وہ

---

① السنن للترمذی، ابواب المناقب، باب ماجاء في افتراق هذه الامة، ج: ۹، ص: ۲۳۵، رقم: ۲۵۶۵.

آفتاب نبوت سے نزدیک تر بھی ہیں۔ بلاواسطہ اس سے ملحق بھی ہیں۔ وہ زمین کی کدورتوں سے بالاتر بھی ہیں اور وہ آفتاب کے نور میں فانی بھی ہیں کہ اس نور کی نمائش گاہ بن کر رہ گئے ہیں جن میں اپنی خصوصیت بجز انفعال اور قبول حق کے دوسری نہیں رہ گئی تھی۔

جامع اضداد زندگی...... پس صحابہ کرامؓ کی اس اعلیٰ ترین زندگی کا نور تیز بھی ہے اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے اقرب تر اور اشبہ تر بھی ہے کہ اس نے نبوت کی زندگی سے متصل رہ کر اس کی شعاعوں کا نور قبول کیا ہے اس لئے یہ زندگی نہ صرف عزیمتوں کی زندگی اور اولعزمانہ زندگی ہے کہ جائزات کی آڑ لئے بغیر عمل کے اعلیٰ ترین حصہ ہی کو اپنالیا جائے اور نفس کی راحت طلبیوں کو خیر باد کہہ کر عملی مجاہدہ وریاضت ہی کو زندگی بنالیا جائے بلکہ یہ زندگی جامع اضداد بھی ہے جو کمال اعتدال لئے ہوئے ہے کہ ایک طرف نفس کشی بھی انتہائی اور ساتھ ہی ادب شریعت اور اتباع سنن نبوی بھی انتہائی اور ایک طرف طبعی جذبات بھی قائم اور دوسری طرف عقلی دواعی اور ملکیت بھی غالب اس کمال اعتدال وجامعیت کے ساتھ یہ زندگی صحابہ کرامؓ کے سوا امت کے کسی طبقہ کو طبقاتی حیثیت سے نصیب نہیں۔ آحاد و افراد اس زندگی کے حامل نظر پڑیں گے۔ جس میں شرف صحابیت کے سوا سب کچھ ہوگا، لیکن طبقہ کا طبقہ ایک ہی رنگ میں رنگا ہوا ہو اور ہمہ وقت اخلاص و معرفت کی حد کمال کو طے کئے ہوئے ہو۔ طبقہ صحابہؓ کے سوا دوسرا نہیں۔

جنہوں نے گھر بار چھوڑ کر اور نفس کی خواہشات سے منہ موڑ کر صرف اور صرف رضائے حق کو اپنی زندگی بنایا۔ مرغوبات کو شرعی مطلوبات پر قربان کر دیا۔ موطن طبیعت سے ہجرت کر کے موطن شریعت میں آ کر بس گئے اور شرعی مرادوں کی خاطر نفس کی حیلہ جوئیوں اور راحت طلبیوں سے کنارہ کش ہو کر عزم صادق کے ساتھ ہمہ تن مرضیات الٰہی اور سنن نبویؐ کی پیروی میں مستغرق ہو گئے اور اسی کو اپنی زندگی بنالیا۔ اس جامع اور جامع اضداد زندگی کا سب سے زیادہ نمایاں اور حیرت ناک پہلو یہ ہے کہ وہ کلیۃً تارک دنیا بھی تھے اور رہبانیت سے الگ بھی، دنیا اور دنیا کے جاہ و جلال، دھن و دولت، حکومت و سیاست، گھر بار، زمین، جائیداد کے ہجوم میں بھی تھے اور پھر ادائے حقوق میں بے لاگ بھی یہ زن، زر، زمین ان کے تصرف میں بھی تھی اور پھر قلباً ان سب چیزوں سے بے تعلق اور کنارہ کش بھی درویش کامل بھی ہیں اور قبا شاہی بھی زیب تن ہے۔ حکمران بھی ہیں اور دلق گدائی بھی کندھوں پر ہے۔ ممالک بھی فتح کر رہے ہیں اور فقیری کی خو بھی بدستور قائم ہے۔

یوں بہم کس نے کئے ساغر و سندال دونوں

کامل انسانیت کا طبقہ...... انبیاء علیہم السلام کی یہی زندگی ہے کہ بشر بھی ہیں اور ملک بھی۔ نہ طبائع کو ترک کرتے ہیں اور نہ عقل و فراست کے تقاضوں سے ایک انچ ادھر ادھر ہوتے ہیں۔ خالص طبعی جذبات کی پیروی حیوان کا کام ہے اور طبعیات سے کلیہ باہر رہ کر محض عقل کلی کی پیروی فرشتوں کا کام ہے، لیکن طبعیات کو بحالہ قائم رکھ کر انہیں عقلی شعور کے ساتھ عقل کی ماتحتی میں انجام دینا اور حدود سے تجاوز نہ کرنا یہ انسان کا کام ہے۔ مگر انسان

کامل فرما کر اس کے تقدس و برگزیدگی کو نمایاں کیا گیا۔ اس لئے جس طبقہ کے افعال اقوی، عقائد، احوال، اقوال سب میں یہ کامل اعتدال رچا ہوا ہو۔ وہی طبقہ کامل انسانیت کا طبقہ کہلائے گا۔ سو طبقاتی حیثیت سے یہ کمال بالذات تو انبیاء علیہم السلام میں ہوتا ہے اور بالغرض بحیثیت طبقہ ان کے صحابہ ؓ میں ان کے بعد طبقاتی حیثیت ختم ہو جاتی ہے۔ صرف انفرادی حیثیت باقی رہ جاتی ہے اور وہ بھی اس مقام کی نہیں جس پر یہ طبقہ فائز ہوتا ہے۔

ظلِ نبوت...... پس صحابہ کرام ؓ درحقیقت نبوت کا ظلِ کامل تھے جن کے طبقہ سے نبوت اور کمالاتِ نبوت پہچانے جاتے ہیں۔ اس لئے اگر کسی طبقہ کے طبقہ کو بحیثیت طبقہ اللہ و رسول ؐ کے یہاں مرضی و پسندیدہ قرار دیا گیا ہے تو وہ صرف صحابہ کرام ؓ کا طبقہ ہے جس کی شہادت قرآن اور حدیث نے دی اور ﴿رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ﴾ ① اللہ ان سے راضی اور وہ اللہ سے راضی یہ دستاویزِ رضا ان کے لئے آسمانی کتاب میں تا قیامِ قیامت ثبت کر دی گئی۔ کہیں ﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى ۭ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ﴾ ② ”یہ وہ لوگ ہیں جن کے قلوب کو اللہ نے تقوے کے لئے خالص کر دیا ہے ان لوگوں کے لئے مغفرت و اجر عظیم ہے۔ کے ذریعے ان کے قلوب کی پاکیزگی کی شہادت دی گئی۔

اور کہیں ﴿اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ ۝ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَنِعْمَةً﴾ ③ اور کہیں ﴿وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّاۗءُ عَلَي الْكُفَّارِ رُحَمَاۗءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا﴾ ④ فرما کر ان کے اخلاق کی برتری ثابت کی گئی اور کہیں۔ ”اَصْحَابِيْ كَالنُّجُوْمِ بِاَيِّهِمُ اقْتَدَيْتُمْ اِهْتَدَيْتُمْ“ فرما کر ان کے ہر ہر فرد کو پوری امت کا مقتدا بتلایا گیا جس کی پیروی اور پیروی سے حصولِ ہدایت میں کوئی ادنیٰ کھٹکا نہ ہو۔

مکمل میزان اور متوازن ترازو...... کچھ عرصہ ہوا بعض منتسبین دار العلوم کا ایک خط در بارہ طلب سرٹیفکیٹ احقر کے نام دفتر دار العلوم میں موصول ہوا۔ جس میں ضمناً مودودی مکتبِ فکر اور خود اپنے مودودی ہونے کی نوعیت کے بارے میں اظہارِ خیال کیا گیا تھا۔ یہ اصلاح طلب نوعیت دیکھ کر حضرت شیخ مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے بنظرِ اصلاح انہیں ایک شفقت نامہ تحریر فرمایا جس میں مودودی مکتبِ خیال کی بعض بنیادی دفعات پر کلام فرماتے ہوئے ان کے اصلاحِ خیال کی توجہ فرمائی ہے۔ حضرت شیخ مدنی کا یہ ارشاد نامہ سلسلہ عقائد و افکار کے لئے ایک مکمل میزان اور متوازن ترازو کی حیثیت رکھتا ہے جس سے موجودہ زمانے کے حدود سے گزرے ہوئے افکار و خیالات کو عموماً اور مودودی نقطۂ نظر کے مزعومات و معتقدات کو خصوصاً تول کر ان کے حق و باطل کا فیصلہ بآسانی کیا جا سکتا ہے کیونکہ حضرت ممدوح ؒ کے اس والا نامہ کا موضوع مودودی لٹریچر کا کوئی فروعی یا جزوی مسئلہ نہیں ہے جسے مودودی صاحب کی شخصی رائے یا ان کے اجتہاد و قیاس کا ثمرہ کہہ کر جماعت کے سر سے بوجھ ہلکا کر لیا جائے۔ جیسا کہ اس قسم

---

① پارہ: ٣٠ سورۃ البینۃ، الآیۃ: ٨۔ ② پارہ: ٢٦ سورۃ الحجرات، الآیۃ: ٣۔

③ پارہ: ٢٦ سورۃ الحجرات، الآیۃ: ٧-٨۔ ④ پارہ: ٢٦ سورۃ الفتح، الآیۃ: ٢٩۔

کے موقع پر عموماً ایسا ہی کیا جاتا ہے بلکہ ایک اصولی مسئلہ ہے اور وہ بھی دستور جماعت کا بنیادی اصول موضوعہ جو جماعت اور امیر سب کے لئے یکساں حجت اور معیار عمل کی حیثیت رکھتا ہے۔ پس اگر پوری جماعت دستور کو جو بنام دستور اسلامی شائع شدہ ہے، تسلیم کرتی ہے۔ (اور ضرور تسلیم کرتی ہے جب کہ جماعت کا وجود اور اس کی تشکیل ہی اس دستور سے ہوئی ہے) تو بلاشبہ دستور کی یہ دفعہ:

”رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی انسان کو معیار حق نہ بنائے کسی کو تنقید سے بالاتر نہ سمجھے، کسی کی ”ذہنی غلامی“ میں مبتلا نہ ہو“۔

ساری جماعت کا ایک مسلمہ عقیدہ اور بنیادی اصول ثابت ہوئی۔ اس لئے حضرت شیخؒ کے مکتوب گرامی میں اس بنیادی عقیدہ کا تجزیہ کر کے اس پر جو شرعی گرفتیں کی گئی ہیں وہ یقیناً پوری جماعت کے ایک ایک فرد پر حجت ہیں اور اس لئے بحیثیت مجموعی جماعت کو گروہی تعصب سے بالاتر ہو کر ان پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ عقائد کا معاملہ دنیوی نہیں اخروی ہے جو زیادہ توجہ کا محتاج ہے۔

دفعہ مذکورہ پر حضرت شیخؒ نے کتاب و سنت سے روشنی ڈالی ہے۔ اس کے سامنے آنے سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ اس دفعہ کے آنے سے پہلے تنقیح کر دوں تا کہ ان حقائق کا جو اس مکتوب کا موضوع ہے سمجھنا آسان ہو جائے۔ اس دفعہ میں مودودی صاحب نے غیر رسول کو معیار حق بنانے اور تنقید سے بالاتر سمجھنے سے روکا ہے۔ مگر یہ ممانعت جب ہی درست ہو سکتی ہے کہ شرعاً کوئی غیر رسول معیار حق و باطل نہ بن سکے اور تنقید سے بالاتر نہ ہو۔ اگر شرعی طور پر کوئی معیار ہو اور بن سکتا ہو تو اسے معیار حق مان لینا اور تنقید سے بالاتر سمجھنا جرم نہیں ہو سکتا۔ کوئی تنقید سے بالاتر نہیں ہو سکتا۔ پھر بھی اگر کسی نے از خود کسی کو معیار حق بنا لیا اور تنقید سے بالاتر سمجھا تو وہ شرعی مجرم اور ایک شرعی گناہ کا مرتکب ہوگا۔ اس لئے ہمارا کلام مودودی صاحب (علیہ ما علیہ) کے اس نظریہ پر ہوگا کہ غیر رسول معیار حق نہیں بن سکتا اور تنقید سے بالاتر نہیں ہو سکتا۔ اگر اس دفعہ نمبر ۶ کو اس کے ہمہ گیر عموم کے ساتھ اس کے عام الفاظ میں تھوڑی دیر کے لئے تسلیم کر لیا جائے کہ۔

”رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی بھی معیار حق نہیں، کوئی بھی تنقید سے بالاتر نہیں، اور کوئی بھی اس کا مستحق نہیں کہ اس کی ذہنی غلامی کی جائے“۔

تو سوال یہ ہے کہ خود رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم ہی کسی کو معیار حق بنا دیں یا اس کے معیار حق ہونے کی شہادت دیں یا معیار حق ہونے کا ضابطہ بتا دیں کہ اس کی رو سے معیار حق ہونے کی تعیین کر لی جائے تو کیا وہ پھر بھی معیار حق نہ بن سکے گا؟ اگر بن سکے گا تو یہ اصول غلط نکلا کہ ”رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم“ کے سوا کوئی بھی معیار حق نہیں ہو سکتا۔ اگر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے باوجود بھی ان کے سوا کوئی معیار حق نہ ہوا تو خود رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا معیار حق ہونا معاذ اللہ باطل ٹھہر جاتا ہے جب کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا قول خلاف ہو گیا۔

(العیاذ باللہ) دونوں صورتوں میں دستور جماعت کی دفعہ نمبر ۶ باطل ہو جاتی ہے۔ ایک صورت میں اس کا منفی پہلو باطل ٹھہرتا ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی معیار حق نہیں اور دوسری صورت میں اس کا مثبت پہلو باطل ہو جاتا ہے کہ صرف رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم ہی معیار حق ہیں۔ اس ضابطہ سے نکلنے کی آسان صورت اس کے سوا دوسری نہیں کہ ہم رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی کو بھی ارشاد رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق معیار حق اور ناقابل تنقید تسلیم کرلیں۔ کیونکہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم بذاتہ معیار حق ہیں اور غیر رسول بارشاد رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم معیار حق ہیں۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کا معیار حق ہونا منصوص ہے..... سوال رہ جاتا ہے تو صرف یہ کہ آیا رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو معیار حق بنایا بھی ہے یا نہیں؟ اور آیا کسی کو تنقید سے بالاتر اور مستحق ذہنی غلامی فرمایا بھی ہے یا نہیں؟

سو اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جن کا نام لے کر معیار حق و باطل قرار دیا' ان پر جرح و تنقید سے روکا اور ذہنوں کو ان کی غلامی کے لئے مستعد فرمایا وہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی مقدس جماعت ہے۔ ان کے معیار حق بتلانے ہی کے لئے آپ نے نہایت صاف و صریح اور غیر مبہم ہدایت جاری فرمائی۔ یعنی صحابہ رضی اللہ عنہم کا معیار حق ہونا قیاسی یا استنباطی نہیں بلکہ منصوص ہے۔ جس کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ایک مستقل حدیث ارشاد فرمائی:

عَنْ عَبْدِاللہِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْهُمَا قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: تَفْتَرِقُ اُمَّتِیْ عَلٰی ثَلٰثٍ وَّسَبْعِیْنَ مِلَّۃً کُلُّهُمْ فِی النَّارِ اِلَّا وَاحِدَۃً قِیْلَ مَنْ هُمْ یَارَسُوْلَ اللہِ؟ قَالَ: مَا اَنَا عَلَیْہِ وَاَصْحَابِیْ. ① ''حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص ؓ سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت تہتر (۷۳) ملتوں پر تقسیم ہو جائے گی سوائے ایک کے سب جہنم میں ڈالے جائیں گے۔ پوچھا گیا کہ وہ (مستثنیٰ) کون ہیں یا رسول اللہ! تو فرمایا کہ جو لوگ میرے اور میرے اصحاب کے طریق پر ہیں''۔

فرق اسلامیہ کے حق و باطل ہونے کا معیار..... اب اس حدیث میں فرق اسلامیہ کی نجات و ہلاکت اور بالفاظ دیگر ان کے حق و باطل ہونے کا معیار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلایا ہے کہ وہ میرا اور میرے صحابہ کا طریقہ ہے۔ لیکن اس طریقہ کو شخصیتوں سے الگ کر کے تنہا معیار نہیں بتلایا۔ بلکہ اپنی ذات بابرکات اور اپنے صحابہ ؓ کی ذوات قدسیہ کی طرف منسوب کر کے معیار بتلایا کہ وہ ان شخصیتوں کے ضمن میں پایا جائے۔ ورنہ بیان معیار میں اس نسبت اور نامزدگی کی ضرورت نہ تھی بلکہ مَنْ هُمْ کے جواب میں مَا اَنَا عَلَیْہِ کی سیدھی تعبیر یہ تھی کہ مَا جِئْتُ بِہٖ فرما دیا جاتا۔ یعنی معیار حق وہی ہے جسے میں لے کر آیا ہوں۔ یعنی شریعت' لیکن شریعت کو شخصیتوں سے الگ کر کے ذکر کرنے کی بجائے شخصیتوں کے انتساب سے ذکر فرمانے کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے

---

① السنن للترمذی، ابواب المناقب، باب ماجاء فی افتراق ہذہ الامۃ، ج: ۹ ص: ۲۳۵۔

کہ محض کاغذ کے کالے نقوش معیار نہیں بلکہ وہ ذوات معیارِ حق ہیں جن میں یہ نقوش و حروف اعمال و احوال بن کر رچ گئے ہیں اور اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ اب کوئی بھی ان کی ذوات کو دین سے الگ کر کے اور دین کو ان کی ذوات سے علیحدہ کر کے نہیں دیکھ سکتا۔

جس کا حاصل یہ نکلا کہ محض لٹریچر معیارِ حق نہیں بلکہ وہ ذوات معیارِ حق ہیں جو اس لٹریچر کی حقیقی ظرف بن چکی ہیں: ﴿بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ؕ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَاۤ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ﴾ ① ”بلکہ یہ تو قرآن کی آیتیں ہیں صاف ان لوگوں کے سینوں میں جن کو ملی ہے سمجھ اور منکر نہیں ہماری باتوں سے مگر وہی جو بے انصاف ہیں“۔

پھر اس طریقہ کو شخصیت کی طرف منسوب کرنے کے سلسلہ میں بظاہر (مَا) کے بعد (اَنَا) کافی تھا اور یہ فرما دینا بس کرتا تھا کہ نجات و ہلاکت کے پہچاننے کا طریقہ میری ذات ہے تاکہ معیارِ حق صرف رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہوتی، لیکن آپ نے اپنے ساتھ اپنے صحابہ کو بھی شامل فرمایا جس سے واضح طور پر ثابت ہو جاتا ہے کہ فرقوں اور مختلف مکاتبِ خیال کے حق و باطل کے پرکھنے کا معیار جیسے رسول کی ذات ہے ویسے ہی صحابۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ذوات بھی ہیں اور اس لئے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی یا عدمِ موجودگی میں کسی فرقہ اور کسی مکتبِ خیال کے افراد کو پرکھنے کے لئے یہ دیکھ لینا کافی ہے کہ وہ صحابۂ کرامؓ کی راہ پر چل رہے ہیں یا مخالف سمت میں ہیں، ان کی اطاعت کر رہے ہیں یا ان سے گریزپا ہیں، ان کے ساتھ حسنِ ظن کا برتاؤ کر رہے ہیں یا سوءِ ظن اور بے اعتمادی کا! کہ یہی شان کسی کے معیار ہونے کی ہوتی ہے۔ جس سے صاف طور پر رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صحابۂ رسول کا معیارِ حق ہونا واضح ہو جاتا ہے اور یہ حدیث اس بارے میں نصِ صریح ثابت ہوتی ہے جس کا مقصد ہی یہ مدعا ثابت کرتا ہے۔

اطاعتِ صحابہ رضی اللہ عنہم اطاعتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے...... اس کی وجہ یہ ہے جو خود اس حدیث ہی سے نمایاں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں اپنے طریق کو بعینہٖ اپنے صحابہ کا طریق بتایا ہے۔ جس کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ ان کی راہ چلنا میری راہ چلنا ہے اور ان کی پیروی میری پیروی ہے۔ یہ ایسا ہی جیسے حق تعالیٰ شانہ اپنے رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ: ﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ﴾ ② ”جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی“۔

اس سے ایک کی اطاعت کو بعینہٖ دوسرے کی اطاعت بتلانا مقصود ہے جس کے صاف معنی یہی ہوتے ہیں کہ خدا اور اس کے رسول کا طریق الگ الگ نہیں۔ جو اللہ کا راستہ ہے وہی رسول کا راستہ ہے۔ پس اللہ کی اطاعت معلوم کرنے کا معیار یہ ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت دیکھ لی جائے۔ اگر وہ ہے تو بلاشبہ خدا

---

① پارہ: ۲۱ سورۃ العنکبوت، الآیۃ: ۴۹۔ ② پارہ: ۵ سورۃ النساء، الآیۃ: ۸۰۔

کی اطاعت بھی ہے ورنہ نہیں۔

وہی صورت یہاں بھی ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی پیروی و اطاعت کو بعینہ اپنی پیروی و طاعت قرار دیا ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ اگر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت دیکھنی ہو تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اطاعت دیکھ لی جائے۔ اگر صحابہ کرامؓ کی متابعت کی جاری ہے تو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت قائم ہے ورنہ نہیں۔ اس کا حاصل وہی نکلتا ہے کہ رسول اور صحابہ رسول کے طریقے الگ الگ نہیں بلکہ جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ ہے وہی بعینہ صحابہؓ رسول کا طریقہ ہے۔ اس لئے جیسے رسول فرقوں کے حق و باطل کا معیار ہیں۔ ایسے ہی صحابہؓ رسول بھی معیارِ حق و باطل ہیں۔ جن کو سامنے رکھ کر سب کے حق و باطل کو بآسانی پرکھا سکتا ہے۔ بہر حال اس حدیث سے حضرات صحابہؓ کی صرف منقبت اور فضیلت ہی ثابت نہیں ہوتی۔ نیز ان کی معیاریت اور مقبولیت ہی ثابت نہیں بلکہ امت کے حق و باطل کے لئے ان کی معیاری شان بھی ثابت ہوتی ہے کہ وہ خود ہی حق پر نہیں ہیں بلکہ حق و باطل کے لئے امت کی کسوٹی بھی بن چکے ہیں۔ جن سے دوسروں کا حق و باطل بھی کھل جاتا ہے پھر یہ بھی کہ ان میں یہ معیار ہونے کی شان محض ان کی غیر معمولی فضیلت سے بطور رائے وقیاس نہیں مان لی گئی بلکہ اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذات کے دوش بدوش ان کے معیارِ حق و باطل ہونے کی شہادت دی ہے۔ اس لئے ان کا معیارِ حق و باطل ہونا قیاسی نہیں بلکہ منصوص ثابت ہوا۔

معیار قابلِ تنقید نہیں ہوتا...... اور جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صحابہؓ رسول پوری امت کے حق و باطل کے پرکھنے کا معیار ثابت ہوں تو کیا امت کو یہ حق پہنچے گا کہ وہ ان پر تنقید کرے اور گرفتیں کر کر کے ان کی خطائیں پکڑنے لگے؟ یا یہ حق خود ان کا ہوگا کہ امت کے خطاء و ثواب کا فیصلہ کریں؟ کون نہیں جانتا کہ تنقید کا حق معیار کو ہوتا ہے جو پرکھنے والا ہے نہ کہ محتاج معیار کو جو پرکھوانے والا ہے، آخر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جو اپنے خطاء و ثواب کو کسی معیار پر جو جانچنے اور اپنا فیصلہ کرانے چلے ہوں اور وہ چلتے چلتے راستہ میں خود ہی معیار بن جائیں اور اپنے اوپر حکم لگوانے کی بجائے معیار پر ہی حکم لگانے کھڑے ہو جائیں؟ اس سے واضح ہے کہ جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم معیارِ حق و باطل کی وجہ سے تنقید سے بالاتر ہیں۔ ایسے ہی آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم بھی، جب کہ آپؐ نے ان کو بھی حکم میں ساتھ ملا کر معیارِ حق و باطل قرار دیا ہے، تنقید سے بالاتر ہیں۔ ورنہ کسی کو معیارِ حق مان کر اس پر نکتہ چینی کرنا یعنی خلافِ حق ہونے کا اس کی طرف ابہام کرنا یا اسے خلافِ حق ہونے کا طعنہ دینا اسے معیار مان کر بھی معیار نہ ماننا ہے جو صریح اجتماعِ ضدین ہے اس لئے حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین اگر امت کے فرقوں کے حق و باطل کے فیصلے کا معیار ہیں اور حسب بالا ضرور ہیں تو وہ یقیناً ان فرقوں کی تنقید سے بالاتر بھی ضرور ہیں ورنہ ان میں معیار ہونے کی شان قائم نہیں رہے گی، جس کا قائم رہنا بنصِ حدیث ضروری ہے۔

حق دستیاب بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سے ہوگا...... صحابہ کرام کا معیارِ حق اور بالاتر از تنقید

ثابت ہو جانے کے بعد یہ نکتہ بھی پیشِ نظر رکھنا چاہئے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے معیارِ حق و باطل کی کسوٹی ہونے کے یہ معنی ہو ہی نہیں سکتے کہ جیسے کسوٹی کا پتھر سونے کے کھرے اور کھوٹے ہونے کو تو نمایاں کر دیتا ہے۔ مگر خود نہ کھرا ہوتا ہے نہ کھوٹا۔ ایسے ہی حضرات صحابہ بھی بایں معنی معیارِ حق ہوں کہ دوسروں کا حق و باطل تو ان سے کھل جائے مگر وہ خود معاذ اللہ نہ حق ہوں نہ باطل۔ کیونکہ انہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ساتھ ملا کر امت کے لئے معیارِ حق بتلایا ہے اور ظاہر ہے کہ خود اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے معیارِ حق ہونے کے معنی یہ ہیں کہ وہ حق و صداقت کا مجسم نمونہ اور سرتاپا صدق و امانت ہیں۔ جن میں باطل کی آمیزش کا شائبہ بھی ممکن نہیں۔ اس لئے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت کے معیارِ حق ہونے کے معنی بھی یہی ہوں گے کہ وہ بھی خالص حق کے پیکر ہوں اور حق و صداقت کا مجسم نمونہ ہوں جس میں باطل کا گذر نہ ہو۔

اس صورت میں ظاہر ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے معیارِ حق ہونے کی شان یہ نکلتی ہے کہ ان کو سامنے رکھ لینے پر حق و باطل میں امتیازِ کامل بھی پیدا ہو جائے اور حق دستیاب بھی ہو جائے۔ کیونکہ جب وہ کامل نمونۂ حق ٹھہرے اور وہی اس امت کے اولین نمونۂ حق بھی ہوئے تو حق پہچانا بھی انہی سے جائے گا اور دستیاب بھی انہی سے ہوگا۔ بشرطیکہ اس کی پیروی کی جائے۔ اندریں صورت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے معیارِ حق ہونے اور امت کے مختلف الخیال فرقوں کی کسوٹی ہونے کے یہ معنی نکل آئے کہ جو فرقہ ان کی اطاعت کا التزام کرے گا وہی حق پر ہوگا اور اس کسوٹی پر پورا اترے گا اور جو ان سے منحرف ہو کر خلاف راہ چلے گا وہی باطل پر ہوگا۔

اور ظاہر ہے التزامِ اطاعت کا کم سے کم درجہ یہ ہے کہ ان پر جرح و تنقید کرنے کی بجائے ان کی تصویب کی جائے۔ ان کی خطائیں پکڑنے اور ان پر گرفتیں کرنے کی بجائے ان کی توصیف کی جائے۔ ان سے بدظنی کی بجائے حسنِ ظن رکھا جائے اور ان پر امورِ قبیحہ مثل جھوٹ وغیرہ کی تہمتیں دھرنے کی بجائے انہیں صادق و امین سمجھا جائے۔ اگر ان کے بعد امت کے طبقات کو پیروی کا یہ درجہ بھی حاصل نہ ہو اور اس انداز سے وہ صحابہ کرامؓ کے نمونوں کو سامنے نہ رکھیں تو یقیناً نہ انہیں حق حاصل ہو سکتا ہے اور نہ ان کے دلوں میں حق و باطل کا امتیاز ہی پیدا ہو سکتا ہے۔

ناقدینِ صحابہ رضی اللہ عنہم کا دین سلامت نہیں رہ سکتا...... کیونکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اس امت کے موثقین اولین اور امت کے حق میں دین کے مبلغین اولین ہیں۔ دین کا کوئی حصہ کسی سے پہنچا ہے اور کوئی کسی سے، قرآن کریم کا کوئی ٹکڑا کسی سے ملا ہے اور کوئی کسی سے۔ جن کو جامعین قرآن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جمع فرمایا ہے تو کسی ایک صحابیؓ کی پیروی سے انحراف یا کسی ایک صحابیؓ پر جرح اور نکتہ چینی درحقیقت دین کے اس ٹکڑے سے انحراف ہوگا جو اس سے روایت ہو کر امت تک پہنچا ہے اگر راوی مجروح اور ناقابل پیروی ہے تو اس کا روایت کردہ حصۂ دین بھی مجروح اور ناقابل اعتبار ہے۔ اگر معاذ اللہ یہ نکتہ چینی اور جرح اور عدم پیروی ان حضرات کے حق میں یونہی جائز کر دی جائے اور وہ سب میں دائر و سائر اور جاری رہے۔ جس کا

ہم سے مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی کو تنقید سے بالاتر نہ سمجھو ورنہ کسی کی ذہنی غلامی میں مبتلا ہو تو دین کا کوئی ایک حصہ بھی غیر مجروح اور معتبر باقی نہیں رہ سکتا اور امت کا کوئی ایک فرد بھی دین دار یا مدعیِ دین نہیں بن سکتا۔ اس لئے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر تنقید کو جائز سمجھنے والے بلکہ اسے اپنے دین کا موضوع بنانے والے پہلے اپنے دین کی خبر لیں کہ وہ باقی رہا کہ وہ ختم ہو گیا۔ بہرحال التزام طاعت اور "ذہنی غلامی" کا ادنی ترین مرتبہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ قلبی حسن ظن اور ان پر جرح و تنقید سے روک تھام ہے۔ انہیں خطاکار سمجھ کر اطاعت شعار بننا ممکن نہیں کیونکہ خطا کو خطا سمجھ کر اس کی اطاعت نہیں کی جاتی۔

فرقہ ناجیہ اہلسنت والجماعت...... اس لئے امت میں صرف وہی ایک فرقہ اس حدیث کی رو سے حق پر ہو سکتا ہے جو ہر نہج سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی توثیق و تصدیق اور تصویب و تنزیہ کے جذبات اپنے اندر لئے ہوئے ہو اور کوئی شبہ نہیں کہ وہ مطیع طبقہ یا "ذہنی غلامی" کا پیکر طبقہ صرف اہلسنت والجماعت کا جن کا مذہب ہی یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سب کے سب بلا استثناء مطلقاً عدول اور پاکباز ہیں۔ ان کے ہر فعل کا منشا پاک، نیتیں راست، ارادے سچے تھے۔ وہ جھگڑتے بھی تھے تو ان کے جھگڑے میں شر نہ ہوتا تھا، ان کا اختلاف بھی ہماری آشتی سے خوش آئند تر تھا، ان سب کے نفوس امارہ نہیں بلکہ **مطمئنہ** تھے، ان کے قلوب تقوی اور تقدس کا محور تھے۔ جن کا امتحان اللہ تعالیٰ نے کر لیا تھا، ان کا آدھ پاؤ صدقہ بھی ہمارے پہاڑ جیسے صدقہ سے افضل تھا۔ وہ تصنع اور بناوٹ سے بری تھے۔ ان کا علم گہرا اور نکھرا ہوا تھا۔ ان کے مقامات توحید و اخلاص سے پوری امت کے توحید و اخلاق کو کوئی نسبت نہیں اور بقول حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ امیر معاویہؓ کے گھوڑے کی ناک کے اوپر کا غبار عمر بن عبدالعزیزؒ سے ہزار درجے افضل تھا۔ کیونکہ امیر معاویہ صحابی تھے اور عمر بن عبدالعزیزؒ تابعی (روح المعانی وغیرہ وغیرہ)۔

ذہنی غلامی کے بغیر چارۂ کار نہیں...... ظاہر ہے کہ ان جذبات کو بطور عقیدہ ذہن میں رکھ لینے کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر جرح و تنقید کا تو کوئی سوال ہی ذہنوں میں نہیں آ سکتا۔ البتہ "ذہنی غلامی" کا سوال ضرور پیدا ہو سکتا ہے۔ سو اس منقول دین میں اولین طبقہ کا ہر آدمی کا کلیۃً محتاج ہوگا۔ روایت میں بھی اور درایت میں بھی، تاویلات میں بھی اور تعلیم و تزکیہ میں بھی اجمال میں بھی اور تفسیر میں بھی آخر اس کی "ذہنی غلامی" نہ کرے گا تو کیا کرے گا اور جب کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے انہی کو امت کے مختلف فرقوں کے حق و باطل کا معیار بھی قرار دے دیا اور معیار ہونے کی شان یہ ہے کہ انہی سے حق و باطل ممتاز ہوتا ہے اور انہی سے ملتا بھی ہے اور اس صورت میں بجز "ذہنی غلامی" کے چارہ کار بھی کیا ہے ورنہ محق ہونے کے بجائے آدمی مبطل ہونا گوارہ کرے۔

روافض، خوارج، معتزلہ اور دوسرے انہی کے ہم رنگ فرقے مبطل ہی اس لئے قرار پائے کہ انہوں نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو تنقید سے بالاتر نہ سمجھا ان کی "ذہنی غلامی" پر راضی نہ ہوئے اور ان پر طعنہ زنی اور نکتہ چینی سے باز نہ آئے۔ جس سے صاف لفظوں میں اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے روکا تھا اور فرمایا تھا کہ میرے

صحابہ پر سب وشتم نہ کرو، میرے صحابہ کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔ جس میں نکتہ چینی اور گرفت اور نقد وتبصرہ سب ہی کچھ زیر ممانعت آجاتا ہے۔ وہ نجوم ہدایت ہیں تو ان سے راہ پائی جائے گی۔ انہیں راہ دکھائی نہیں جائے گی، ان کی اقتداء کی جائے گی، ان کی غلطیاں پکڑ پکڑ کر ان سے اقتداء کرائی نہیں جائے گی۔

اس سے واضح ہے کہ جو لوگ اپنے نقد وتبصرہ کا دائرہ ان آباء صالحین تک وسیع کردینا چاہتے ہیں اور بقول شخصے "بازی بازی باریش بابا ہم بازی" کے ڈھنگ پر ان پر جرح وتنقید جائز سمجھتے ہیں۔ تو یہی ایک چیز ان کے مسلک کے باطل ہونے اور مخالف اہلسنت والجماعت ہونے پر ان سے اعتزال کرلینے کی کافی دلیل ہے۔ اب خواہ کوئی نیا فرقہ بن جائے یا پرانے معطل فرقوں کی "ذہنی غلامی" میں مبتلا ہو کر انہی کا مقلد ہو۔ بہرحال وہ اہل حق میں سے نہ ہوگا۔

ناقدین صحابہ رضی اللہ عنہم افتراقِ امت کا سبب ہیں...... کیونکہ اس حدیث میں یہ بھی نمایاں ہے کہ جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم معیار حق وباطل ہیں تو ان کی مخالفت ہی سے نیا فرقہ بنے گا۔ موافقت سے کوئی نیا فرقہ وجود میں نہیں آسکتا۔ بلکہ وہی قدیم ناجی فرقہ برقرار رہتا ہے جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے واسطے سے اپنا روحانی سلسلہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملائے ہوئے ہے، کیونکہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک ہی فرقہ تھا جو ناجی تھا اور وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت تھی جو برحق بھی تھی اور معیار حق بھی۔ بعد میں جتنے فرقے بنے وہ ان کی مخالف راہ چل کر ہی بنے۔

اور اسی لئے وہ ناحق قرار پائے کہ معیار حق سے الگ ہوگئے۔ پس جو لوگ بلا استثناء سارے صحابہ رضی اللہ عنہم کی عظمت وعقیدت کے ساتھ پیروی کرتے ہیں اور ان پر زبان طعن وتنقید کھولنا جائز نہیں سمجھتے وہ یقیناً فرقہ نہیں بلکہ اصل جماعت ہیں۔ جن کے عقیدہ وعمل کا سرا سند کے ساتھ قرن اول کی پاکباز جماعت سے ملا ہوا ہے اور وہی اس جماعت کی سنتوں پر عقیدت وعظمت سے جمے ہوئے ہونے کے سبب صحیح معنوں میں اہلسنت والجماعت کہلانے کے مستحق ہیں۔ البتہ صحابہ کرام کا خلاف کرنے والے اور ان پر جرح وتنقید سے نہ رکنے والے حتی کہ اسے اصول قرار دینے والے درحقیقت بلا جڑ کی نئی نئی شاخیں دین میں نکال کر اور نئے نئے خوشنما روپ کے عنوانوں سے دین کی تعبیریں کرکے اسے صد رخ بنادینے والے امت میں افتراق وانتشار پھیلا رہے ہیں اور امت کو دین کے نام پر ضعیف وناتواں بناتے جارہے ہیں تو یہی لوگ فی الحقیقت فرقہ ہیں "جماعت نہیں" گو اپنے نام کے ساتھ جماعت کا لفظ پکار پکار کر شامل کرلیں "فَاُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ سَمّٰھُمُ اللّٰہُ" بہرحال اس حدیث مذکورہ سے ثابت ہوگیا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو معیار حق رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بنایا اور وہ آپ کے منشاء کے مطابق معیار حق ثابت ہوئے۔ جن پر آج تک امت مرحومہ اپنے کھرے اور کھوٹے کو پہچانتی رہی ہے۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی لئے ان پر کلی اعتماد فرما کر ان کے طریقے کو اپنا طریقہ اور اپنے طریقہ کو ان کا طریقہ فرمایا اور پوری امت کے لئے انہیں حجت قرار دیا جس سے قیامت تک امت کے حق وباطل کا فیصلہ انہی کے علم وعمل کے معیار سے ہوتا رہے گا۔

خود اپنے معیارِ حق ہونے کا ادعاء...... اندریں صورت مودودی صاحب کا دستور جماعت کی بنیادی دفعہ میں عموم واطلاق کے ساتھ یہ دعویٰ کرنا کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی معیارِ حق اور تنقید سے بالاتر نہیں ہے جس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سب سے پہلے شامل ہوتے ہیں اور پھر ان پر جرح وتنقید کا عملی پرواز بھی ڈال دینا حدیث رسول کا محض معارضہ ہی نہیں بلکہ ایک حد تک خود اپنے معیارِ حق ہونا کا ادعاء ہے۔ جس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تک کو پرکھنے کی جرأت کرلی گئی۔ گویا جس اصول کو شد ومد سے تحریک کی بنیاد قرار دیا گیا تھا اپنے ہی بارے میں اسے ہی سب سے پہلے توڑ دیا گیا اور سلف وخلف کے لئے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا خود معیارِ حق بن بیٹھنے کی کوشش کی جانے لگی۔ ﴿وَلَا تَكُونُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ﴾ ①

صحابہ رضی اللہ عنہم کی اجتماعی اطاعت...... دوسرا الفاظِ حدیث سے یہ واضح ہو رہا ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا ایک دو صحابی ہی معیارِ حق نہیں بنا دیے گئے۔ بلکہ "اصحابی" جمع کا صیغہ لاکر اشارہ کیا گیا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم معیارِ حق بن کر واجب الاطاعت ہیں۔ جس کے لئے احادیث میں ایک ایک، دو دو اور چار چار اس سے زیادہ اور پھر پوری جماعت کی اقتداء کے اوامر وارد ہوئے ہیں۔ کیونکہ معیار ہو کر بھی واجب الاطاعت نہ بنے تو معیار معیار نہیں رہتا اور جب کہ معیارِ حق ساری جماعت صحابہ رضی اللہ عنہم کو فرمایا گیا تو سارے ہی صحابہ رضی اللہ عنہم بلا استثناء واجب الاطاعت بھی قرار دیئے گئے۔ ممکن ہے کہ کسی کو شک وشبہ گذرے کہ جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے فروعی مذاہب مختلف رہے اور مسائل میں اختلاف اور تناقض تک نظر آتا ہے تو لامحالہ ایک کی اطاعت کر کے بقیہ کی اطاعت سے دست برداری ہی کرنی پڑے گی ورنہ ضدین کا اجتماع ہو جائے گا جو ناممکن العمل ہے تو پھر سب کی اطاعت وپیروی کہاں رہی اور ممکن ہی کب ہوئی؟

جواب یہ ہے کہ اگر ایک کی پیروی دوسروں کی طعن وتنقید سے بچ کر اور سب کی عظمت رکھ کر ہو تو وہ سب ہی کی پیروی کہلائے گی۔ جیسے سلسلۂ ختم نبوت میں عملاً پیروی ایک رسول کی ہوتی ہے مگر معیارِ حق سب کو سمجھا جاتا ہے۔ عظمت وتنزیہ اور تقدیس سب کی یکساں کی جاتی ہے۔ تنقید وتخطیہ سب کا معصیت سمجھا جاتا ہے۔ تو یہی سارے انبیاء کی پیروی سمجھی جاتی ہے۔ ورنہ کسی ایک پر بھی زبان طعن یا لسانِ نقد وتبصرہ کھول کر ہزار کی پیروی بھی پیروی نہیں ہے۔ بلکہ سب کی مخالفت اور بغاوت ہے کیونکہ خود حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم فروعات میں مختلف رہنے کے باوجود آپس میں ایک دوسرے کی عظمت وتوقیر کو واجب سمجھتے ہیں اور اس کے خلاف کو وہ برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ جیسا کہ انبیاء علیہم السلام شرائع میں مختلف رہ کر ایک دوسرے کی تصدیق کو اصل ایمان قرار دیتے تھے۔ پس ایک طعنہ زن اور نکتہ چیں جب کہ ان کے اس قدر مشترک کی خلاف ورزی کر رہا ہے تو وہ سب کی خلاف ورزی کا مرتکب اور سب کے حق میں باغی ہے۔ ذیل کے ارشاد نبویؐ میں اس حقیقت پر روشنی بھی ڈال دی گئی ہے کہ

---

① پارہ: ۲۸، سورۃ الحشر، الآیۃ: ۱۹.

”اَصْحَابِیْ كَالنُّجُوْمِ بِاَيِّهِمُ اقْتَدَيْتُمْ اِهْتَدَيْتُمْ“ ”میرے صحابہ ستاروں کی مانند ہیں۔ جس کی بھی پیروی کرو گے ہدایت پا جاؤ گے“۔ ”اَیُّهُـــمْ“ کے لفظ سے اقتدا تو مطلق رکھی گئی ہے کہ کسی کی بھی کی جائے ہدایت مل جائے گی۔ لیکن نجوم کے لفظ سے اقتداء کو سمجھنا اور ہادی ماننا سب کے لئے ضروری قرار دیا گیا ہے۔ یہ نہیں کہ جس کی پیروی کرو نجم ہدایت اور نور بخش صرف اسی کو سمجھو پس پیروی کا عمل تو ایک دو تک محدود ہو سکتا ہے لیکن نور افشانی کا عقیدہ ایک دو تک تو محدود نہیں رہ سکتا وہ سب کے لئے ماننا لازمی ہوگا۔

بہر حال صحابہ کرام کا طبقہ تو وہ ہے کہ اس کا نام لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے امت کے مختلف مکاتب خیال کے فرقوں کے حق و باطل کا معیار قرار دیا ہے۔ تنقید سے بالاتر بتلایا اور ان کی ”ذہنی غلامی“ یا اطاعت و پیروی ضروری قرار دی۔

تا قیامت معیار شخصیت رہے گا...... باقی ان حضرات کے بعد کسی طبقہ کو طبقہ کی حیثیت سے نام لے کر معیار حق نہیں فرمایا، البتہ معیار حق ہونے کا ایک کلی ضابطہ اور معیاری اوصاف کا تعین فرما دیا گیا ہے۔ جنہیں سامنے رکھ کر معیاری افراد کو ہر زمانے میں فی الجملہ متعین کیا جا سکتا ہے۔

اس سے انکار نہیں کہ قرون مشہودہ کے بعد بشری کمزوریوں کے امکانات بھی رہے اور ایسی کمزوریوں کا گاہے بگاہے عملاً ظہور بھی ہوا، لیکن ایسی گاہے بگاہے کمزوریوں سے معیاری شخصیتوں کے معیار ہونے میں فرق نہیں پڑتا۔ کیونکہ اول تو اتقیاء امت میں سے کسی کی زندگی کو پاکباز زندگی کہنے کیلئے یہ کافی ہے کہ غالب زندگی تقویٰ و طہارت کی ہو۔ بھول، چوک، نسیان و ذہول اور گاہے بگاہے بے ارادی کمزوری انسانی خمیر میں ہے۔

دوسرے بعد کے لوگ صرف بایں معنی معیار حق و باطل ہوتے ہیں کہ ان کی مجموعی زندگی کو سامنے رکھ کر اپنے لئے دینی راہ عمل کا خاکہ بنا لیا جائے اور اسے ان کے پارسایانہ عمل کے خاکہ پر منطبق کر کے اپنے حق و باطل ہونے کا فیصلہ کیا جائے، بایں معنی معیار حق ہونے کو انکا ہر قول و فعل حجت شرعی ہو تو اس قسم کے مقدس افراد اور معیاری لوگ ہر دور میں ہوتے رہیں گے اور امت کے لئے مینارۂ روشنی ثابت ہوتے رہیں گے چنانچہ حضرت شیخ نے معیاریت کے ایسے اوصاف پر بھی کتاب و سنت سے روشنی ڈالی اور اس لئے روشنی ڈالی ہے کہ راہ رشد و ہدایت میں محض لٹریچر سے رہنمائی نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ شخصیتوں کے کردار کے جامہ میں سامنے نہ آئے۔ ورنہ کتب سماویہ کے ساتھ انبیاء علیہم السلام کو مبعوث فرمائے جانے کی ضرورت نہ ہوتی درحالیکہ خود کتب سماوی کے معانی و مرادات کی تعیین کے لئے بھی معیار حق یہی مقدس ہستیاں ہوئی ہیں۔ وہ نہ ہوں تو کتب الٰہیہ کے معنی متعین کرنے میں ہر بوالہوس آزاد ہو جائے اور حق و باطل کا کوئی فیصلہ بھی نہ ہو سکے۔ اس لئے قیامت تک رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ایسی معیاری شخصیتوں کا بنام، مجدد، محدث، امام، مجتہد، راسخ فی العلم، فقیہ وغیرہ کا آتے رہنا ضروری ہے جس کے معیار سے امت کے عوام و خواص اپنے دینی عقیدہ و کردار کو جانچتے رہیں اور فی الجملہ ان پر اپنے کو

منطبق کر کے روحانی سکون و طمانیت حاصل کرتے رہیں۔

پس مودودی صاحب تو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی بھی انسان کو معیار حق ماننے کے لئے تیار نہیں۔ لیکن کتاب وسنت کا فیصلہ یہ ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد قیامت تک معیاری شخصیتیں آتی رہیں گی جو درجہ بدرجہ حق و باطل کا معیار ثابت ہوتی رہیں گی اور جو بھی کتاب وسنت کے الفاظ سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی سعی کرے تو ایسی شخصیتیں اپنے اپنے دور کے مناسب حال عنوانوں سے انکی تاویلات کا پردہ چاک کر کے اصل حقیقت کا چہرہ دکھاتی رہیں گی۔

جیسا کہ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے "یَحْمِلُ هٰذَا الْعِلْمَ مِنْ كُلِّ خَلَفٍ عُدُوْلُهٗ يَنْفُوْنَ عَنْهُ تَحْرِيْفَ الْغَالِيْنَ وَانْتِحَالَ الْمُبْطِلِيْنَ وَ تَاْوِيْلَ الْجَاهِلِيْنَ." "اس علم (دین) کو (ہر دور میں) اعتدال پسند خلف (اپنے سلف سے) لیتے رہیں گے جو غلو پسندوں (اور حدود و اعتدال سے گذر جانے والوں) کی تحریفوں، باطل پرستوں کی دروغ بیانیوں اور جہلاء کی (رکیک) تاویلوں کو دور کرتے رہیں گے"۔

اگر توفیق خداوندی شامل حال ہوئی تو ان معیاری شخصیتوں اور ان کے معیار ہونے کی شانوں کی تفصیل آئندہ کسی دوسرے مقالہ میں کی جاسکے گی۔

بہر حال حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے مکتوب گرامی میں اہم اور بنیادی نکتہ بحث بھی معیاریت غیر رسول کا مسئلہ ہے جس کو مودودی صاحب نے اصولی طور پر اپنے بنیادی دستور میں رد کر دیا ہے اور شیخ نے اسے اہل حق کی بنیاد قرار دیا ہے۔ جس سے یہ اختلاف فروعی نہیں بلکہ اصولی بن گیا۔ خدا کرے کہ مودودی صاحب اور ان کے رفقاء اس خلیج کو پاٹ دینے کی ہر ممکن تدبیر عمل میں لائیں۔ کسی تحریک کو چلانے کے لئے بنیادی اختلافات پیدا کر لینا خود تحریک کو اپنے ہاتھوں ختم کر دینا ہے۔ فروعی باتوں میں تو اتفاق و اختلاف دونوں راستوں سے چلتی رہتی ہیں، لیکن اصولی اختلاف اور صرف نظر ایک طرف میں جمع نہیں ہو سکتے۔ ①

وَمَا عَلَيْنَا اِلَّا الْبَلَاغُ

محمد طیب غفرلہ مہتمم دارالعلوم دیوبند
۲۰ جمادی الاولیٰ ۱۳۷۵ھ

---

① محمد طیب غفرلہ مہتمم دارالعلوم دیوبند، ۲۰ رجمادی الاولیٰ ۱۳۷۵ھ (یوم الخمیس)

ضمیمہ

ذہنی غلامی اور تقلید...... ذہنی غلامی کے لفظ سے غالباً مودودی صاحب نے ”تقلید“ کی ترجمانی فرمائی ہے لیکن اس معنی میں یہ اصطلاح غلط اور مغالطہ انگیز ہے۔ غلامی کا حاصل کسی کے آگے جھکنا ہے اور تقلید کے معنی کسی کی بات ماننا ہے۔ ایک غلام اپنے آقا کے کمالات کے آگے نہیں جھکتا بلکہ اس کی ذات کے سامنے جھکتا ہے خواہ وہ کندۂ ناتراش اور احمق ہی کیوں نہ ہو، لیکن ایک مقلد اپنے امام مجتہد کے سامنے آتا ہے تو صرف اس کے منصب و مقام کی پیروی کرتا ہے جس کو وہ عقل و نقل کا پیکر کامل سمجھتا ہے۔ ذات کے آگے نہیں جھکتا۔ پس غلامی میں آقا کی ذات پیش نظر ہوتی ہے۔ اس کا کمال پیش نظر نہیں ہوتا اور تقلید میں مجتہد کا کمال سامنے ہوتا ہے، ذات سامنے نہیں ہوتی۔ غلامی میں جبر ہوتا ہے کہ نہ غلام اپنی صلاحیتوں کو آقا کے انتخاب میں صرف کر سکتا ہے ورنہ خود آقا ہی کی صلاحیتوں پر نظر رکھ سکتا ہے۔ ادھر بھی ذات اور ذاتی خوف و طمع، ادھر بھی ذات اور ذاتی جبر و قہر۔ نہ وہاں شعور و استدلال نہ یہاں۔ پس ”ذہنی غلامی“ میں نہ اپنا شعور بیچ میں ہوتا ہے نہ آقا کا کمال اور تقلید میں طوع و رغبت، عقلی شعور اور قلبی اعتقاد ہوتا ہے جس میں نہ جبر و دباؤ کا کوئی سوال پیدا ہوتا ہے اور نہ امام مجتہد کے کمالات سے بے شعوری، غرض غلامی بے عقلی سے پیدا ہوتی ہے اور تقلید اتباع عقل و شعور سے، کیونکہ تقلید کسی کے آگے سر جھکانے کا نام نہیں، اس کی بات ماننے کا نام ہے اور بات بھی وہ جسے جذبات سے نہیں، علمی کمالات کے چشموں سے نکلی ہوئی سمجھ لی گئی ہو اور پھر کمالاتی ہی نہ ہو بلکہ اوپر سے نسبت بھی ہو کہ وہ خود اس شخص کی بات نہیں بلکہ اوپر کی بات ہے جہاں جھک جانا ہی نفسانی شرف ہے۔ پس تقلید میں شعور ہوتا ہے۔ بے شعوری نہیں، استدلال ہوتا ہے۔ (گو جزوی مسئلہ نہ ہو، اصولی اور کلی ہو۔ جس سے مجتہد مطاع کی شخصیت اتباع کے لئے متعین کی جاتی ہے) یہ جبری اور ذاتی دباؤ نہیں ہوتا، عبودیت نہیں ہوتی اطاعت ہوتی ہے۔ پس کہاں غلامی اور عبدیت اور کہاں اتباع و عقیدت، کہاں غرض مندی اور خوف و طمع اور کہاں محبت و فنائیت، کہاں شعور و استدلال اور کہاں جمود و تعطل، کہاں حسن ظن اور قلبی شفقت اور کہاں بیزاری اور اندرونی انحراف، کہاں عقل و خرد بالائے طاق اور کہاں عقلی رہنمائی پیش پیش۔

چراغ مردہ کجا نور آفتاب کجا۔ اس لئے ذہنی غلامی کا لفظ جس کا معنی ذہن کو شعور و استدلال سے معطل کر کے کسی کی ذات کے آگے جھکا دینے کے ہیں اس تقلید کا ترجمان نہیں بن سکتا جس میں ذہنی شعور کی بیداری کے ساتھ کسی کی علمی اور کمالاتی نسبتوں کو سامنے رکھ کر حسن ظن اور استدلال کلی سے اس کی تقلید کی ترجمانی کے لئے ”ذہنی

غلامی“ کا تحقیر آمیز لفظ شاید اشتعال انگیزی اور نئی نسل کے دل و دماغ پر چوٹ لگا کر انہیں تقلید سے بیزار بنانے کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ کیونکہ فی زمانہ غلامی کے لفظ سے زیادہ کریہہ کوئی لفظ نہیں، آج افراد ہوں یا طبقات، اقوام ہوں یا اوطان۔ آزادی کے نام پر برسرِ پیکار ہیں۔

بااقتدار قوموں نے چونکہ کمزوروں کی غلام سازی کو زندگی کا نصب العین بنا رکھا ہے جس سے بے دست و پا اقوام تنگ آ چکی ہیں۔ اس لئے وہ آزاد ہونے کے لئے ہاتھ پیر مار رہی ہیں اور آج کی دنیا میں غلامی کے لفظ ہی کو حقارت کی نگاہوں سے دیکھا جانے لگا ہے۔ اس لفظ کے سامنے آتے ہی لوگ چونک پڑتے ہیں اور نفرت کے ساتھ اس سے بدک جاتے ہیں۔ اس لئے تقلید سے نفرت دلانے کے لئے اس سے بہتر تدبیر نہیں سوچی جا سکتی تھی کہ اس کا ترجمہ ایک ایسے مکروہ لفظ سے کر دیا جائے تو جو خود ہی ذہنوں میں حقیر و ذلیل ہو، کہ اس راستہ سے تقلید کے مفہوم سے ہی لوگوں کے دلوں میں نفرت پیدا کر دی جائے، لیکن میں عرض کر چکا ہوں کہ ذہنی غلامی اور تقلید کی حقیقتوں میں زمین و آسمان سے بھی زیادہ فرق ہے۔ اور ایک کے لئے دوسرا لفظ کسی طرح بھی ترجمان نہیں ہو سکتا بلکہ یہ لفظ ہی شرعی نہیں ہے جو کسی دینی اور شرعی اصطلاح کے لئے استعمال کیا جائے۔ یہ محض اشتعال انگیزی اور پنہائی مقصد برآری کے لئے ایک حیلہ کیا گیا ہے۔

پس ہم تقلید کے ضرور قائل ہیں لیکن تقلید کے معنی ذہنی غلامی کے نہیں سمجھتے جیسا کہ ابھی ذکر کیا گیا ہے۔ تقلید میں اتباع بھی ہوتا ہے اور شعور بھی۔ گو شعور اجمالی ہو تفصیلی نہ ہو۔ ارشادِ ربانی ہے۔

﴿عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ﴾ ① یہاں صحابہ کرامؓ کے لئے (جو متبعین اولین ہیں) اتباع بھی ثابت کیا گیا ہے اور بصیرت و شعور بھی جس میں سب سے پہلے اس کا شعور پیدا ہوتا ہے کہ یہ کلام کس کا ہے جس کی پیروی کی جارہی ہے اور وہ شخصیت کون ہے جس کا اتباع کیا جارہا ہے۔ اور ذہنی غلامی کا حاصل کلیتہً ذہنی بے شعوری اور جمود کے ہیں جو کسی بھی مومن کا شیوہ نہیں ہو سکتا۔ اس مضمون میں ہم نے جہاں بھی یہ لفظ لیا ہے وہ مودودی صاحب کے کلام سے بطور حکایت و نقل کے لیا ہے ورنہ ہمارے نزدیک اسلامی اصطلاح کے نقطۂ نظر سے یہ لفظ مہمل اور بے معنی ہے۔ نہ یہ کسی شرعی مفہوم کا ترجمان بن سکتا ہے نہ عقل کا۔ کفار کی آبائی تقلید پر بول دیا جائے تو ممکن ہے کہ کسی حد تک چسپاں ہو جائے۔

(محمد طیب غفرلہ)

---

① پارہ: ۱۳، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۱۰۸۔

آغازِ بخاری

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

اَمَّا بَعْدُ!...... كَيْفَ كَانَ بَدْءُ الْوَحْيِ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقَوْلِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ ذِكْرُهٗ: ﴿اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْ بَعْدِهٖ﴾ حَدَّثَنَا الْحُمَيْدِيُّ قَالَ حَدَّثَنَا سُفْيَانُ قَالَ حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ سَعِيْدِ الْاَنْصَارِيُّ قَالَ اَخْبَرَنِيْ مُحَمَّدُ بْنُ اِبْرَاهِيْمَ التَّيْمِيُّ اَنَّهٗ سَمِعَ عَلْقَمَةَ بْنَ وَقَّاصٍ اللَّيْثِيَّ يَقُوْلُ سَمِعْتُ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ عَلَى الْمِنْبَرِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ: اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ وَاِنَّمَا لِكُلِّ امْرِئٍ مَّا نَوٰى فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهٗ اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ فَهِجْرَتُهٗ اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ، وَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهٗ اِلٰى دُنْيَا يُصِيْبُهَا اَوْاِلَى امْرَاَةٍ يَنْكِحُهَا فَهِجْرَتُهٗ اِلٰى مَاهَاجَرَ اِلَيْهِ. صَدَقَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ. ①

کلماتِ تمہید...... بزرگانِ محترم! یہ ہم لوگوں کی سعادت ہے کہ بخاری شریف کے افتتاح میں شرکت کا موقع ملا۔ عموماً اصحابِ درس کا طریق یہ ہے کہ وہ کسی بھی فن کی اہم کتاب شروع کرنے کے وقت چار چیزوں کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ سب سے پہلے مصنف کا اجمالی تعارف کراتے ہیں۔ دوسرے خود تصنیف کی طرف توجہ دلاتے ہیں کہ خود کتاب کی عظمت وجلالت کیا ہے۔ تیسرے یہ کہ اس کتاب کا موضوع کیا ہے۔ جس سے کتاب میں بحث کی گئی ہے اور چوتھے یہ کہ اس کی غرض وغایت کیا ہے؟ کیوں اس کتاب کو پڑھتے ہیں؟

اس کو اگر علمی اصطلاح میں لایا جائے تو وہ چار چیزیں یہ ہیں۔ سب سے پہلے "علت فاعلی" کہ اس کا فاعل کون ہے جس کی طرف ہم توجہ کررہے ہیں۔ دوسرے "علت مادی" کہ وہ کیا چیزیں ہیں جن پر مصنف نے بحث کی ہے اور تیسرے "علت صوری" کہ اس کتاب کی اور موضوع کی تشکیل کس طرح سے ہوئی ہے؟ اور چوتھے

---

① الصحیح للبخاری، کتاب بدء الوحی، باب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ ﷺ، ج: ۱، ص: ۱، رقم: ۱.

"علتِ غائی" کہ اس کے پڑھنے سے کیا غرض وغایت ہے۔ تو عام طور پر اصحاب درس علتِ فاعلی، علتِ مادی، علتِ صوری اور علتِ غائی انہیں چار چیزوں سے بحث کرتے ہیں۔

جلالتِ امام رحمۃ اللہ علیہ...... جہاں تک مصنف کی ذات کا تعلق ہے، وہ مسلمانوں کے قلوب میں آفتاب سے زیادہ مرکوز اور روشن ہے۔ کوئی زیادہ تعارف کرانے کی ضرورت نہیں ہے، اوائل میں سے ہیں، متقدمین میں سے ہیں، امام ہیں، حافظ ہیں اور مصنف ہیں۔ تمام اوصاف کمال جو اہل علم میں ہوتی ہیں۔ حق تعالیٰ نے ان میں جمع فرمائی ہیں۔

تقریباً ۱۹۲ھ یا ۱۹۴ھ میں پیدائش ہوئی ہے۔ باسٹھ (۶۲) سال کی عمر ہوئی ہے اور قریب ۲۵۴ھ یا ۲۵۶ھ میں وفات ہوئی ہے۔؟ نے یہ تین چیزیں جمع کی ہیں اور تاریخ بتلائی کہ کونسا سن ولادت کا ہے اور کون سا سن وفات کا ہے اور عمر کتنی ہے؟ تو ان تینوں کو ایک شعر میں جمع کر دیا ہے ؎

كَانَ الْبُخَارِيُّ حَافِظًا وَّمُحَدِّثًا　　جَمَعَ الصَّحِيْحَ مُكَمَّلَ التَّحْرِيْرِ
مِيْلَادُهٗ صِدْقٌ وَّمُدَّةُ عُمْرِهٖ　　فِيْهَا حَمِيْدٌ وَّانْقَضٰى فِيْ نُوْرٍ

گویا سن ولادت تو صدق کے لفظ سے نکلتا ہے اور مدتِ عمر حمید کے لفظ سے ہے اور سن وفات نور کے لفظ میں ہے۔ ①

جہاں تک امام کی عظمت اور جلالت کا تعلق ہے۔ حافظہ، عدل و اتقان، زہد و تقویٰ اور دیانت وہ اس سے زیادہ مشہور ہے جتنا کہ آفتاب کو ہم دیکھتے ہیں۔ پوری امت نے امام کی تلقی بالقبول کی ہے۔

حافظہ حق تعالیٰ نے محیر العقول عطاء فرمایا۔ اس زمانے میں حفظ ہی پر مدار تھا اور بڑے بڑے محدثین اور حفاظ حدیث پیدا ہوئے کہ جن کے حفظ کو بس کرامت ہی کہا جا سکتا ہے۔ عام طبعی طور پر یہ حافظے نہیں ہوتے۔ حق تعالیٰ شانہٗ کو اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کو زیادہ پھیلانا تھا تو حیرت ناک حافظے عطاء فرمائے، جس کو ہم کرامت ہی کہہ سکتے ہیں۔

کرامتِ حفظ...... امام ترمذیؒ مکہ مکرمہ کا سفر کر رہے تھے اور شیخ بھی ساتھ ہیں، جن کے امام ترمذی شاگرد ہیں۔ متعدد تلامیذ ساتھ ہیں۔ تمام تلامیذ نے درخواست کی کہ جہاز میں ایک لمبا وقت گزرے گا تو حدیث کا املاء کرا دیا جائے۔ شیخ نے فرمایا کہ شرط یہ ہے کہ کاغذ دوات ہو اور قلم لے کر بیٹھو۔ جو حدیث میں لکھواؤں لکھتے جاؤ۔ یہ شرط مان لی گئی۔ امام ترمذی کے پاس نہ کاغذ تھا نہ قلم اور شوق یہ تھا کہ میں بھی درس میں حاضر ہوں۔ مگر شیخؒ نے شرط لگا دی تھی۔

تو یہ کیا کہ پیچھے بیٹھے تھے اور ایک گھٹنا کھڑا کر کے بایاں ہاتھ اس پر رکھتے اور دائیں ہاتھ کو اس طرح حرکت دیتے تھے گویا لکھ رہے ہیں۔ تاکہ شیخ یہ سمجھیں کہ کاغذ بھی ہے اور لکھائی بھی ہو رہی ہے۔ متعدد ایام گزر گئے، ایک دن شیخ کی نظر پڑی تو دیکھا کہ نہ کاغذ ہے نہ قلم ہے فرمایا۔ میں نے شرط لگائی تھی تم بلا کاغذ اور قلم کے کیسے آ گئے؟

---

① صدق ۱۹۴ھ، حمید ۶۲، نور ۲۵۶ھ ۶۲ سال عمر مبارک ہوئی۔

انہوں نے کہا کہ: حضرت! مقصد تو یہ تھا کہ چیز محفوظ ہو جائے۔ تو اس ایک ہفتے میں حضرت نے جتنی حدیثیں ارشاد کیں وہ سب محفوظ ہیں اور پہلے دن اتنی حدیثیں ان اسانید کے ساتھ سنائیں۔ دوسرے دن یہ حدیثیں فلاں فلاں سند کے ساتھ سنائیں، ہفتے کی کل حدیثیں مع اسانید کے حافظے سے بتلائیں۔ شیخ بڑے خوش ہوئے۔ گلے لگایا۔ فرمایا: تمہیں بیٹھنے کی اجازت ہے۔

اب یہ حافظہ کہ دس دن بعد فرمائیں کہ فلاں دن یہ حدیثیں تھیں، اور یہ یہ سند تھی، فلاں دن یہ حدیثیں تھیں یہ یہ سند تھی۔ اس کو سوائے کرامت کے اور کیا کہا جائے۔ عام حافظے میں یہ چیز نہیں ہوتی۔

امتحانِ حفظ...... یہ امام بخاریؒ جب بغداد تشریف لائے۔ تو محدثین میں چرچا تھا کہ ایک نوجوان ہے جو حافظ حدیث ہے اور حفظ کا جو شہرہ تھا یقین نہیں آتا تھا کہ ایسا غیر معمولی حفظ ہو تو ارادہ کیا گیا کہ امام بخاریؒ کے حافظے کا امتحان لیا جائے۔ دس محدث جمع ہوئے اور دس دس حدیثیں چھانٹ لیں۔ سو احادیث میں امتحان کرنا تھا۔ بہت عظیم مجمع ہوا۔

پہلے محدث نے دس حدیثیں بیان کیں اور سندیں الٹ دیں۔ کسی متن کی سند کسی کے ساتھ تھوپ دی، کسی کی سند کسی کے ساتھ، تو دس حدیثیں الٹ پلٹ کر کے بیان کیں۔

امام بخاریؒ فرماتے اَعْرِفُهٗ لَا اَعْرِفُهٗ. اس کے بعد دوسرے محدث نے اسی طرح الٹ پلٹ کر کے کسی کی سند اور کسی کا متن خلط ملط کر کے بیان کیا۔

ہر حدیث پر فرماتے رہے "لَا اَعْرِفُهٗ لَا اَعْرِفُهٗ"

میں نہیں پہچانتا، سو کی سو حدیثیں اس طرح سے روایت کی گئیں ہر حدیث پر امام نے کہا: "لَا اَعْرِفُهٗ لَا اَعْرِفُهٗ" میں نہیں پہچانتا۔ لوگوں نے کہا کہ خواہ مخواہ شہرت ہو گئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ نوجوان نہ حفظ رکھتا ہے، نہ اتقان رکھتا ہے، ہر چیز میں "لَا اَعْرِفُهٗ لَا اَعْرِفُهٗ" میں نہیں پہچانتا ہی کہتا جاتا ہے۔

جب یہ سب کچھ ہو گیا تو امام بخاریؒ بولے سب سے پہلے محدثؒ نے اس ترتیب سے دس حدیثیں بیان کیں اور سندیں الٹ دیں۔ پہلی حدیث کی یہ سند ہے، دوسری کی یہ سند ہے، تیسری کی یہ ہے۔ دس کی دس صحیح سندیں بیان کیں۔ اس کے بعد کہا کہ دوسرے محدثؒ نے یہ دس حدیثیں بیان کیں، ان میں یہ خرابی تھی۔ یہ خرابی تھی۔ اس کی اصل سند یہ ہے، یہ ہے۔ سو کی سو روایتوں کی صحیح سندیں بیان کر دیں۔ تمام محدثین کی گردنیں جھک گئیں اور کہا جو سنا تھا وہ حقیقتاً سچ تھا اور یہ شخص امامت کے درجے تک پہنچا ہوا ہے۔ وہاں سے پھر امام بخاریؒ کا شہرہ ہوا۔ بہر حال امام بخاریؒ کا حافظہ، ان کا اتقان اور ان کا زہد و تقویٰ یہ گویا اظہر من الشمس ہے۔ ساری دنیا اس کو جانتی ہے۔

جلالتِ کتاب...... ظاہر بات ہے "قَدْرُ الشَّهَادَةِ قَدْرُ الشُّهُوْدِ" جیسا شہود ہوتا ہے ویسی ہی شہادت ہوتی ہے۔ جب امام اس درجہ کا ہے تو اس کی تصنیف بھی اسی درجہ کی ہو گی۔ تو بخاری کی جلالتِ شان یہ ہے کہ پوری امت نے اجماعی طور پر تلقی بالقبول کی ہے اور "اَصَحُّ الْكُتُبِ بَعْدَ كِتَابِ اللهِ" مانا گیا ہے۔

بعض حضرات محدثین کی رائے ہے کہ "اَصَحُّ الْکُتُبِ بَعْدَ کِتَابِ اللّٰہِ" امام مالکؒ کی مؤطا ہے اور وہ حدیث میں اولین تصنیف بھی ہے۔ لیکن مؤطا کے اندر احادیث بھی ہیں، آثارِ صحابہ بھی ہیں اور فتاویٰ بھی ہیں۔ تو مخلوط ہے۔

امام بخاریؒ نے تنقیح کی بلکہ ہر چیز کو الگ الگ کر دیا ہے۔ ابواب اور فصول مرتب کئے اور ایسی کڑی شرائط لگائیں کہ دوسری عبارات اور اسانید میں وہ شرطیں نہیں پائی جاتیں، بلآخر امت کا اجماع ہو گیا کہ اصح الکتب بعد کتاب اللہ صحیح بخاری ہے۔ اولین درجہ سند میں قرآن کریم کا ہے تو وہاں تواترِ طبقہ ہے۔ یہ نہیں ہے کہ تواترِ روایت ہو یا تواترِ سند ہو۔ بلکہ طبقاتی تواتر ہے۔ ہر قرن میں ہزاروں، لاکھوں کی تعداد میں حافظ قرآن مجید موجود ہیں۔ اس واسطے وہ تواترِ طبقہ ہے کہ جس میں کذب کا شائبہ یا خلط ملط کا شائبہ بھی نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد حدیث کا درجہ ہے۔

اسماءُ الرجال...... احادیث میں محدثینؒ نے "حق تعالیٰ انہیں جزائے خیر دے" اور بڑے بڑے مقامات دے، امت کے لئے سامان کر دیا۔ روایت حدیث کے سلسلے میں پچاس ہزار آدمیوں کی تاریخ جمع کر دی جو راویانِ حدیث ہیں۔ ان کے خاندان کیا ہیں، ذہن کا کیریکٹر کیا ہے، ان کا کردار کیا ہے، حافظے کیسے تھے، عدالت کیسی تھی یہ سب جمع کر دیا ہے۔ تو پچاس ہزار انسانوں کی تاریخ ان کے خاندانوں اور احوال سمیت مرتب کر دی کہ یہ راویانِ حدیث ہیں۔

میزانِ حدیث...... پھر مصطلحات الحدیث مستقل فن ایجاد کر دیا۔ حدیث کے درجات قائم کر دیئے کہ اگر حدیث مرفوع متصل ہے اور طبقہ میں کم سے کم تین تین آدمی روایت کرتے آ رہے ہیں اس کو متواتر کہا۔ جو مورثِ یقین ہوتی ہے، اس کے منکر کو جاحد کہا کہ وہ کفر میں مبتلا ہے۔ اس سے دوسرا درجہ خبرِ مشہور کا ہے کہ کم سے کم دو دو آدمی صحابی سے لے کر اب تک روایت کرتے آ رہے ہوں۔ کہیں زیادہ ہو جائیں تو مضائقہ نہیں مگر دو سے کم نہ ہوں، وہ حدیث مشہور کہلاتی ہے۔ یہ مورثِ ظنِ غالب ہے جو قریب یقین کے ہوتا ہے۔ تیسرا درجہ خبرِ واحد کا رکھا کہ ایک ایک آدمی روایت کرتا آ رہا ہو۔ درمیان میں بڑھ جائے تو مضائقہ نہیں مگر ایک سے کم نہ ہو، یہ خبرِ واحد یا خبرِ وحید کہلاتی ہے۔ یہ مورثِ مطلق ظن ہوتی ہے۔ اس کا منکر کافر تو نہیں ہوتا مگر فسق میں ضرور مبتلا ہو جاتا ہے۔ تو خبر مرفوع متصل، متواتر، مشہور، خبرِ واحد۔ پھر اس کے بعد اگر بیچ میں انقطاع آئے تو منقطع۔ اگر صحابی کی جگہ پہ انقطاع آئے تو مرسل، بیچ میں انقطاع مسلسل دو راویوں کا آئے تو معضل، غرض اقسامِ حدیث بیان کی گئی ہیں کہ حدیث مشہور ہے، متواتر ہے، معضل ہے، مشکل ہے، مجمل ہے، مجہول ہے۔ ہر ایک کا الگ الگ درجہ بتلایا کہ کس درجے میں اس کی تحقیق ہے۔ بہرحال محدثین نے ایسے کانٹے اور میزانیں بنا کر دیں کہ کوئی بوالہوس خلط ملط نہیں کر سکتا، اس کانٹے پہ ناپ کر پانی الگ اور دودھ الگ کر دیا جاتا ہے، نکھار دیا جاتا ہے۔

انتخابِ احادیث...... امام بخاریؒ اس میں یدطولیٰ رکھتے ہیں اور کتاب میں سات لاکھ احادیث میں سے سات ہزار حدیثیں منتخب کی ہیں۔ اگر مکررات کو ملا دیا جائے تو سات ہزار پہنچتی ہیں، مکررات کو حذف کر دیا جائے تو چار ہزار سے اوپر پہنچتی ہیں جو روایتیں اس کتاب میں جمع کی گئی ہیں بہرحال مصنف بھی جلیل القدر اور کتاب بھی جلیل القدر۔

شانِ قبولیت...... خود مصنف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ "جَعَلْتُهُ بَيْنِي وَبَيْنَ اللّٰهِ حُجَّةً" ① میں نے اس کتاب کو اپنے اور اپنے خدا کے درمیان حجت قرار دیا ہے۔

حجت اور دستاویز سے مقدمہ ختم ہو جاتا ہے۔ آدمی کامیاب ہوتا ہے اور مقبول ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ مقبولیت کے لئے یہ حجت ہے۔ انشاء اللہ مصنف بھی مقبول اور جو جو کتاب کو پڑھتے ہیں اور حجت جان کر پڑھتے ہیں، وہ بھی انشاء اللہ عند اللہ مقبول ہیں۔ ان کے لئے یہ دستاویز ہے۔ یہ گویا کتاب کی شان ہے۔

موضوعِ کتاب...... اس کا موضوع اقوال و افعالِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ آپ نے جو زبان مبارک سے ارشاد فرمایا یا عمل کر کے دکھلایا یا کسی کے عمل پر سکوت فرمایا۔ یہ سکوتِ رضا ہے یہ سب احادیث میں داخل ہیں۔

عصمتِ انبیاء علیہم السلام...... اس لئے کہ نبی کا قول اور فعل ہی شریعت ہوتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام دین کے بارے میں معصوم پیدا فرمائے گئے ہیں اور اہلسنت والجماعت کا مذہب یہ ہے کہ قبل از نبوت بھی معصوم ہیں اور بعد از نبوت بھی معصوم ہیں معصومیت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ مجبور کر دیئے گئے ہیں کہ گناہ نہ کریں۔ قوتیں ساری موجود ہیں۔ مگر مخالفتِ نفس کی اتنی قوت ہے کہ کوئی ایک درجہ بھی رضائے حق کے خلاف نہیں ہو سکتا۔ قوتِ نفس اور مقاومتِ نفس اتنی ہے کہ شوائبِ نفس باقی نہیں رہے، مغلوب ہو گئے ہیں۔

بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ انبیاء علیہم السلام کا نفس اتنا مطمئن ہوتا ہے کہ جو نفس میں خواہش آتی ہے وہ بھی پاک ہی آتی ہے۔ غیر پاک یا ناپاک آتی ہی نہیں۔ اتنے پاک اور صاف انبیاء علیہم السلام کے قلوب پیدا کئے گئے ہیں، جس کو صدیقہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آپ کی عجیب شان ہے" إِنَّ رَبَّكَ يُسَارِعُ فِي هَوَاكَ" ②

آپ کی ہر خواہش کے پورا کرنے میں حق تعالیٰ اتنی جلدی فرماتے ہیں کہ ادھر دل میں خواہش آئی اور ادھر پوری ہوئی۔ وہ یہ ہے کہ نبی کے قلب میں خواہش ہی پاک آتی ہے۔ جب نبی کو مخلی بالطبع چھوڑ دیں گے تو خیر ہی کی طرف طبیعت جائے گی، شر کی طرف نہیں جائے گی۔ تو خیر غالب ہوتی ہے اور ہوائے نفس اس کے تحت ہوتی ہے، ہر خواہشِ نفس میں انبیاء علیہم السلام کو رضائے حق کا دھیان ہر وقت رہتا ہے۔ کسی وقت بری خواہش ان کے قلب میں آتی ہی نہیں۔ "إِنَّ رَبَّكَ يُسَارِعُ فِي هَوَائِكَ"

حفاظتِ اولیاء...... اور انبیاء علیہم السلام کے طفیل سے اور ان کی جوتیوں کی برکت سے انبیاء علیہم السلام کے خدام میں بھی ایسے لوگ پیدا ہوتے ہیں کہ ان کے نفوس بھی مطمئن ہیں اور ان کی ہر خواہش پاک ہوتی ہے۔ جیسے

---

① تهذيب الكمال للعلامة المزي، فصل في ماروي عن الائمة في فضيلة هذه الكتب الستة، ج: ١ ص: ١٢٧.

② الحديث اخرجه الامام البخاري في صحيحه ولفظه: ما ارى ربك الا يسارع في هوائك، كتاب التفسير، باب قوله تعالى ترجي من تشاء ج: ١٣ ص: ٢٧٣ رقم: ٤٣١٣.

حدیث میں ہے، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں فرمایا کہ: "اَلْحَقُّ يَنْطِقُ عَلٰى لِسَانِ عُمَرَ" ① "عمر کی زبان پر حق بولتا ہے"۔ "دَارَ الْحَقُّ مَعَهٗ حَيْثُ دَارَ" "جدھر عمر جاتے ہیں، حق بھی ادھر جاتا ہے"۔

تو بظاہر تو یہ ہوتا کہ جدھر حق جاتا ہے ادھر عمر جاتے ہیں اور فرمایا جا رہا ہے کہ جدھر عمر جاتے ہیں، حق ادھر جاتا ہے۔ یہ انتہائی مقام ہے۔ اور مبتدی کا مقام یہ ہے کہ جدھر حق چلے ادھر ہی مبتدی بھی چلے۔ لیکن جب اس مشق کے بعد منتہی ہوتا ہے، پھر وہ جدھر جاتا ہے، حق ادھر ہی جاتا ہے، اس لئے قلب پاک اور مطمئن بن جاتا ہے اس میں وہ چیز ہی آتی ہے جو حق ہوتی ہے، ناحق چیز نہیں آتی۔ انبیاء علیہم السلام کے خدام میں ایسے لوگ موجود ہیں کہ جدھر جھک جائیں حق بھی ادھر جاتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی شان تو بہت بلند و بالا ہے۔

بہر حال نبی، کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول و فعل اور سکوت سب شریعت ہے، اس لئے کہ وہ پاک ہی پاک ہے، خیر ہی خیر ہے۔ تو اس فن کا موضوع اقوالِ نبیؐ، افعالِ نبیؐ اور رضائے نبویؐ ہے۔

غرضِ کتاب...... اس کے پڑھنے کی غرض و غایت کیا ہے؟ رضائے خداوندی حاصل کرنا، آخرت کی کامیابی اور دنیا کی فلاح ہے۔ دارین کی فلاح اگر حاصل کرنی ہو تو فن حدیث کی طرف آدمی متوجہ ہو۔ یہ بالکل ایسی ہی صورت ہے جیسے ہم اور آپ اور دنیا کا کوئی بھی انسان بغیر نبی کے توسل کے خدا تک نہیں پہنچ سکتا۔

وساطتِ حدیث...... اگر انبیاء علیہم السلام کا واسطہ بیچ میں نہ ہو تو کوئی بھی خدا رسیدہ نہیں ہو سکتا۔ یہ انبیاء علیہم السلام ہی کا صدقہ ہے کہ بیچ میں آ کر بندے کو خدا سے جوڑ دیتے ہیں۔ تو انبیاء علیہم السلام ادھر بھی واسطہ، ادھر بھی واسطہ۔ ادھر مخلوق میں شامل، ادھر اللہ سے واصل۔ تو بیچ میں جو بھی آ جائے گا، اسے اللہ سے واصل کر دیں گے۔ بغیر نبی کے واسطے کے کوئی بھی انسان خدا تک نہیں پہنچ سکتا۔

اسی طرح سے لوگوں کا علمی کلام قرآن سے نہیں جڑ سکتا۔ جب تک بیچ میں کلامِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا واسطہ نہ ہو۔ تو حدیثِ نبوی قرآن سے لیتی ہے، فقہاء کو دیتی ہے۔ اگر فقیہ کے کلام اور قرآن کریم کے بیچ میں حدیث نہ ہو تو فقہاء کا کلام قرآن کریم سے نہیں جڑ سکتا، جیسے افراد اللہ سے بغیر نبی کے واسطے نہیں جڑ سکتے ایسے ہی کلام الناس بھی بغیر کلامِ رسول کے واسطے کے کلامِ خداوندی سے نہیں جڑ سکتا۔ تو حدیث بیچ میں واسطہ ہے۔ قرآن سے لیتی ہے اور فقہاء کو دیتی ہے۔

بیان القرآن...... اسی واسطے حدیث کو بیانِ قرآن کہا گیا ہے۔ ایک قرآن ہے اور ایک بیانِ قرآن ہے۔ قرآن کریم تو وہ کلمات اور الفاظ ہیں جو منزل من اللہ ہیں ان کے معنی بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر خود

---

① الحديث اخرجه الامام ابن ماجه رحمه الله تعالى في سننه: عن ابي ذر رضي الله عنه قال: سمعت رسول الله ﷺ يقول: ان الله وضع الحق على لسان عمر. كتاب السنة، باب فضل عمر رضي الله عنه، ج: ١ ص: ١١٩، رقم: ١٠٥.

ہی اللہ تعالیٰ نے اتارے۔ تو قرآن لفظوں اور معنی کا مجموعہ ہے۔ لفظ بھی منزل من اللہ ہیں اور معنی بھی منزل من اللہ ہیں۔ یہ نہیں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی فکر اور سوچ سے قرآن کے معانی متعین کئے ہوں کہ یہ مطلب ہوسکتا ہے۔ اس مطلب کو بھی اللہ ہی نے واضح کیا ہے۔ تو لفظ بھی اللہ کے ہیں، معنی بھی اللہ کے ہیں۔

چنانچہ ابتداء میں یہ تھا کہ جب وحی نازل ہوتی تو جلدی جلدی رٹنا شروع کر دیتے کہ کہیں بھول نہ جاؤں۔ تو حق تعالیٰ نے فرمایا کہ: ﴿لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ﴾ ① "آپ جلدی نہ کریں۔ آپ کو یہی تو ڈر ہے کہ آپ بھول نہ جائیں"۔ فرمایا: ﴿إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ﴾ ② ہمارے ذمہ ہے کہ ہم آپ کے سینے میں جمع بھی کر دیں اور آپ کی زبان سے پڑھوا بھی دیں۔ اس کی فکر نہ کریں۔ ﴿فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ﴾ ③ جب ہم قرات کریں۔ از خود یا بواسطہ ملک کے۔ آپ سنتے رہیں۔ ہمہ تن گوش ہو کر اسے جذب کریں۔ دھیان نہ کریں، نہ عقل لڑائیں نہ حواس کو دخل دیں۔ صرف جذب کریں۔ آگے اس کا جمع کرنا، پڑھوانا اور جمع کر دینا یہ ہمارے ذمہ ہے۔ تو الفاظ سے جمع کرنے کی اور زبان سے پڑھوا دینے کی گارنٹی حق تعالیٰ نے دی۔ ﴿إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ﴾

اس کے بعد پھر فرماتے ہیں: ﴿ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ﴾ ④ پھر ہمارے ہی ذمہ ہے اس کو کھول دینا بھی کہ اس کے معنی کیا ہیں؟ اس کا مطلب کیا ہے؟ اس کی مراد کیا ہے؟ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم الفاظ میں بھی امین ہیں اور معنی میں بھی امین ہیں۔ پوری امانت کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے کلمات بھی پہنچا دیے اور حق تعالیٰ کے کلام سے جو مرادات ہیں، وہ بھی بندوں تک پہنچا دیں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم امین ہی امین ہیں۔

اہمیت فن حدیث…… بہر حال قرآن کریم اور کلام فقہاء کے درمیان اگر اتصال کا واسطہ ہے تو وہ حدیث ہے۔ اگر حدیث بیچ میں نہ ہو تو کلام فقہاء کا حدیث سے کوئی جوڑ نہیں لگ سکتا۔ جیسا کہ بندوں اور خدا کے درمیان اگر انبیاء علیہم السلام کا واسطہ نہ ہو تو کوئی بندہ اپنے خدا سے مربوط نہیں ہوسکتا۔ اس واسطے اسلام میں فن حدیث کی اہمیت ہے۔ اور یہ دنیا میں اعلیٰ ترین اور اشرف ترین فن شمار کیا گیا ہے۔ تو اس فن میں اعلیٰ ترین کتاب یہ ہے، جس کا نام بخاری ہے۔ جسے اللہ اور بندے کے درمیان امام بخاریؒ نے حجت قرار دیا ہے۔ وہ آج شروع ہو رہی ہے۔ شروع میں اس میں چند مباحث ہیں۔ جو اکثر حضرات اساتذہ بیان کرتے ہیں۔

حمد و نعت سے ابتداء نہ کرنے کی وجہ…… پہلی بات تو یہ کہ عام کتابوں کا طریقہ یہ ہے کہ کتابیں حمد و نعت سے شروع کی جاتی ہیں۔ خطبہ ماثورہ ہوتا ہے۔ "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ" الخ اس میں حمد ہوتی ہے نعت بھی ہوتی ہے۔ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوۃ و سلام ہوتا ہے۔ امام بخاریؒ نے یہ نہیں کیا بس بسم اللہ سے کتاب شروع کر دی۔ تو ایک عام شبہ اور اعتراض کیا جاتا ہے کہ امام بخاریؒ نے عام مروجہ طریق کے خلاف کیوں

---

① پارہ: ۲۹، سورۃ القیامۃ، الآیۃ: ۱۶۔ ② پارہ: ۲۹، سورۃ القیامۃ، الآیۃ: ۱۷۔

③ پارہ: ۲۹، سورۃ القیامۃ، الآیۃ: ۱۸۔ ④ پارہ: ۲۹، سورۃ القیامۃ، الآیۃ: ۱۹۔

کیا؟ لیکن حقیقت میں یہ کوئی اعتراض نہیں۔ اس لئے کہ سب سے پہلے یہ سوال کیا جائے گا کہ اس اعتراض کا منشاء کیا ہے۔ امام بخاریؒ نے کس حدیث یا نص کی خلاف ورزی کی ہے؟ بظاہر ایک رواج کی خلاف ورزی کر دی، تو رواج کوئی حجت قطعہ تو نہیں تھا کہ امام خواہ مخواہ اس کی پابندی کرتے؟ تو اصل منشاء کیا ہے؟

تو منشاء یہ ذکر کیا جاتا ہے کہ ”كُلُّ اَمْرٍ ذِيْ بَالٍ لَمْ يُبْدَءْ بِبِسْمِ اللّٰهِ تَعَالٰى فَهُوَ اَقْطَعُ“ جو مہتم بالشان کام خدا کے نام سے شروع نہ کیا جائے وہ مقطوع البرکۃ ہوتا ہے۔ یہ حجت تھی۔ لیکن چھ طریقوں سے یہ حدیث روایت کی گئی ہے اس کے کلمات مختلف ہیں: ایک صیغہ ”كُلُّ اَمْرٍ ذِيْ بَالٍ لَمْ يُبْدَءْ بِبِسْمِ اللّٰهِ تَعَالٰى فَهُوَ اَقْطَعُ“ دوسرا صیغہ یہ ہے: ”كُلُّ اَمْرٍ ذِيْ بَالٍ لَمْ يُبْدَءْ بِبِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ فَهُوَ اَقْطَعُ“ ① تیسرا صیغہ یہ ہے: ”كُلُّ اَمْرٍ ذِيْ بَالٍ لَمْ يُبْدَءْ بِذِكْرِ اللّٰهِ تَعَالٰى فَهُوَ اَقْطَعُ“ ② اسی طرح سے اور بھی ہیں جو تقریباً چھ صیغے ہیں۔ تو سب میں قدر مشترک یہ نکلتا ہے کہ ”ذِكْرُ اللّٰهِ“ سے آغاز کیا جائے۔ اس میں بِسْمِ اللّٰهِ بھی آ گئی اِسْمُ اللّٰهِ بھی آ گیا ذِكْرُ اللّٰهِ بھی آ گیا۔ ان کا قدر مشترک یہ ہے کہ اللہ کے ذکر سے آغاز ہو۔ تو مصنف نے بِسْمِ اللّٰهِ سے آغاز کر دیا۔ اس میں اعتراض کی کیا بات ہے۔ بسم اللہ بھی تو ذکر ہے اور اعلیٰ ترین ذکر ہے۔ پھر انہوں نے شبہ کیا کہ اگر لکھ دیتے تو کیا حرج تھا؟ تو سوال یہ ہے کہ نہ لکھتے تو کیا حرج تھا؟

حدیث میں یہ ہے کہ ”كُلُّ اَمْرٍ ذِيْ بَالٍ لَمْ يُبْدَأْ“ الخ..... کوئی مہتم بالشان کام جس کو ذکر اللہ سے شروع نہ کیا جائے مَقْطُوْعُ الْبَرَكَةِ ہے۔ تو اس حدیث میں لَمْ يُبْدَءْ کا لفظ ہے لَمْ يُكْتَبْ کا لفظ تو نہیں ہے کہ کوئی اَمْرٍ ذِيْ بَالٍ کے شروع میں اگر بِسْمِ اللّٰهِ نہ لکھی جائے وہ مَقْطُوْعُ الْبَرَكَةِ ہوتا ہے لَمْ يُبْدَءْ شروع نہ کیا جائے۔ اب خواہ زبان سے شروع کر دے، لکھ کر شروع کر دے، دل سے شروع کر دے۔ حدیث پر عمل ہو جائیگا۔ تو مصنفؒ نے اگر نہیں لکھا تو حمد و ثناء زبان سے کہہ دی ہوگی۔

ہر حدیث کی ابتداء میں اذکار عشرہ..... اور میں تو یہ کہتا ہوں۔ کسی کتاب میں تو نہیں دیکھا مگر بہر حال قواعدِ فن کے بھی خلاف نہیں۔ کہ امام بخاریؒ کا طریق یہ ہے جو راویوں نے نقل کیا ہے کہ امام نے مکہ مکرمہ (زَادَهَا اللّٰهُ شَرَفًا وَّ كَرَامَةً) میں سولہ برس گزارے ہیں اور وہیں بخاریؒ کی تکمیل فرمائی ہے۔ اس دوران میں اور بھی سفر ہوئے مگر مستقر مکہ مکرمہ رہا، یہاں بیٹھ کر بخاری کی تکمیل کی ہے اور تکمیل بھی اس طرح سے کی ہے کہ ہر حدیث لکھنے سے پہلے غسل کرتے۔ پھر دو رکعت نفل پڑھتے۔ جب انشراح تام ہو جاتا تب حدیث نقل کرتے، تو ہر حدیث کو نماز اور غسل سے شروع کیا ہے۔ اور نماز اذکار عشرہ کا مجموعہ ہے۔ نماز کے اندر بِسْمِ اللّٰهِ بھی ہے، اَعُوْذُ بِاللّٰهِ بھی ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر صَلٰوۃ و سلام بھی ہے، تکبیر بھی ہے، تحمید بھی ہے، تسبیح بھی ہے، تہلیل

---

① کنز العمال، ج: ۱۰ ص: ۵۵۵، رقم: ۲۳۹۰. (عبدالقادر الدهلوی فی الاربعین عن ابی هریرةؓ)

② مسند احمد، مسند ابی هریرة رضی الله عنه، ج: ۱۷ ص: ۳۹۷.

بھی ہے جو اذکارِ عشرہ کہلاتے ہیں اور دین میں معروف ہیں وہ سارے اذکار جمع کئے، طاعت وعبادت کی ساری قسمیں جمع کیں۔ تو میں کہتا ہوں کہ آپ یہ کہتے ہیں کہ امام بخاریؒ نے ذکر سے ابتداء نہیں کی۔ میں کہتا ہوں کہ بخاری نے ایک ایک حدیث میں نماز اور اذکارِ عشرہ سے ابتداء کی ہے۔ اس سے زیادہ اور آپ امام بخاریؒ سے کیا چاہتے ہیں؟۔ اگر کتاب میں اذکارِ عشرہ نہیں لکھے۔ تو ہر حدیث کی ابتداء میں اذکارِ عشرہ کئے ہیں۔ اس کے بغیر حدیث نہیں لکھی۔ لَمْ يُكْتَبْ کا لفظ تو ہے نہیں لَمْ يُبْدَأْ کا لفظ ہے اور بدایت اس طرح سے کی کہ ایک ایک حدیث کے لکھنے سے پہلے نماز پڑھ لی۔ ہر نماز میں سارے اذکار ادا کئے، تو آپ کہتے ہیں کہ امام بخاریؒ نے ذکر سے شروع نہیں کیا، میں کہتا ہوں کہ ہر ہر حدیث کو اذکارِ عشرہ سے شروع کیا ہے۔ اس کی کوئی نظیر بتلائے۔ یہ کیا اعتراض کی بات ہوئی۔؟ غرض اس میں مصنفؒ پر کوئی شبہ نہیں پڑتا۔

ابتداءِ کتاب میں اتباعِ سنت کا اہتمام...... اب آگے اگر کوئی یہ سوال کرے کہ اذکار میں بِسْمِ اللهِ بھی داخل ہے "اَلْحَمْدُلِلّٰهِ بھی داخل ہے تو بِسْمِ اللهِ ہی کی کیوں تخصیص کی؟ اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ کیوں نہ لکھ دیا۔؟ اس قسم کے سوالات طالبعلمانہ ہوتے ہیں کہ لکھا کیوں نہیں؟ فقط بِسْمِ اللهِ ہی کیوں لکھی؟

تو میں کہتا ہوں کہ اس میں بھی امام بخاریؒ نے اتباعِ سنت کیا ہے۔ اس لئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادتِ شریفہ یہ تھی کہ جب آپ منبر پر وعظ اور خطاب فرماتے تو پورا خطبہ ماثورہ پڑھتے "اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ" الخ اور جب سلاطین کو دعوتِ اسلام کا فرمان بھیجتے تو اس میں فقط بِسْمِ اللّٰهِ ہوتی تھی اس کے بعد "مِنْ مُحَمَّدِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ اِلٰى فُلَانٍ اِلٰى فُلَانٍ" تو عادتِ کریمہ یہ تھی کہ خطبات اور مواعظ کے شروع میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم پورا خطبۂ ماثورہ پڑھتے اور فرامین لکھتے تو فقط بسم اللہ پر اکتفاء فرماتے۔ تو امامؒ نے دیکھا کہ حدیثیں فی الحقیقت فرامین ہیں جو امت کے نام بھیجے گئے ہیں۔ تو بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ سے ابتداء کی۔

ترجمۃ الباب اور حدیث میں مناسبت...... اب یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ باب رکھا "كَيْفَ كَانَ بَدْءُ الْوَحْيِ" وحی کا آغاز کیسے ہوا؟ اور حدیث لائے "اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ." دوسری حدیث میں جس میں وحی کی کیفیت ذکر کی گئی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: وحی اس طرح سے میرے اوپر آتی ہے، "يَأْتِيْنِيْ مِثْلَ صَلْصَلَةِ الْجَرَسِ" جیسے گھنٹہ بجانے کے بعد جو گونج پیدا ہوتی ہے بس اس قسم کی آواز سنتا ہوں، اس میں سے پھر حروف متمیز ہوتے ہیں۔ تو اگر بَدْءُ الْوَحْيِ کا باب رکھا تھا تو اگلی حدیث لانی چاہئے تھی، یہ بیچ میں "اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ" کا کیا ذکر؟ تو ترجمة الباب میں اور حدیث میں کوئی مناسبت قائم نہیں ہوتی، یہ ایک سوال کیا جاتا ہے۔ حالانکہ مصنف کا طریق یہ ہے کہ ترجمۃ الباب وہ رکھتے ہیں جو بعد میں حدیث لاتے ہیں۔ تو حدیث میں اور ترجمۃ الباب میں کامل مناسبت ہوتی ہے۔ یہاں بظاہر کوئی مناسبت نہیں معلوم ہوتی۔ کہاں بَدْءُ الْوَحْيِ اور کہاں "اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ" کہ عمل نیت سے ہوتا ہے۔

لیکن اگر غور کیا جائے تو کامل مناسبت ہے۔ اس واسطے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر جب وحی آتی ہے۔ تو نبی کے قلب میں پہلا جذبہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ جتنا جلد ہو سکے اسے امت تک پہنچاؤں۔ یہی تو نیت تھی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نیت یہ ہوتی ہے کہ اس وحی کا تحمل بھی کروں اور امت کے لیے اس وحی کی ادائیگی بھی کروں۔ نزول وحی کے وقت انبیا علیہم السلام کی یہی دو نیتیں ہوتی ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ وحی کے نزول کے وقت سب سے پہلی چیز جو قلب نبوت میں آتی ہے وہ نیت ہے یا وحی کا انجذاب ہے۔ تو "بَدْءُ الْوَحْيِ" کو "إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ" ① سے کامل مناسبت ہوئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک میں وحی کے اترنے کے وقت یہ نیت تھی کہ میں اسے جذب کروں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم رٹنے لگتے تھے جس سے حق تعالیٰ نے روک دیا کہ ﴿لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ﴾ ② آپ صلی اللہ علیہ وسلم جلدی نہ کریں۔ ہم آپ کے قلب مبارک میں جمع کر دیں گے"

تو قلب مبارک میں پہلی نیت تو یہ آئی کہ میں اس وحی کو اپنے اندر جذب کر لوں اور ایسا یاد رکھوں کہ بھول نہ سکوں۔ تو سب سے پہلی نیت نبی کے قلب میں یہ آتی ہے کہ اس کا تحمل کر لوں اور اسے جذب کر لوں، اسے جزو نفس کر لوں۔ اس کے بعد دوسری نیت یہ ہوتی ہے کہ اسے مخلوق کی طرف پہنچاؤں اور اس امانت کو ادا کر دوں۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ وحی کو نیت سے کامل مناسبت ہے۔ نبی پر جب وحی آتی ہے تو سب سے پہلے قلب کے اندر نیت کا انضباط ہوتا ہے اس واسطے اگر بدء الوحی کے نیچے "إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ" لائے تو کامل مناسبت پیدا ہوگئی کہ یہی حدیث لانی چاہیے۔ تو پوری مناسبت ہے۔ یہ کوئی شبہ واعتراض کی بات نہیں۔

"كَيْفَ كَانَ بَدْءُ الْوَحْيِ" "وحی کی ابتداء کس طرح سے ہوئی؟" کس طرح سے وحی آئی؟ یہ تو اللہ کا فعل ہے کہ کس طرح سے وحی بھیجی؟ نبی کا فعل یہ ہے کہ جب وحی آئی تو نبی نے کیا نیت کی؟ یہ کہ اس کا تحمل بھی کروں اور ادائیگی بھی کروں۔ تو نیت اور وحی میں کامل مناسبت ہے۔

مثلاً آپ کے سامنے اگر وحی قرآنی پیش کی جائے یا وحی حدیثی پیش کی جائے تو سب سے پہلے آپ کے دل میں نیت ہی تو آتی ہے کہ اسے مان لوں۔ ماننے کے بعد یہ نیت آتی ہے کہ اس پر عمل بھی کروں، اس کے برکات اور فوائد بھی حاصل کروں۔ تو وحی کو نیت سے اتنی مناسبت ہے کہ درجہ اوّل میں وحی ہے اور درجۂ دوم میں نیت ہے۔ بالکل مطابقت ہے۔

امام رحمۃ اللہ علیہ کا تفقہ...... تو امام بخاری نے "كَيْفَ كَانَ بَدْءُ الْوَحْيِ" کا باب رکھ کر پھر حدیث "إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ" کا ذکر کیا، اس سے کمال مناسبت ظاہر ہوتی ہے کہ وحی نمبر اوّل ہے اور نیت نمبر دوم ہے تو ان

---

① الصحیح للبخاری، کتاب بدء الوحی، باب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ ﷺ، ج: ۱، ص: ۲، رقم: ۱.

② پارہ: ۲۹، سورۃ القیامۃ، الآیۃ: ۱۶.

میں کامل تطبیق ہے۔ اس واسطے بدء الوحی کے تحت میں حدیثِ مذکور کا آنا برمحل اور بہت موزوں ثابت ہوا۔

اس سے گویا امام بخاریؒ کے تفقہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ تو امام بخاریؒ فقط محدّث ہی نہیں تھے بلکہ فقیہ بھی تھے۔ فقط روایت ہی سامنے نہیں تھی بلکہ درایت بھی سامنے تھی۔ حدیث کے الفاظ ہی سامنے نہیں تھے بلکہ حدیث کے معانی اور حدیث کے حقائق اور معارف بھی ان کے قلب میں موجود تھے۔ تو امام بخاریؒ روایت اور درایت دونوں کے جامع ہیں۔ اسی واسطے علماء لکھتے ہیں کہ "فِقْهُ الْبُخَارِيْ فِيْ تَرَاجِمِهٖ"۔ امام بخاریؒ کا فقہ اگر دیکھنا ہو تو ان تراجم کو دیکھو جو باب رکھتے ہیں، مثلاً یہی "بَابُ كَيْفَ كَانَ بَدْءُ الْوَحْيِ بَابُ الْاِيْمَانِ، بَابُ الصَّلٰوةِ" وغیرہ۔ اور ان کے نیچے روایتیں لاتے ہیں۔ تو امام بخاریؒ کا اگر فقہ دیکھنا ہو تو ابواب و تراجم کو دیکھو۔ اس سے تفقہ معلوم ہوگا۔

درجۂ اجتہاد...... یہی وجہ ہے کہ امام بخاریؒ اجتہاد کا درجہ رکھتے ہیں۔ ویسے معروف تو یہ ہے کہ وہ شافعی ہیں اور اکثر اعمال میں ہیں بھی شافعی۔ لیکن احادیث میں جب غور کیا جاتا ہے اور ان کی رائے معلوم ہوتی ہے تو بعض راؤں میں فقہ حنفی کو ترجیح دیتے ہیں اور بعض میں امام شافعیؒ کی فقہ کو اور بعض میں امام مالکؒ کی فقہ کو مختلف مذاہب کی ترجیحات ذکر کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خود صاحبِ اجتہاد ہیں۔ خود مستقل ان کی ایک رائے ہے۔ تو محض مقلد ہی نہیں بلکہ مجتہد بھی ہیں۔ جس درجہ کا بھی اجتہاد ہو مگر اجتہاد ہے۔ تو ان کا تفقہ تراجم و ابواب کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے تو میں کہتا ہوں کہ "بَابُ كَيْفَ كَانَ بَدْءُ الْوَحْيِ" یہ ترجمہ ہے اور اس کے نیچے "اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ" کی حدیث لائے، اس سے تفقہ کا اندازہ ہوتا ہے کہ وحی اور نیت کی کیسی تطبیق ان کے قلبِ مبارک میں آئی کہ وہی حدیث ذکر کی جو بَدْءُ الْوَحْيِ کے ساتھ زیادہ مناسب تھی۔ بہر حال امام بخاریؒ نے اگر بِسْمِ اللّٰهِ سے آغاز کیا تو اتباعِ سنت کیا۔ ابتداء میں میں بَدْءُ الْوَحْيِ کا ذکر لائے تو مادۂ شریعت کا ذکر کیا جس کا مقام اوّلیت کا ہے پھر بَدْءُ الْوَحْيِ کے ساتھ "اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ" کو لائے، اس سے تفقہ معلوم ہوتا ہے کہ وحی کو نیت سے کتنی کامل مناسبت ہے۔

تشریحِ حدیث...... اس کے بعد حدیث نقل کی "اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ وَ اِنَّمَا لِامْرِئٍ مَّا نَوٰى فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهٗ اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ فَهِجْرَتُهٗ اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهٗ اِلٰى دُنْيَا يُصِيْبُهَا اَوِ امْرَاَةٍ يَّتَزَوَّجُهَا فَهِجْرَتُهٗ اِلٰى مَا هَاجَرَ اِلَيْهِ۔"

اصلِ کلی...... اس حدیث کے تین جز ہیں۔ سب سے پہلا جز "اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ" ہے۔ یہ ایک اصلِ کلی ہے جس میں کسی عمل کی طرف اشارہ نہیں۔ حاصل اس کا یہ ہے کہ عمل نیت سے ہے۔ نیت اچھی عمل اچھا۔ نیت بری عمل برا۔ عمل نیت کے تابع ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ: "اِنَّمَا ثَوَابُ الْاَعْمَالِ بِالنِّيَّاتِ" عمل پر جو ثواب ملتا ہے وہ نیت ہی سے ملتا ہے اور بعض نے کہا: "اِنَّمَا صِحَّةُ الْاَعْمَالِ بِالنِّيَّاتِ" جب تک نیت نہ ہو عمل صحیح نہیں ہوتا۔ ہر ایک چیز پر اعتراض پڑتا ہے اس واسطے کہ شریعت کے بعض اعمال ایسے ہیں کہ نیت نہ ہو تب بھی شریعت معتبر

مان لیتی ہے، ایک شخص جنبی ہے، بلا نیت کے دریا میں کود گیا۔ شریعت نے اس عمل کو معقول سمجھا۔ وہ پاک ہو گیا۔ نماز ادا کر سکے گا، یا ایک شخص نے وضو کیا، نیت کچھ نہیں کی۔ لیکن اس کا وضو مفتاحِ صلوۃ بن جائے گا۔ شریعت اس کو معتبر مانے گی۔ تو یہ کہنا کہ "اِنَّمَا صِحَّةُ الْاَعْمَالِ بِالنِّيَّاتِ" عمل نیت کے بغیر صحیح نہیں ہوتا، یہ چلنے والا اصول نہیں ہے، بہت سے اعمال ایسے ہیں جو صحیح ہو جاتے ہیں اور شریعت میں معتبر ہو جاتے ہیں حالاں کہ نیت نہیں ہوتی۔

البتہ یہ ضرور ہے کہ عمل کا ثواب اس وقت تک نہیں ملتا جب تک کہ نیت نہ ہو۔ اگر بلا نیت کے وضو ہوا تو مفتاحِ صلوۃ تو بن جائے گا مگر اجر نہیں ملے گا جب تک تقرب کی نیت نہ ہو۔ نماز اس درجہ میں صحیح ہے۔

اور اس سے بھی زیادہ عام یہ ہے کہ جیسی نیت ویسا عمل، نیت اچھی تو عمل اچھا، نیت بری تو عمل برا۔ تو "وُجُوْدُ الْاَعْمَالِ یا صِحَّةُ الْاَعْمَالِ" تو صحیح نہیں ہوگا۔ البتہ ثَوَابُ الْاَعْمَالِ اس درجہ میں صحیح ہوگا، یا پھر اعتبار کا لفظ (مقدر مانا جائے) کہ "اِنَّمَا تُعْتَبَرُ الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ"۔ عمل کا اعتبار نیت سے ہے، جیسی نیت ویسا عمل۔ بہر حال سب معنی محدثین نے ذکر کئے ہیں۔ تو پہلا جملہ "اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ" یہ ایک اصلِ کلی ہے۔ اس میں کسی عمل کا ذکر نہیں۔ جو بھی عمل ہو وہ "اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ" کے نیچے آ جائے گا تو ایک اصلِ کلی ذکر فرمایا۔

انتفاعِ نیت...... اس کے بعد دوسرا جملہ "وَاِنَّمَا لِامْرِءٍ مَّا نَوٰی" ہے، جیسی نیت کرے گا، وہی صلہ ملے گا۔ یہ دراصل ایک سوال کا جواب ہے۔ کیوں کہ جب آپ نے نیت کی تو سوال یہ پیدا ہوا کہ اس نیت پر کوئی فائدہ بھی مرتب ہوگا یا خالی نیت ہی کر لی ہے۔ کوئی ثمرہ مرتب ہوگا یا نہیں؟ یا قلب کا ایک تخیل ہے کہ ہم نے نیت کر لی۔

تو دوسرے جملے میں اس کا جواب دیا کہ نہیں، اس کا انتفاع بھی ہوگا۔ اگر نیت اچھی ہے تو عند اللہ عمل معتبر ہے۔ اس پر اجر و ثواب مرتب ہوگا اور جیسی نیت کی وہی اس کو ملے گا۔ اگر اللہ و رسول کی قربت کی نیت کی ہے تو تقرب مل جائے گا۔ اگر دنیوی مصالح کی نیت کی ہے تو وہ مصلحت مرتب ہو جائے گی۔ مگر نیت رائیگاں نہیں جائے گی۔ ضرور اس پر ثمرات مرتب ہوتے ہیں۔

ابتداءِ ظہورِ عمل...... اسی واسطے شرعی طور پر فرمایا گیا کہ "نِيَّةُ الْمَرْءِ خَيْرٌ مِّنْ عَمَلِهٖ" ① "آدمی کی نیت اس کے عمل سے بہتر ہے"۔ یعنی عمل کا آغاز نیت سے ہوتا ہے۔ سب سے پہلے دل عمل کرتا ہے جو نیت ہے۔ اس کے بعد ہاتھ، پیر عمل کرتے ہیں۔ وہ ہیئتِ عمل ہے۔ تو سب سے اول عمل کی ابتداء قلب سے ہوتی ہے اور وہ نیت کی صورت میں ہے۔ تو جس نے عمل کی نیت کر لی گویا اس نے اپنے دل سے عمل کر لیا۔ عمل کا ظہور نہیں ہوا وہ ہاتھ پیر سے ہوگا۔ مگر اس پر بھی نفع مرتب ہوتا ہے۔ حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ: ایک شخص نے نیت کی کہ فلاں نیک کام کروں۔ ابھی کیا نہیں تو فرشتہ لکھ دیتا ہے کہ ایک نیکی کر لی۔ اس پر آخرت میں ثواب مرتب ہوگا۔ تو مطلق نیت پر بھی ثواب مرتب ہوتا ہے۔ اگر بدی کی نیت کی تو قیاس کا تقاضا یہ تھا کہ ایک بدی لکھ دیتے، مگر نہیں لکھی جاتی۔ اگر

---

① المعجم الکبیر للطبرانی، باب السین، سهل بن سعد الساعدي، ج: ٦ ص: ١٨٥.

نیت بدل گئی کہ اس بدی کو نہیں کروں گا تو اس رک جانے پر ایک نیکی لکھ دیتے ہیں کہ یہ بھی ایک حسنہ اور نیکی ہے۔ یہ قلب ہی قلب سے معاملہ چل رہا ہے۔ اور نیت پر ثمرات مرتب ہو رہے ہیں۔ تو پہلا جملہ ثواب وعذاب سے قطع نظر محض ایک اصول تھا کہ جیسی نیت ویسا عمل، دوسرے جملے میں انتفاع کی طرف اشارہ ہے کہ یہ رائیگاں نہیں بلکہ جیسی نیت ہوگی ویسے ثمرات مرتب ہوں گے ''وَاِنَّمَا لِامْرِءٍ مَا نَوٰی'' جیسی نیت کرے گا وہ آگے آ جائے گی۔ دنیا کی نیت کرے گا دنیا آ جائے گی۔ آخرت کی نیت کرے گا آخرت آ جائے گی۔

ثمراتِ نیت …… جن کے واقعہ میں یہ حدیث ارشاد فرمائی گئی۔ یعنی حدیث کا شانِ نزول، وہ صحابی ہیں جنہوں نے اس نیت سے مدینہ ہجرت کی تھی کہ فلاں عورت مالدار ہے، ام قیس اس کا نام ہے، اس سے نکاح بھی کریں گے، دولت مند ہے کوئی مال بھی حاصل ہوگا۔ یہ نیت کی اور ہجرت کی۔ اس پر ارشاد فرمایا گیا ''اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ وَاِنَّمَا لِامْرِءٍ مَّا نَوٰی'' ''جو نیت کی ہے وہ ملے گا۔ اگر عورت کی نیت کی ہے وہ مل جائے گی''۔

مگر خدا نہیں ملے گا۔ اگر خدا کی نیت کی ہے تو خدا ملے گا۔ جیسی نیت ویسا ثمرہ۔ تو دوسرے جملہ میں ثمرہ بتلایا گیا ہے کہ یہ نیت رائیگاں نہیں جاتی بلکہ اس سے انتفاع ہوتا ہے، دنیا اور آخرت کا اس سے آدمی نفع اٹھاتا ہے۔

واقعۂ جزئی …… چناں چہ اس صحابی کا لقب ہی ''مُهَاجِرُ اُمِّ قَیْس'' مشہور ہو گیا کہ یہ ام قیس کے مہاجر تھے جو مدینے گئے اور عورت کی نیت کی۔ بعد میں نیت درست کی ہوگی، توبہ کی ہوگی۔ غرض پہلا جملہ اصل کلی ہے، دوسرا جملہ اس اصل سے انتفاع کا بیان ہے کہ آدمی نیت سے منتفع ہوگا۔ جیسی نیت کی ہوگی ویسے ثمرات سامنے آئیں گے۔

اور تیسرا جملہ ایک جزوی مثال کا ہے۔ ''فَمَنْ کَانَتْ هِجْرَتُهٗ اِلَی اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ فَهِجْرَتُهٗ اِلَی اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَنْ کَانَتْ هِجْرَتُهٗ اِلٰی دُنْیَا یُصِیْبُهَا اَوْ اِلَی امْرَاَةٍ یَّتَزَوَّجُهَا فَهِجْرَتُهٗ اِلٰی مَا هَاجَرَ اِلَیْهِ۔'' تو پہلے جملے میں اصول بیان کیا گیا دوسرے جملہ میں انتفاع بیان کیا گیا اور تیسرے جملے میں جزوی مثال بیان کی گئی۔

جامعیتِ حدیث …… اور ظاہر بات ہے کہ یہی تین درجے ہیں کہ جن سے ایک دعویٰ منضبط اور مرتب ہوتا ہے کہ پہلے دعویٰ کرو، پھر اس کی غرض وغایت بیان کرو۔ پھر اس کی ایک حسی مثال بیان کرو۔ تو دعویٰ منقح اور ثابت ہو جاتا ہے۔

تو یہ حدیث جامع ترین حدیث ہے اور جوامع الکلم میں سے ہے۔ جس کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ چھ چیزیں مجھے عطا کی ہیں جو پچھلے انبیاء علیہم السلام کو نہیں دی گئیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے "اُوْتِیْتُ جَوَامِعَ الْکَلِمِ" مجھے جامع جملے دیئے گئے ہیں کہ چھوٹا جملہ بولتا ہوں اور علوم کے دریا اس کے اندر چھپے ہوئے ہوتے ہیں اور ہزار ہا ہزار مسائل اس سے نکل آتے ہیں۔ تو یہ حدیث جوامع الکلم میں سے ہے کہ تین جملے ہیں اور تینوں میں تین علوم ہیں اور الگ الگ تین فوائد ہیں۔ ایک اصل کلی ایک انتفاعی کلیہ اور ایک مثال جزوی۔ غرض یہ حدیث جامع ترین حدیث ہے جس کو حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے منبر پر کھڑے ہو کر ارشاد فرمایا تھا۔

غور کیا جائے تو اس ایک حدیث پر عمل ہو تو آدمی کامیاب ہے۔ ہر چیز میں نیت کر لیا کریں۔ تو دنیا بھی دین

بنتی چلی جائے گی لباس پہنتے ہوئے اگر یہ نیت کر لیں کہ حکم خداوندی کی تعمیل کر رہا ہوں، بدن چھپانا واجب ہے، اب یہ عبادت بن گیا۔ اس پر اجر وثواب مرتب ہوگا۔ کھانا کھاتے ہوئے نیت کرے کہ تقوی علی العبادت کے لئے کھا رہا ہوں کہ قوت پیدا ہو تو اللہ کو یاد کروں پھر یہ سارا کھانا عبادت میں داخل ہو جائے گا۔ گھر میں داخل ہوتے ہوئے یہ نیت کرے کہ اتباع سنت یہ ہے کہ گھر میں سلام اور اللہ کے نام سے داخل ہو تو میں اتباع سنت کر رہا ہوں، یہ گھر میں داخل ہونا عبادت بن جائے گا۔ تو پوری دنیا کو دین بنا لینا یہ نیت سے ممکن ہے۔ بری نیت ہو تو عبادت بھی بری کی اور اعلیٰ نیت ہو تو عادت بھی عبادت بن جاتی ہے۔

یہ حدیث جوامع الکلم میں سے بھی ہے۔ اور دین کا نچوڑ اس میں گویا بیان کر دیا ہے کہ دین کا آغاز نیت ہی سے ہوتا ہے۔ آدمی جب اسلام قبول کرتا ہے تو اس کی نیت یہی تو ہوتی ہے کہ خدا کے دین میں داخل ہو جاؤں۔ تو نیت سے دین کا آغاز ہوا۔ آگے عمل کا درجہ اب باقی ہے۔ یہ جوامع الکلم میں سے بھی ہے اور یہ حدیث دین کا اصل الاصول بھی ہے۔ اس وجہ سے اس کو امام بخاریؒ ابتداء لائے۔

ضروری تنبیہ...... دوسرے یہ بھی ایک فائدہ ہے کہ امامؒ طلباء کے لئے گویا اشارہ کر رہے ہیں کہ جو بخاری پڑھنے کے لئے بیٹھے ہیں، وہ سب ابھی سے اپنی نیت درست کر لیں کہ بخاری کیوں پڑھ رہے ہو؟ اگر صحیح نیت ہے تو آخیر تک یہ دین بنتا جائے گا، اگر نیت غلط کی ہے مثلاً کوئی اس لیے بخاری پڑھ رہا ہوں کہ میں محدث کہلاؤں تو شہرت طلبی مقصود ہوئی، خدا طلبی مقصود نہ ہوئی۔ اگر کوئی اس لئے پڑھ رہا ہے کہ اس کے ذریعے سے دنیا کماؤں تو دنیا حاصل ہوگی آخرت نہیں ملے گی اس واسطے امامؒ نے گویا ابتداء اس کو روایت کر کے طالبانِ علم کے لئے تنبیہ کی ہے کہ سب سے پہلے اپنی نیت درست کرو کہ کیوں بخاری پڑھ رہے ہو؟ تمہاری غرض وغایت کیا ہے؟ جیسی اخیر تک نیت کرو گے، وہی ثمرات مرتب ہوتے چلے جائیں گے۔ تو جوامع الکلم میں سے بھی ہے، دین کی اساس بھی ہے اور ایک مختصر نصیحت جو پورے انسانوں کے دین کے لئے ہے اور جامع بھی ہے۔ اس واسطے امام بخاریؒ کا تقویٰ اور زہد اور اس کے ساتھ ذکاوت اور فطانت کی داد دینی پڑتی ہے کہ کیسے عجیب طریق پر مصنفؒ نے اپنی کتاب کا آغاز کیا۔ تو یہ چند جملے میں نے عرض کر دیئے۔ طالب علموں کے سامنے تو یہ جملے دس منٹ میں ادا ہو سکتے تھے۔ مگر چوں کہ دوسرا مجمع بھی تھا، اس واسطے قدرے تفصیل بھی کی۔ ورنہ درس کا یہ طریقہ نہیں ہوتا۔ درس میں تو مختصر اور مجمل الفاظ ادا کر دیئے جاتے ہیں۔ وہ دس منٹ کے بات تھی۔ مگر جیسے مخاطب ہوں گے تو تھوڑی تفصیل کرنی پڑے گی۔

بہر حال اس تفصیل میں بھی کچھ فنی چیزیں آ گئیں، کچھ احادیث آ گئیں۔ کچھ امامؒ کی عظمت وجلالتِ شان آ گئی، کچھ کتاب کی عظمت وجلالتِ شان آ گئی اور کچھ آغازِ کتاب کی برکت کا بھی ذکر آ گیا۔ تو یہ سب چیزیں جمع ہو گئیں۔

دعاء...... اب آیئے سب حضرات مل کر دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ اس مدرسے کو تا دیر قائم رکھے۔ جس کے ذریعے سے دین پھیل رہا ہے۔ اور حجازِ مقدس میں علم کا چرچا ہے اور جو بھی طلباء داخل ہوں وہ اپنے علوم سے مستفیض ہوں۔ حق

تعالیٰ انہیں باکمال بنا کر وہاں تک پہنچائے۔ جیسے کہ اب تک اس دارالعلوم“ (مدرسہ صولتیہ)” سے بہت سے علماء اور فضلاء نکل چکے ہیں اور انہوں نے دین کے بڑے بڑے کام کئے ہیں۔

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ، اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَسْئَلُکَ عِلْمًا نَّافِعًا وَّ عَمَلًا صَالِحًا وَّرِزْقًا وَّاسِعًا وَّ شِفَآءً مِّنْ کُلِّ دَآءٍ ، اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْکَ رَحْمَةً وَّهَیِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا ، رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ وَاَدْخِلْنَا الْجَنَّةَ مَعَ الْاَبْرَارِ یَا عَزِیْزُ یَا غَفَّارُ بِرَحْمَتِکَ یَآ اَرْحَمَ الرّٰحِمِیْنَ۔

تعلیم وتدریس

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ. وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

اَمَّا بَعْدُ!..... فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ﴾ صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ①

احوالِ واقعی..... بزرگانِ محترم! جس مبارک جامعہ کا افتتاح آج کیا جا رہا ہے اور یہ ایک برگزیدہ شخصیت کے انتساب سے کیا جا رہا ہے۔ یعنی حضرت حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ بانی دارالعلوم دیوبند (انڈیا) کے اسمِ گرامی کی طرف منسوب کر کے یہ جامعہ قاسمؒ کی جاری ہے یہ ہم سب کے لئے خوش قسمتی ہے کہ تعلیم گاہ قائم ہو اور کسی برگزیدہ شخصیت کے انتساب سے قائم ہو، یہ خود ایک عظیم ترین نعمت ہے۔ اسی سلسلہ میں یہ آیت میں نے تلاوت کی ہے اور اس سلسلے میں چند باتیں گذارش کرنی ہیں اور وہ مختصر وقت میں ہی ان شاء اللہ پوری ہو جائیں گی۔ گھنٹہ سوا گھنٹہ تو وقت دیا گیا ہے۔ شاید یہ بھی پورا نہ ہو سکے۔ بہر حال میں کوشش کروں گا کہ ان چند باتوں کو محدود وقت کے اندر اندر عرض کر دوں۔

شرفِ انسانی کے بارے میں دعویٰ شریعت..... ایک بڑا مسئلہ علماء میں یہ زیرِ بحث رہا ہے کہ انسان جو ساری کائنات میں افضل ترین نوع ہے اور اس کو اشرف المخلوقات کہا گیا ہے۔ شریعت نے بھی اس کا دعویٰ کیا ہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے۔ عقل بھی اس کی شاہد ہے اور محسوسات بھی اس کے شاہد ہیں۔ شرع، عقل اور حس تینوں کا یہ دعویٰ ہے کہ انسان افضل الکائنات ہے، اشرف المخلوقات ہے۔ قرآن کریم میں فرمایا گیا کہ: ﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا﴾ ② "ہم نے انسان کو مکرم اور معظم بنایا اور بر و بحر میں اس کو اٹھایا، بلند کیا اور اونچا کیا اور بہترین پاکیزہ رزق اس کے کھانے کے

---

① پارہ:۳، سورۃ آل عمران، الآیۃ:۷۹۔ ② پارہ:۱۵، سورۃ الاسراء، الآیۃ:۷۰۔

لئے دیا اور اسے بہت بڑی فضیلت دی۔ جتنی بھی چیزیں ہم نے پیدا کیں، ان میں اسے فضیلت دی''۔ تو انسان کی افضیلت اور اشرف المخلوقات ہونا اس آیت سے پوری طرح ثابت ہے اور یہ دعویٰ قرآن کریم کا ہے۔

شرفِ انسانی کے بارے میں دعویٰ عقل...... عقل بھی اس کی شاہد ہے کہ انسان ساری کائنات پر بلند اور برتر ہے۔ اس لئے کہ ساری کائنات میں یہی تصرّف کرتا ہے۔ کائنات اس کے اندر متصرّف نہیں ہے۔ زمین، آسمان، سورج، چاند ساری چیزیں اس کے استعمال میں ہیں۔ ہر چیز میں اس کے تصرّفات ہیں۔

زمین کو نہ صرف کھود سکتا اور اس کے مکانات بھی بنا سکتا ہے بلکہ اس کی خصوصیات پر بھی مطلع ہے۔ اس کے خواص و آثار سے طرح طرح کی چیزیں ایجاد کر رہا ہے۔ سورج کی روشنی اور گرمی سے صرف فائدہ نہیں اٹھاتا بلکہ اس کی شعاعوں اور حرارت سے مشینوں کے طرز پر یہ چیزیں بنا بنا کے استعمال کر رہا ہے۔ نہ صرف سیارات کی روشنی اور گرمی سے فائدہ اٹھا رہا ہے بلکہ سیارات کے اجسام تک پہنچنے کے لئے کوشاں ہے اور آلات تیار کر رہا ہے۔ گویا سیاروں کی ذوات میں بھی تصرف کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ جو اور فضاء میں بھی اس کے تصرّفات ہیں، زمین پر بھی تصرّفات ہیں، سمندروں میں بھی تصرّفات ہیں: ﴿اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً﴾ ①

فرماتے ہیں کہ: کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے زمینوں اور آسمانوں کو کام میں لگا دیا ہے۔ جو کچھ زمین میں اور آسمانوں میں خزانے ہیں سب انسان کے کام میں آتے ہیں اور اللہ نے اپنی نعمتیں انسان کے لئے کامل اور مکمل کر دیں۔ کسی نوع کے لئے یہ دعویٰ نہیں کیا گیا جو انسان کے لئے کیا گیا۔ تو افضل بھی کہا گیا، متصرّف بھی کہا گیا، موجد بھی کہا گیا۔ تو یہ ایک دعویٰ ہے۔

حکماء کی نظر میں وجہِ اشرفیت...... سوال یہ ہوتا ہے کہ انسان کیوں افضل ہے؟ اس کی فضیلت کی خصوصیت اور بنا کیا ہے؟ بہر حال کوئی تخصیص ہوگی جو اوروں میں نہیں پائی جاتی ہوگی، جس کی وجہ سے یہ سب سے بلند و بالا بن گیا۔

حکماء اور فلاسفہ کا دعویٰ تو یہ ہے کہ انسان میں ایک جوہر ہے جو دوسری چیزوں میں نہیں ہے اور وہ عقل ہے۔ اسی لئے منطقی اس کی ''حیوان ناطق'' سے تعریف کرتے ہیں۔ یعنی ایسا جاندار جو معقولات کا بندہ اور پانے والا ہے۔ یعنی عقل سے امور دریافت کرتا ہے جو اور چیزوں میں نہیں ہے۔ اس واسطے انسان کو اشرف المخلوقات کہا گیا، تو بناءِ اشرفیت عقل ہے جو اس کے اندر ہے۔ یہ عام طور سے فلاسفہ اور حکماء کا دعویٰ ہے۔

حکماء کے نظریے کی غلطی...... لیکن میں سمجھتا ہوں یہ دعویٰ کچھ نامکمل ہے۔ فی الجملہ صحیح بھی ہے لیکن محض عقل پر بنیاد رکھ دینا، یہ انسان کی فضیلت کے لئے کافی نہیں ہے۔ اس لئے کہ عقل تھوڑی بہت جانوروں میں بھی موجود ہے۔ عقل سے انسان قیاس ہی تو کرتا ہے کہ ایک معلوم چیز پر قیاس کر کے نامعلوم کا حکم معلوم کرے۔ تو عقل کا

---

① پارہ: ۲۱، سورۃ لقمان، الآیۃ: ۲۰.

سب سے بڑا کام قیاس اور استنباط ہے کہ انہونی چیز کو ایک موجود شے میں سے نکالا ہے۔ عقل یہ کام کرتی ہے۔

میں کہتا ہوں کہ جانور بھی یہ کام کر سکتے ہیں کہ ایک شے کا جو حکم ان کے ذہن میں ہے، قیاس کر کے دوسری شے پر لگا دیں گے۔ ایک کتا ایک جگہ موجود ہو، آپ اسے لاٹھی مار دیں۔ دوسرے دن اس جگہ نہیں آئے گا۔ اس نے قیاس کیا کہ کل گیا تھا تو یہ حرکت ہوئی تھی، آج جاؤں گا تو آج بھی وہی ہوگی۔ یہ عقل نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ اگلے دن کی مار پٹائی کو اس نے آنکھوں سے نہیں دیکھا۔ وہ تو پہلے ہی دن پٹ چکا تھا دوسرے دن کی مار پٹائی سے جو بچ رہا ہے یہ محض فہم اور عقل کی وجہ سے ہے۔ سمجھتا ہے کہ جو واقعہ کل ہوا تھا۔ میرا قیاس یہ ہے کہ آج بھی وہی ہوگا۔ تو انسان قیاس کرتا ہے تو کتا بھی قیاس کرتا ہے۔ اس میں بھی عقل ہے اور اس میں بھی، یہ الگ بات ہے کہ انسان میں زیادہ عقل ہے، اور اس میں کم ہے، تو زیادتی اور کمی کی بات تو یہ ہے کہ خود انسانوں کی عقلیں برابر تھوڑا ہی ہیں۔ بعضے حکیم گزرے ہیں، بعضے نہایت غبی بعضے بلید انسان ہیں، بعضے تیز فہم ہیں۔ بعضوں کی عقل بہت اعلیٰ بعضوں کی بہت ادنیٰ، جب خود آپ کی نوع میں عقلوں کا تفاوت اور کمی و بیشی کا فرق مراتب ہے اور کم عقل والے کو بھی آپ یہ کہتے ہیں کہ یہ بھی عقل مند ہے تو اس سے کم تھوڑی سی کتے میں ہوگی تو اسے کیوں نہیں کہتے کہ یہ بھی عقل مند ہے۔ تھوڑی سی عقل ہے گو آپ کے برابر نہ سہی۔ تو انسان محض یہ دعویٰ کر کے بیٹھ جائے کہ میں ہی عقل مند ہوں، دوسرے میں عقل نہیں ہے، یہ کچھ سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے، اور لومڑی کی چالاکی و ہوشیاری تو مشہور ہے اور بندر کی عیاری سب سے زیادہ مشہور ہے۔ ایسی چالاکیاں کرتا ہے کہ بعض دفعہ انسان بھی زچ ہو جاتے ہیں۔ بہر حال مطلقاً عقل و شعور ہر جاندار کو دیا گیا ہے۔ کمی و بیشی کا فرق ہے جیسے خود بنی نوع انسان میں ہے، جانوروں میں بھی کمی و بیشی کا فرق ہے، اس لئے افضلیت کی بنا محض عقل پر رکھنا یہ بات سمجھ میں نہیں آتی، جب کہ یہ جوہر دوسروں میں بھی موجود ہے، چاہے کم ہی درجہ کا ہو۔

علم محض بھی وجہ شرافت نہیں...... اس لئے بعض حکماء نے دعویٰ کیا کہ عقل بناءِ افضلیت نہیں۔ بناءِ افضلیت علم ہے۔ جانوروں کو علم نہیں دیا گیا، انسانوں کو علم عطاء کیا گیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ بھی بناء صحیح نہیں ہے، فی الجملہ صحیح ہے مگر اس پر ہم دار و مدار نہیں رکھ سکتے۔ اس لئے کہ خود قرآن کریم دعویٰ کرتا ہے کہ جانوروں کو بھی علم دیا گیا ہے اور علم بھی معمولی نہیں، شریعت کے احکام کا علم ہے، بندگی اور اطاعت کا علم ہے جیسے انسان کو دیا گیا ہے، جانوروں کو بھی دیا گیا ہے۔

انسان کے علاوہ دیگر مخلوقات کو بھی علم حاصل ہے...... قرآن کریم میں فرمایا گیا: ﴿كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهُ وَتَسْبِيحَهُ﴾① ہر چیز نے اپنی نماز کو بھی اور تسبیح کو بھی جان لیا ہے“۔

تو نہ صرف آپ نماز پڑھتے ہیں بلکہ کائنات کا ذرہ ذرہ نماز پڑھتا ہے اور جانور بھی اپنی نماز کو جاہلانہ طریق

---

① پارہ: ۱۸، النور، الآیۃ: ۴۱.

پر نہیں پڑھتے۔ قَدْ عَلِمَ میں قَدْ کلمہ تحقیق کا ہے اور ماضی پر داخل ہو رہا ہے۔ جس کے معنی ہیں کہ یقیناً ہر شے نے جان لیا ہے۔ اور لفظ کُلٌّ کے اندر جمادات بھی آتے ہیں، نباتات بھی آتے ہیں، حیوانات بھی آتے ہیں۔ تو شریعت سب کے لیے علم ثابت کر رہی ہے اور علم بھی شریعت کا۔ یعنی سب اپنی اپنی تسبیح اور نماز جانتے ہیں۔

شاہ رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک موقع پر لکھا ہے کہ کائنات کا ذرہ ذرہ نمازی ہے، نماز پڑھتا ہے مگر ہر ایک کی نماز اس کے مناسب حال ہے لکھتے ہیں کہ درختوں کی نماز میں قیام ہے، رکوع اور سجدہ نہیں ہے۔ وہ ایک پیر پر کھڑے ہوئے اللہ کی یاد میں مصروف ہیں اور زبانِ حال سے کہہ رہے ہیں کہ جس طرح آپ نے ہمیں بنایا۔ ہماری اطاعت کا تقاضا ہے کہ ہم یوں ہی بنے رہیں۔ نہ ادھر جھکیں نہ، اُدھر جھکیں، نہ کریں نہ سجدہ کریں، ایک پیر پر کھڑے ہوئے قیام کی حالت میں نماز ادا کر رہے ہیں۔ اطاعت وفرمانبرداری میں لگے ہوئے ہیں۔ حقیقی معنی میں مسلم ہیں۔ ﴿وَلَهٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ ① یعنی ہر چیز مسلم ہے اور عبادت گذار ہے۔ تو درختوں کی نماز میں قیام ہے۔ یعنی ہیئت ایسی بنائی ہے گویا وہ قیام کیے ہوئے ہیں۔

اور لکھتے ہیں کہ چوپایوں کی نماز میں رکوع ہے۔ سجدہ اور قیام نہیں ہے، جو چار پیر سے چلنے والے جانور ہیں۔ ان کی ہیئت ایسی بنائی کہ وہ ہمہ وقت رکوع کے ساتھ عبادت میں مشغول ہیں۔ ان کی نماز میں رکوع ہے۔

جتنے حشرات الارض ہیں، سانپ، بچھو، کیڑے مکوڑے ان کی نماز میں سجدہ ہے۔ رکوع اور قیام نہیں ہے۔ وہ اوندھے پڑے ہوئے ہیں، گویا ہر وقت اللہ کے سجدہ گزار ہیں۔ اسی میں نماز ادا کر رہے ہیں۔

پہاڑوں کی نماز میں تشہد ہے۔ یعنی گھٹنے ٹیکے ہوئے زمین پر بیٹھے ہوئے ہیں جیسے نمازی آدمی اَلتَّحِیَّات میں گھٹنے ٹیک کر بیٹھتا ہے۔ ان کی نماز میں تشہد ہے۔ نہ قیام ہے، نہ رکوع ہے، نہ سجدہ، اگر پہاڑ سجدہ کرنے لگیں تو ساری دنیا پس کر رہ جائیں، غنیمت ہے کہ وہ ایک جگہ تشہد میں بیٹھے ہوئے ہیں۔

جنت اور دوزخ کی نماز میں فقط دعا ہے۔ سوال کرنا اور مانگنا یہ جنت اور دوزخ کی نماز ہے۔۔ جنت بھی سوال کر رہا ہے کہ اے اللہ! مجھے بھر دیجیے۔ جہنم بھی سوال کر رہا ہے کہ مجھے بھر دیجیے اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا کہ قیامت کے دن تمہارا پیٹ بھر دیں گے۔

جہنمی جب سارے جہنم میں داخل کر دیے جائیں گے اور جہنم پھر بھی خالی رہ جائے گا تو کہے گا ﴿هَلْ مِنْ مَّزِيْد. هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ﴾ ② اور لایئے اور لایئے۔ بھرنے کا وعدہ ہے۔ میں نے عمر بھر پیٹ بھرنے کی دعائیں مانگی ہیں۔ آج میرا پیٹ بھریے۔ پہاڑ جھونک دیے جائیں گے۔ زمین جھونک دی جائے گی۔ پھر بھی کہے گا ﴿هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ﴾ اور لایئے یہ تو بہت بڑا عالم ہے کروڑوں دنیائیں اس کے اندر بن جائیں جب ساری چیزیں جھونکنے کی ختم ہوں گی اور پھر بھی اس کا پیٹ نہیں بھرے گا اور بھوک سے یہی کہے گا ﴿هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ﴾

---

① پارہ: ۳ آل عمران، الآیۃ: ۸۳۔ ② پارہ: ۲۶ سورۃ ق، الآیۃ: ۳۰۔

تو حدیث میں ہے کہ حق تعالیٰ اپنی ایڑی اس کے منہ پر رکھ دیں گے تو کہے گی قَطْ قَطْ۔ بس میں بھر گئی۔ اب مجھ میں تاب نہیں ہے، تو سوال پورا ہو جائے گا۔ جنت کا بھی یہی سوال ہے کہ مجھے بھر دیجئے۔ تمام اہلِ جنت، جنت میں داخل ہو جائیں گے اور ہزاروں محلات اور اس کے شہر خالی ہوں گے، وہ کہے گا کہ آپ کا وعدہ ہے مجھے بھر دیجئے، تو حق تعالیٰ ایک نئی مخلوق پیدا فرمائیں گے جس سے جنت کی آبادکاری ہوگی، اس کا سوال پورا کیا جائے گا۔ تو جنت و دوزخ کی نماز دعا مانگنا اور سوال کرنا ہے۔ ①

فرشتوں کی نماز صف بندی ہے۔ کروڑوں کی تعداد میں رکوع میں ہیں، کروڑوں سجدے میں ہیں۔ کروڑوں حالتِ قیام میں ہیں کروڑوں بیت المعمور کے طواف میں مشغول ہیں۔ حدیث میں ہے کہ آسمانوں میں چار انگشت جگہ خالی نہیں ہے جہاں کوئی نہ کوئی فرشتہ مصروفِ عبادت نہ ہو۔

تو فرشتوں کی نماز صف بندی ہے کہ ترتیب وار کھڑے ہو کر اللہ کی عبادت ادا کر رہے ہیں۔ رکوع سے ہو یا سجدے اور قیام سے ہو جتنے سیارے ہیں جو چکر کھا رہے ہیں، جیسے فلاسفہ قدیم کے کہنے کے مطابق سورج گردش میں ہے اور فلاسفہ حال کے دعویٰ کے مطابق زمین گردش میں ہے۔ بہرحال زمین کو بھی وہ ایک سیارہ مانتے ہیں اور چاند و سورج کو بھی سیارہ مانتے ہیں اور ممکن ہے کہ دونوں اپنے اپنے رنگ میں گردش میں ہوں۔ ان کی نماز دوران اور گردش ہے کہ جہاں سے چلے پھر پھرا کر وہیں پھر لوٹ آئے۔ پھر وہاں سے چلے پھر وہاں لوٹ آئے۔ یہ گردش اور چکر یہی ان کی نماز ہے۔

تو کائنات کا ایک ایک ذرہ اپنی ہیئت اور خلقت کے مطابق نماز اور "تَسْبِیْح وَتَھْلِیْل" میں مشغول ہے۔ احادیث میں وہ تسبیحات بتلائی گئی ہیں جو مختلف جانوروں کی ہیں کہ تیتر بولتا ہے تو اس کی یہ تسبیح ہے۔ فرمایا گیا کہ تیتر جو اپنی زبان میں بولتا ہے وہ یہ کہتا ہے کہ "کَمَا تَدِیْنُ تُدَانُ." ② جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔ بعض جانور کہتے ہیں۔ "سُبْحَانَ الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ" ③ جانوروں کی مختلف تسبیحات آتی ہیں کہ مور یہ کہتا ہے، تیتر یہ کہتا ہے، طوطا یہ کہتا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ سیٹیاں بج رہی ہیں۔ حقیقتاً یہ تسبیح و تہلیل ہے مگر ان کی زبان میں ہے۔

اسی کو فرماتے ہیں ﴿وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَهُمْ﴾ ④ کوئی شے کائنات کی ایسی نہیں ہے جو تسبیح میں مشغول نہ ہو، تم ان کی تسبیح نہیں سمجھتے۔ وہ اپنی زبان میں کہہ رہے ہیں۔ اور آپ اپنے ہی بھائیوں کی زبان کب سمجھتے ہیں۔ اگر کوئی انگریزی میں تسبیح پڑھے تو آپ کیا سمجھیں گے؟ پشتو زبان میں کوئی تسبیح پڑھے، آپ اسے کیا سمجھیں گے؟ جن لوگوں کو حج کی سعادت نصیب ہوئی ہے وہ جانتے ہیں کہ مشرق

---

① الصحیح للبخاری، کتاب التفسیر، باب قوله تعالیٰ هل من مزید، ج:۱۵ ص:۸۵.

②③ تفسیر الطبری، ج:۱۳ ص:۱۶۵. ④ پارہ:۱۵، سورة الاسراء، الآیة:۴۴.

ومغرب کے انسان آتے ہیں۔ پشتونی آدمی اپنی پشتو میں اللہ کو یاد کر رہا ہے۔ بنگالی آدمی اپنی بنگلہ زبان میں اللہ کو یاد کر رہا ہے۔ پنجابی، پنجابی زبان میں دعائیں مانگ رہا ہے۔ دوسرا اس سے نابلد ہے، وہ سمجھ رہا ہے کہ خدا جانے کیا گڑبڑ ہو رہی ہے۔ لیکن اس گڑبڑ میں بہت سے علوم ہیں، بہت سے اذکار ہیں، بہت سی تسبیحات ہیں جو پوری ہو رہی ہیں۔ لیکن ہم انہیں نہیں سمجھتے۔

جیسے تار برقی والے کو آپ نے دیکھا ہوگا کہ جب تار دیئے جاتے ہیں اسے مضمون بتا دیا، آپ کے سامنے سوائے اس کے کہ وہ پیتل کی ایک کلی کے اوپر ہاتھ رکھ کر کھٹ کھٹ کھٹا کھٹ کر رہا ہے کچھ نہیں اور آپ کہیں گے کہ عجیب احمق آدمی ہے۔ میں آیا تھا کہ اس مضمون کو یہ بذریعہ تار پہنچا دے اور یہ کھٹ کھٹ کھٹا کھٹ کر رہا ہے۔ لیکن آپ کو خبر نہیں کہ اسی کھٹا کھٹ میں ایک ملک سے دوسرے ملک میں علم پہنچ رہا ہے۔ ایک ملک سے دوسرے ملک کی طرف معلومات منتقل ہو رہی ہیں۔ اگر آپ ان اصطلاحات سے واقف ہو جائیں جن اصطلاحات کو تار برقی والے جانتے ہیں، سارے علوم آپ کے سامنے آجائیں کہ اس کھٹا کھٹ میں کیا پوشیدہ ہے۔ اسی طرح اگر پرندوں کی بولیوں سے آپ واقف ہو جائیں تو سمجھیں گے کہ کس طرح عظیم الشان تسبیح وتہلیل اور ذکر اللہ ہے جو ان کی زبان پر جاری ہے۔ جن کو حق تعالیٰ نے معجزانہ طریق پر سمجھا دیا وہ جانتے تھے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام فرماتے ہیں. ﴿یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّیْرِ﴾ ① اے لوگو! ہمیں پرندوں کی بولیاں سکھلا دی گئی ہیں۔ وہ بتلا دیتے تھے کہ یہ کوا یہ کہہ رہا ہے۔ یہ کبوتر یہ بول رہا ہے۔ اللہ نے ہمیں جانوروں کی بولیاں سکھلا دی ہیں۔ لیکن کسی کالج اور اسکول کے ذریعہ سے نہیں۔ اعجاز کے طور پر ان کی زبانوں کا دل میں الہام کر دیا تو ؎

ہر یکے را اصطلاحے دادہ ایم

ہر ایک کی ایک لغت ہے۔ انسانوں کی بھی ایک لغت ہے۔ ہندی کی اور لغت، سندھی کی اور لغت پنجابی کی اور لغت۔ اسی طرح تیتر اور خوطے کی الگ الگ لغت ہے۔ یہ سارے اپنی اپنی لغات میں تسبیح وتہلیل کرتے ہیں۔ تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ محض علم کی وجہ سے انسان اشرف المخلوقات ہو تو علم تو پرندوں کو بھی ہے، جانوروں کو بھی ہے اور علم بھی تسبیح وتہلیل اور شریعت ونماز تک کا علم ہے۔

یہ الگ بات ہے کہ آپ کی نماز کو اللہ نے مکمل کر دیا تو آپ کی نماز میں درختوں کا سا قیام بھی ہے، چوپایوں جیسا رکوع بھی ہے حشرات الارض جیسا سجدہ بھی ہے۔ پہاڑوں کا سا تشہد بھی ہے۔ جنت ودوزخ کی سی دعا مانگنا بھی ہے۔ فرشتوں کی سی صف بندی بھی ہے اور سیاروں کی سی گردش بھی ہے، اس لئے کہ کوئی نماز دو رکعت سے کم کی نہیں ہے۔ دو رکعت کے معنی یہ ہیں کہ جو کام پہلی رکعت میں کریں گے لوٹ کر پھر دوسری رکعت میں وہی کریں

---

① پارہ: ۱۹، سورۃ النمل، الآیۃ: ۱۶.

گے۔ تو آپ کی نماز کے اندر گردش بھی ہے۔ اگر آپ کے لئے گردش نماز ہے تو آفتاب کے لئے گردش نماز کیوں نہیں ہو سکتی؟ اگر آپ کا ایک رکعت سے دوسری رکعت کی طرف جانا اور چکر کھانا عبادت ہے تو زمین اگر چکر کھانے لگے تو وہ کیوں عبادت نہیں ہوگی؟ بہر حال عبادت کے طریقے مختلف اور اس کا علم بھی مختلف ہے۔ تو اشرف المخلوقات ہونے کی یہ بنا نہیں ہو سکتی کہ آپ کو علم ہے۔

علم و عقل میں اگر انسان اور دیگر مخلوقات میں کچھ فرق ہے تو خود انسانوں میں بھی باہم فرق ہے...... اور ہم محسوسات تو بہت معمولی چیز ہے، ایک گدھے میں بھی ہوتا ہے، آپ سورج کو دیکھتے ہیں، گدھا بھی سورج کو دیکھتا ہے۔ آپ کو بھی حس ہے اسے بھی حس ہے۔ آپ زمین دیکھ رہے ہیں وہ بھی دیکھ رہا ہے تو احساسات میں جانور اور انسان برابر ہے۔ اس میں سے چیزیں نکالنا نتیجے پیدا کرنا یہ عقل سے تعلق رکھتا ہے تو تھوڑی بہت عقل جانوروں کو بھی ہے، اس سے بھی آگے بڑھ کر اس علم کا مرتبہ ہے کہ آپ احکام خداوندی کو جان گئے۔ یہ مرتبہ جانوروں کو بھی نصیب ہے۔ بہت سے بہت آپ اس مرتبے میں کامل ہیں۔ وہ ناقص ہیں تو میں یہ عرض کروں گا کہ سارے انسان عالم ہی کہاں، کیا سارے احکام شریعت کو جانتے ہیں؟ اگر سارے عالم اکمل ہوتے تو اس جامعہ قاسمیہ ہی کے قائم کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اور اس مدرسہ کے قیام کی کیا ضرورت تھی، سارے ماں کے پیٹ سے عالم ہی پیدا ہوتے۔ تو سارے ایک درجے کے نہیں۔ تو علم اگر آپ میں ہے تو تھوڑا بہت جانوروں میں بھی ہے۔ عقل اگر آپ میں ہے تو تھوڑی بہت جانوروں میں بھی ہے۔ فہم اگر آپ میں ہے تو ان میں بھی ہے۔ پھر کیا چیز ہے کہ آپ اشرف المخلوقات ہیں؟ آخر آپ کو کیوں دعویٰ ہے کہ ہم ہی سب سے افضل ہیں؟

آپ کہیں گے کہ ہم مکان بناتے ہیں تو کوا کہے گا کہ میں بھی گھونسلہ بناتا ہوں۔ آپ کہیں گے کہ میں کئی منزلہ مکان بناتا ہوں تو بھیا ایک چھوٹا سا جانور ہوتا ہے، وہ کہے گا میں مکان بناتا ہوں جس میں ایسی ایسی بلڈنگ ہوتی ہے۔ اس میں باتھ روم الگ ہے، سونے کا کمرہ الگ ہے اور بچوں کا کمرہ الگ اور جھولا الگ اور کیسا پر تکلف اور مضبوط مکان؟ یعنی دو تین گھاس کے تنے ہوتے ہیں جس سے وہ اپنے گھر کو کیکر میں تانتا ہے۔ آندھیاں چلیں، بارشیں آئیں، طوفان آئے کیکر اکھڑ کر گر جائے گا مگر کیا مجال ہے کہ گھونسلہ ٹوٹ جائے۔ اتنی پکی بلڈنگ بنتی ہے اور اس میں کمرے اور خانے ہیں۔ تو آپ کو خواہ مخواہ دعویٰ ہو گیا کہ ہم بڑے انجینئر ہیں، وہ کہے گا کہ میں بھی انجینئر ہوں۔ میں بھی کئی منزلہ مکان بناتا ہوں۔

شہد کی مکھی کہے گی کہ میں تم سے زیادہ کاریگر ہوں۔ اس لئے کہ وہ شہد کے چھتے میں ہشت پہلو سوراخ بناتی ہے۔ آپ پرکار سے بھی ایسے برابر برابر سوراخ مشکل سے بنائیں گے وہ بلا پرکار کے اپنے منہ سے اپنے صحیح اندازے سے بناتی ہے۔ پھر اس میں تقسیم عمل ہے کہ ایک حصہ میں شہد بھرا ہوا ہے۔ جو قوم کی خوراک ہے۔ ایک حصہ میں بچے ہیں اور ایک میں ماں باپ ہیں۔ یہ ساری کارروائیاں جو آپ کرتے ہیں وہ بھی کرتی ہے۔ اگر آپ

کے ہاں وزیر خوراک ہے تو ان کے ہاں بھی وزیر خوراک ہے۔

آپ کہیں گے کہ صاحب ہم تنظیم ملت جانتے ہیں۔ ہمارا ایک صدر اور پریذیڈنٹ ہے۔ وزیر اعظم ہے۔ جانوروں کو کہاں نصیب؟ شہد کی مکھی کہے گی کہ میرے ہاں بھی یہ سب کچھ موجود ہے۔ امارت بھی ہے۔ عربی زبان میں جو سب سے بڑی مکھی ہوتی ہے اسے یعسوب کہتے ہیں۔ اس کے اشاروں پر پوری مکھیاں حرکت کرتی ہیں۔ وہ جہاں جا کے بیٹھے گی ہزاروں مکھیاں وہیں بیٹھیں گی۔ وہیں شہد کا چھتہ بنے گا۔ مجال نہیں کہ یعسوب چلی جائے اور قوم نہ جائے۔ پھر تنظیم ملت کا یہ عالم ہے کہ مجرموں کو سزا دینا اور مطیعوں کو سرفراز کرنا، یہ بھی مکھیوں میں موجود ہے۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ جہاں شہد کا چھتہ ہوتا ہے اس کے نیچے کچھ مکھیاں ٹوٹی ہوئی پڑی ہوتی ہیں۔ اس کی شکل یہ ہوتی ہے کہ اگر کوئی مکھی کسی زہریلے درخت پر بیٹھ کر آئی اور زہریلا عرق چوس کر آئی ہے، وہ امیر یعسوب فوراً پہچان لیتا ہے کہ یہ زہریلا مادہ لے کر آئی ہے، اگر یہ یہاں بیٹھ گئی اور اس نے شہد میں ملا دیا تو پوری قوم تباہ ہو جائے گی، تو اس کی گردن توڑ کر اسے نیچے پھینک دیتا ہے۔

پھر عجیب بات یہ ہے کہ امیر نے قتل کر دیا۔ لیکن قوم میں ایجی ٹیشن نہیں ہوتا کہ امیر کو برطرف کرنے کے لئے نعرے لگا کر کھڑی ہو جائے۔ ساری کہتی ہیں کہ ہماری خیر خواہی کے لئے کیا ہے۔ ہمارے اندر اتنا علم نہیں ہے جتنا اس کے اندر ہے۔ یہ قوم کے بھلے برے کو جانتا ہے۔ لہٰذا اس کے قتل پر راضی ہیں۔ یہی قرآن کریم میں فرمایا گیا:

﴿وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ﴾ ① ایک کو قتل کرتے ہیں تا کہ قوم زندہ ہو جائے۔ یعسوب بھی یہی کہے گا کہ ایک قتل کرتا ہوں تا کہ پوری قوم میں زندگی باقی رہے۔ اگر میں نے اسے باقی چھوڑ دیا تو پوری قوم تباہ ہو جائے گی۔ تو علم سیاست اور علم تنظیم ملت بھی ان میں ہے۔ انجینئری اور مکان سازی بھی ہے۔ آپ کو خواہ مخواہ ہی دعویٰ ہو گیا کہ انجینئر تو ہم ہیں۔ سیاسی ہیں تو ہم ہیں۔ تنظیم ملت کرتے ہیں تو ہم کرتے ہیں، یہ تو سارے جانور کرتے ہیں۔

بطخیں جب آتی ہیں تو ہمیشہ مثلث ہو کر آتی ہیں، دو قطاریں اور آگے آگے ان کا امیر ہوتا ہے۔ جیسے پریڈ کے میدان میں فوجیں قطار باندھ کر جاتی ہیں اور لیفٹیننٹ کی آواز پر چلتی ہیں۔ وہی شان بطخوں کے اندر ہے۔ جب جھیل پر بیٹھتی ہیں۔ اگر ذرا خطرہ ہوتا ہے تو ان کا امیر جو بطخا ہوتا ہے۔ وہ پوری رات ایک پیر پر کھڑا ہو کر گزارتا ہے تا کہ میری پوری قوم آرام سے سوئے، تکلیف میں اٹھاؤں۔ اس لئے کہ عیش کرنے کا نام امارت نہیں ہے۔ امارت قوم کے لئے تکلیف اٹھانے کا نام ہے۔ میری قوم کو راحت پہنچے۔ اس لئے پوری رات امیر تکلیف اٹھاتا ہے۔ ذرا خطرہ دیکھا تو وہ ایک آواز لگاتا ہے اس پر ساری بطخیں چوکنا ہو جاتی ہیں، دوبارہ آواز لگاتا ہے تو پر تولنے لگتی ہیں اور تیسری دفعہ جو اس نے آواز لگائی تو ایک دم راستہ چلنا شروع کر دیتی ہیں۔ جیسے فوجی کمانڈر گویا بگل بجا دیتا ہے اور اس

---

① پارہ: ۲ سورۃ البقرۃ الآیۃ: ۱۷۹.

میں اصطلاحات ہیں کہ پہلے بگل پر تیار ہو جائیں دوسرے پر وردیاں پہن لیں، تیسرے پر ہتھیار آراستہ کریں اور چوتھے پر مارچ کرنا شروع کردیں۔ وہی ان کے اندر قاعدہ ہے، تو آپ کو خواہ مخواہ یہ دعویٰ ہوگیا کہ ہم ہی جنگی لوگ ہیں، ہم ہی امیر الحرب ہیں، ہم ہی حربی علوم سے واقف ہیں۔ وہ عربی علوم سے بھی واقف ہیں۔ حربی علوم سے بھی واقف ہیں۔ ان میں بھی دونوں قسم کے علوم ہیں، تو اشرف المخلوقات ہونے کی یہ بناء نہیں ہوسکتی۔

آپ کہیں گے صاحب! ہم تو بڑے عمدہ کپڑے بناتے ہیں۔ کھانے بڑے عمدہ کھاتے ہیں۔ بھلا گدھا پلاؤ زردہ کہاں کھاتا ہے۔ ہم کھاتے ہیں، لہٰذا ہم اشرف المخلوقات ہیں۔ میں کہتا ہوں یہ تو آپ جب کہیں جب گدھے کو آپ کے زردہ پلاؤ پر لالچ آیا ہو۔ جس طرح آپ اس کی گھاس کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ وہ آپ کے پلاؤ کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ آپ اپنی نوع کے مطابق غذا کھاتے ہیں وہ اپنی نوع کے مطابق، تو نوعیت میں فرق ہوا۔ کھانے اور بھوک میں تو فرق نہیں آیا۔ آپ کا بھی جذبہ ہے۔ اس کا بھی جذبہ ہے۔ بہر حال نہ کھانا شرافت کی وجہ ہوسکتی ہے۔ نہ مکان بنانا اور نہ انجینئری وجہ شرافت ہے۔ نہ علومِ سیاسیہ آپ کی افضلیت کی دلیل ہوسکتی ہے۔ ان میں بھی سیاسی موجود ہیں۔ آپ کہتے ہیں کہ ہم بڑے بڑے طبیب ہیں، علاج کرتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ ان میں بھی بڑے بڑے اطباء موجود ہیں۔ مجھے راجپوتانہ میں جانے کا اتفاق ہوا۔ میرے خسر مولوی محمود صاحب مرحوم ریاست اندر گڑھ میں وزیر تھے۔ وہاں چوں کہ ہندو راج تھا تو بندروں کے مارنے کی ممانعت تھی اور یہ بندر بڑا نقصان کرتے۔ ذرا کمرہ کھلا رہ گیا تو کوئی برتن لے گیا، کوئی کپڑے لے گیا۔ روز یہ قصہ ہوتا۔ اور یہ ایسا موذی جانور ہے کہ یہ نہیں کہ کپڑا لے گیا بلکہ منڈیر پر بیٹھ کر دکھا دکھا کے اسے پھاڑتے۔ جیسے چڑا رہا ہو۔ خواہ مخواہ بھی غصہ آتا مگر اب بس کی بات بھی نہیں تھی، مار بھی نہیں سکتے تھے۔ چھپ چھپا کر دو چار بندر مارے اور راتوں کو باہر پھنکوا دیئے۔ مگر اس سے بندروں میں کمی تھوڑا ہی آتی تھی۔ اگلے دن پھر موجود اور پھر وہی قصہ۔

ہم نے یہ ارادہ کیا کہ سو پچاس ایک دم مر جائیں۔ کچھ تو کمی ہوگی اور ہمارا دل بھی ٹھنڈا ہوگا۔ تو ہم نے چار روپے کا سنکھیا خریدا اور کئی سیر آٹے میں ملا کر اس کی روٹیاں پکوائیں اور انہیں چھت پر پھیلا دیا اور ہم دیکھنے بیٹھ گئے اور تصور یہ تھا کہ بندر آتے جائیں گے، کھاتے جائیں گے، مرتے جائیں گے اور ہم خوش ہوتے جائیں گے۔

مگر دو تین بندر آئے۔ بندر تو بڑا سیانا جانور ہے۔ اس نے دیکھا کہ روٹیاں پھیلی پڑی ہیں۔ روٹیوں کی یہ حالت ہوتی نہیں کہ وہ پھیلی پڑی ہوں، کوئی بات اس کے اندر ہے۔ اب وہ کم بخت بیٹھا ہوا دیکھ رہا ہے۔ روٹی اٹھانے کے لئے آگے نہیں بڑھتا۔ دو تین آئے تھے، وہ چلے گئے۔ ہم یہ سمجھے کہ تدبیر فیل ہوگئی۔ یہ کم بخت کچھ سمجھ گئے۔ انہوں نے اپنے شہر و بستی میں جا کر اطلاع کی ہوگی تو وہاں سے چودہ پندرہ موٹے موٹے بندر دوڑ آئے اور انہوں نے آ کر یہ دیکھنا شروع کیا۔ گویا ان کے ذہن نے یہ سوال اٹھایا کہ عادۃً اس طرح روٹیاں پھیلی نہیں رہا کرتیں یہ جو پھیلی پڑی ہیں ان کے اندر کوئی بات ہے اور ان کی سمجھ میں آ نہیں رہی۔ وہ بھی آخر چلے گئے۔ اس کے

دس پندرہ منٹ کے بعد پچاس ساٹھ بندروں کی قطار بڑے بڑے موٹے چوہدری قسم کے لوگ آئے اور وہ روٹیوں کے ارد گرد گھیرا ڈال کر بیٹھ گئے۔ گویا گول میز کانفرنس منعقد کی کہ اس مسئلہ پر غور کیا جائے کہ روٹیاں کیوں پھیلی پڑی ہیں۔ اس میں کیا بھید ہے۔ وہ اس کی طرف دیکھ رہا ہے اور وہ اس کی طرف دیکھ رہا ہے، ڈر کے مارے آگے کوئی نہیں بڑھتا۔ خیر ایک بڑا بوڑھا بندر آگے بڑھا۔ اس نے روٹی کو توڑ کر سونگھا، دوسرے نے توڑا۔ اس نے بھی سونگھا، تیسرے نے توڑا، اس نے بھی سونگھا' اب گویا یہ ایک نتیجے پر پہنچ گئے اور پچاس کے پچاس بھاگ گئے۔ ہم نے سمجھا کہ تدبیر فیل ہوگئی مگر وہ ہم سے زیادہ چالاک تھے۔ کوئی دس بیس منٹ گذرے ہوں گے تو کوئی سو دو سو بندروں کی ایک قطار اور ہر ایک یک ہاتھ میں ایک ایک ہری ٹہنی جس میں پتے بھی تھے۔ وہ لئے چلے آ رہے ہیں۔ ایک لشکر چلا آ رہا ہے اور ٹہنیاں ان کے ہاتھ میں ہیں۔ کمبخت آئے۔ آ کر انہوں نے روٹیوں کے ٹکڑے کئے۔ اس لئے کہ بندروں کی تعداد زیادہ تھی اور روٹیوں کی تعداد کم تھی۔

نیم نانے گر خورد مردِ خدا بذلِ درویشاں کند نیمے دگر

درویش لوگ تھے۔ انہوں نے کہا خود غرضی ٹھیک نہیں۔ بانٹ کر کھاؤ، سب کو مل جائے تو مناسب ہے تو تعداد کے مطابق ٹکڑے کئے اور اس کے بعد ہر ایک نے ایک ایک ٹکڑا کھایا اور اوپر سے پتے چبائے اور دندناتے ہوئے چلے گئے۔ ان میں سے بے ہوش بھی کوئی نہیں ہوا مرنا تو بعد میں ہے۔ تو وہ اچھے خاصے عقل مند ہوئے اور بے وقوف ہم ثابت ہوئے کہ چار روپے بھی گئے، سنکھیے کی خریداری ہوئی۔ آٹا بھی خراب ہوا اور وقت بھی گیا اور بات وہیں کی وہیں رہی، وہ اطمینان سے چلے گئے۔ انہیں گویا ایک ایسی جڑی بوٹی معلوم تھی جس میں تریاقیت موجود تھی۔ جو زہر کو مارنے والی تھی۔ انہوں نے وہ زہر کا لقمہ کھایا۔ اور اوپر سے وہ تریاقی پتے کھالئے۔ کچھ بھی اثر نہیں ہوا۔ آپ کو خواہ مخواہ دعویٰ ہے کہ طبیب ہم ہیں۔ ان میں بھی اطباء ہیں۔ وہ بھی جڑی بوٹیوں کی خاصیت جانتے ہیں۔ آپ سو کی جانتے ہیں وہ دو چار کی جانتے ہوں گے۔ اتنا فرق ہے مگر جاننے والے وہ بھی ہیں۔

بہرحال علوم طبیہ لیجئے، علوم شرعیہ یا علوم حسیہ لیجئے۔ سب میں جانوروں کا حصہ ہے۔ تو آپ خواہ مخواہ مدعی بن بیٹھے کہ ہم اشرف المخلوقات ہیں اس لئے کہ ہم عالم ہیں۔ ان میں بھی سارے نمونے موجود ہیں، تو یہ سوال بدستور باقی ہے کہ انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کی بنیاد کیا ہے؟ عقل محض کافی نہیں کہ یہ بھی دوسروں میں موجود۔ علم محض کافی نہیں کہ یہ بھی دوسروں میں موجود۔ علم کی نوعیتیں کافی نہیں کہ علم کی انواع مختلفہ ان میں بھی موجود ہیں۔ پھر آخر کیا پتا ہے؟

تمام مخلوقات میں علم وفہم کے درجات...... اگر غور کیا جائے اور انصاف سے دیکھا جائے تو ایک خصوصیت ہے جو انسان میں ہے۔ غیر انسان میں نہیں ہے۔ حتیٰ کہ ملائکہ میں بھی نہیں۔ یعنی عالم تو ملائکہ بھی ہیں۔ جب حق تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کے مقابلہ میں ملائکہ کو رکھا اور حضرت آدم علیہ السلام سے کہا کہ: ﴿أَنْبِئْهُمْ

بِاَسْمَآءِ هِمْ ﴾ ① ان چیزوں کے نام بتاؤ۔ آدم علیہ السلام نے تمام چیزوں کے نام اور خاصیتیں بتادیں اور ملائکہ نے کہا تھا، ﴿ سُبْحٰنَکَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ﴾ ② بے شک آپ پاک ہیں، ہمیں علم نہیں۔ جتنی آپ نے تعلیم دے دی اتنا ہے۔ معلوم ہوا کہ ملائکہ کو علم سکھلایا گیا ہے ان کے پاس بھی علم تھا۔ اتنا نہ سہی جتنا حضرت آدم علیہ السلام کو دیا گیا۔ نیز جب جانوروں تک کو علم ہے تو ملائکہ کو تو اور زیادہ ہونا چاہئے۔ خلاصہ یہ کہ عقل اور علم و فہم ملائکہ میں بھی ہے۔ ان سے کم درجہ کا جنات میں ہے۔ ان سے کم درجے کا حیوانات میں ہے۔ ان سے کم درجے کا نباتات اور جمادات کا ہے۔ تو انسان کو دعویٰ کرنے کا کوئی حق نہیں کہ چوں کہ میں عقل رکھتا ہوں، میں بڑا ہوں، میں علم رکھتا ہوں، میں بڑا ہوں۔ علم بھی سب میں قدرِ مشترک کے طور پر موجود ہے۔

انتقالِ علوم انسانی خصوصیت ہے..... البتہ ایک چیز ہے جو انسان کے سوا کسی دوسرے میں نہیں پائی جاتی۔ وہ علم نہیں بلکہ تعلیم ہے۔ یعنی دوسروں کو سکھلانا، دوسروں کو بتانا، دوسروں کی تربیت کرنا۔ یہ نہ ملائکہ میں ہے، نہ جنات میں ہے، نہ حیوانات میں ہے۔ حیوانوں میں جتنا علم ہے وہ طبعی رنگ میں ہے کہ اللہ نے ان کے دل میں ڈال دیا۔ کسی مکتب میں جا کے وہ تعلیم نہیں پاتے۔

آج یہاں جامعہ قاسمیہ قائم ہو رہا ہے۔ آپ نے کبھی سنا کہ آسمانِ اوّل پر کوئی جامعہ قائم ہوا اور فرشتے مدرس بن کے بیٹھے یا کسی اور آسمان میں کوئی مدرسہ ہو۔ یا جنات نے کسی ویرانے میں کوئی مدرسہ اور مکتب کھولا ہو؟ یہ صرف انسان کا کام ہے کہ ایک سے دوسرے تک تعلیم کے ذریعے علم منتقل ہوتا ہے۔ ملائکہ کا علم جو ہے وہ طبعی رنگ میں ہے کہ اللہ نے جتنا ان کے دلوں میں ڈال دیا ہے۔ بس۔ یہ غیر ارادی اور غیر شعوری طور پر ہے۔ جانوروں میں جتنا علم ہے وہ ان کے اندر سیکھنے سے نہیں آتا، من جانب اللہ تکوینی طور پر ان کے قلب میں ڈال دیا جاتا ہے۔ وہ عالم بن جاتے ہیں۔ لیکن انسان تکوینی علم کے ساتھ ساتھ کسبی علم بھی رکھتا ہے کہ سیکھتا بھی ہے، سکھاتا بھی ہے۔ جو اس کے ذہن میں ہے اسے دوسرے کی طرف منتقل کرتا ہے۔ اس علم پر تربیت دیتا ہے۔ ٹرینڈ کرتا ہے، مشاق بناتا ہے۔ یہ معلمی کی خصوصیات وہ ہے کہ عالم میں انسان کے سوا کسی کو حاصل نہیں ہے، نہ فرشتوں میں تعلیم و تربیت ہے، نہ جنات میں تعلیم و تربیت ہے، نہ حیوانات میں ہے۔ گویا انسان میں علم متعدی ہے۔ طوطے کو اگر معلوم ہے تو اس کے اندر ہے۔ دوسرے کو وہ نہیں سکھلا سکتا۔ دوسرے طوطے کو جتنا آئے گا وہ پھر خدا کی طرف سے آئے گا وہ محدود ہے۔ وہ تیسرے طوطے کو نہیں سکھلا سکتا۔

فرشتے میں جو علم آئے گا وہ اس کی ذات کے لئے ہے، وہ دوسرے کی طرف منتقل نہیں کر سکتا۔ انسان کو جو علم ملا ہے وہ اپنے بچوں کو پڑھاتا ہے، وہ اگلوں کو پڑھاتے ہیں، تو ازل کا علم ابد تک چلتا رہتا ہے، یہ صرف انسانی خصوصیت ہے۔ تو معلمی، تعلیم و تلقین اور تربیت یہ انسانی خاصہ ہے اور یہ وجہ اشرفیت اور بناءِ افضلیت ہے۔ انسان

---

① پارہ: ۱ سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۳۳. ② پارہ: ۱ سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۳۲.

کہہ سکتا ہے کہ میں سب سے افضل ہوں کہ جو چیز میرے اندر ہے وہ کسی میں نہیں کہ میں اپنا علم ہزاروں تک منتقل کر سکتا ہوں۔ دوسرے اپنا علم منتقل نہیں کر سکتے۔ کیوں کہ ان تک بھی علم منتقل ہو کر نہیں آیا۔ ان کی طبیعت میں مرکوز ہے۔ ان کو اس کا بھی شعور نہیں کہ ہم میں علم ہے مگر ان کے اندر علم ہے۔ اور انسان کو شعور ہے کہ مجھے سو مسئلے معلوم ہیں اور میں ان سو کو دوسرے تک پہنچا سکتا ہوں۔ تو سب سے بڑی انسان کی خصوصیت تعلیم اور تربیت ہے۔ یعنی اکتسابی علم، جدوجہد سے علم حاصل کرنا اور جدوجہد کے ذریعے دوسرے تک علم پہنچانا۔ تو ایک علم لازم ہے جو سب کے اندر ہے اور ایک علم متعدی ہے وہ صرف انسان میں ہے کہ دیئے سے دیا جلتا رہتا ہے۔ جو علوم آدم علیہ السلام کو عطاء کیے گئے۔ وہ آج تک محفوظ ہیں۔ ہزار ہا برس گزرنے کے بعد فطری طور پر منتقل ہوتے چلے آرہے ہیں۔ اس میں نوح علیہ السلام نے جو اضافہ کیا وہ اضافہ بھی آج موجود ہے۔ جو ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے اضافہ کیا وہ بھی محفوظ ہے۔ موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام نے جو علمی اضافے کیے وہ بھی موجود ہیں۔ پھر ان پر تکمیل کا لیبل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لگایا کہ ہر چیز اور علم کے ہر دائرے کو اتنا مکمل کر دیا کہ نوعی طور پر اس میں اب بڑھنے کی گنجائش نہیں رہی۔ ایسے اصول و کلیات بتلائے کہ قیامت تک لاکھوں جزئیات ان کے نیچے سے نکلتی رہیں گی اور انسان ان علوم کے اندر تشنہ نہیں رہے گا۔ تو سارے انبیاء علیہم السلام کے علوم و کمالات تعلیم ہی کے ذریعے آگے منتقل ہوئے ہیں، تربیت ہی کے ذریعے آگے منتقل ہوئے ہیں۔ تو تعلیم و تربیت برابر چلتی رہی ہے اور بڑھتی رہی ہے۔

یہ چیز انسان کے سوا کسی میں نہیں۔ اس لئے کہا جائے گا کہ یہی افضلیت کی بناء ہے کہ یہ معلّم ہے۔

عظمتِ تعلیم نبوی صلی اللہ علیہ وسلم...... نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: "اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا" ① میں تو معلّم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ یعنی عالم تو آپ اتنے بڑے ہیں کہ کائنات میں کوئی اتنا بڑا عالم نہیں، اللہ کے بعد اگر علم میں رتبہ ہے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے۔ تو ایک ہے آپ کا عالم ہونا اور ایک ہے کہ دوسروں کو یہ علم پہنچا کر عالم بنا دینا۔ یہ سب سے بڑا کمال ہے کہ اپنی حیاتِ طیبہ میں ایک لاکھ چوبیس ہزار (یا کم و بیش) افراد کے مقدس نمونے تیار کر دیئے جو آپ کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے، آپ کے نقشِ قدم پر چلنے والے تھے۔ آپ کے پسینے پر اپنے قطراتِ خون چھڑکنے والے تھے۔

ایک لاکھ چوبیس ہزار نمونے تیار کر دیئے۔ یہ تعلیم و تربیت ہی نے تیار کئے۔ تعلیم کے ذریعے مسائل سکھلائے۔ اور تربیت کے ذریعے قلوب کی راہ کو درست کیا، دلوں میں تصرّف کیا۔ وہ باطنی تعلیم ہے کہ دل سے دل تک علوم اور کمالات کو پہنچایا۔

تصرّف تعلیمِ باطن...... جیسے حدیث میں ہے کہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے بارے میں ہے کہ حضرت خباب بن ارت رضی اللہ عنہ نماز پڑھا رہے تھے۔ اور قرآن کریم کے بارے میں فرمایا گیا ہے۔ "اُنْزِلَ الْقُرْاٰنُ عَلٰی

---

① السنن للامام ابن ماجه، کتاب السنة، باب فضل العلماء والحث علی طلب العلم، ج: ۱، ص: ۲۶۵، رقم: ۲۲۵.

سَبْعَةِ اَحْرُفٍ" ①

ابتداء میں سات لغات میں قرآن پڑھنے کی اجازت دی گئی تھی۔ تو وہ نماز میں اپنی لغت کے مطابق قرآن پڑھ رہے تھے۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو لغت قریش میں قرآن یاد تھا۔ معنی میں تو فرق نہیں پڑتا مگر لغت بدلی ہوئی ہے۔ عرب میں سات بڑے بڑے قبیلے تھے، جن کی لغت فصیح تھا۔ سب سے اعلیٰ ترین قبیلہ قریش کا تھا، پھر بنی تمیم، پھر بنی ہذیل وغیرہ، یہ سب قبائل تھے۔ اور یہ ایسا فرق تھا جیسا دہلی اور لکھنؤ کی زبان میں ہے یا دہلی اور حیدرآباد کی زبان میں۔ اردو سب بولتے ہیں مگر کچھ لب ولہجے کا فرق، کچھ محاورات کا فرق اور کچھ اصطلاحات کا فرق ہے۔ تو معانی وہ بھی وہی سمجھاتے ہیں جو دہلی والے اور لکھنؤ والے۔ مگر انہی معنی کے سمجھانے کے لئے ان کے ہاں اور لغت ہے، ان کے ہاں اور لغت ہے۔ مقصود دونوں کا ایک ہے۔ لب ولہجہ الگ ہے۔ بہرحال ابتداءِ اسلام میں سات لغت میں قرآن پڑھنے کی اجازت تھی۔ حضرت خباب رضی اللہ عنہ نے اپنی لغت میں قرآن پڑھا۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ ان کے پیچھے آکے سننے لگے تو وہ دوسری لغت تھی۔ وہ تو "اَشَدُّهُمْ فِيْ اَمْرِ اللّٰهِ" تھے۔ وہ تو ایک دم شدت تھی، انہوں نے اسی وقت حضرت خباب رضی اللہ عنہ کی پگڑی اتار کر مشکیں کس دیں اور کہا:

منافق! قرآن غلط پڑھتا ہے؟ میں ابھی تیری گردن اڑا دوں گا۔ اور گھسیٹتے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے گئے۔ اور عرض کیا: یا رسول اللہ! یہ قرآن غلط پڑھتا ہے۔

آپ نے فرمایا: چھوڑ دو۔ اور حضرت خباب سے فرمایا پڑھو۔ انہوں نے اپنی لغت پر پڑھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "هٰكَذَا اُنْزِلَتْ" "یوں ہی نازل ہوا" حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا تم پڑھو! انہوں نے لغت قریش میں پڑھا۔ فرمایا: "هٰكَذَا اُنْزِلَتْ" "یوں ہی نازل ہوا"۔

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے دل میں ایک وسوسہ پیدا ہوا کہ یہ کیسا قرآن ہے۔ جو جس طرح پڑھ دے تو فرما دیا جاتا ہے "هٰكَذَا اُنْزِلَتْ" یوں ہی نازل ہوا ہے۔ ریب اور شک کی کیفیت وسوسہ کے درجے میں آئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً سینے پر ہاتھ مارا اور فرمایا: "يَا ابْنَ الْخَطَّابِ!" (حضرت عمر رضی اللہ عنہ) کہتے ہیں۔ مجھے یوں معلوم ہوا جیسے تمام آسمان مجھ پر منکشف ہو گئے شرح صدر ہو گیا، حقیقت حال سمجھ میں آ گئی۔ یہ بھی تعلیم تھی مگر یہ لسانی تعلیم نہیں تھی، باطن کے اندر تصرف تھا۔

دستِ مبارک کا سینے پر پھیر دینا، قلب پر ہاتھ کا مارنا یہ باطنی تعلیم تھی۔ قلبِ نبوت کا فیضان ہاتھ کی حرکت سے ان کے قلب تک پہنچا، جیسے بجلی کا کرنٹ آپ ایک لوہے کے تار لیں اور دوسرا تار اس میں ملائیں اور پھر آدمی تک پہنچائیں ان واسطوں سے پورا کرنٹ اس کے اندر سما جائے گا۔ تو قلب کا جو علمی کرنٹ تھا وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دستِ مبارک کے ذریعے سے پہنچایا، یہ باطنی تصرف تھا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے زبان سے

---

① الصحيح للبخاري، كتاب فضائل القرآن، باب انزل القرآن على سبعة احرف، ج: ۱۵، ص: ۳۹۰.

بھی تعلیم دی۔ قلبِ مبارک کی توجہ سے بھی تعلیم دی۔ دستِ مبارک کے تصرفات سے بھی تعلیم دی۔ یہ صرف انسان کا خاصہ ہے۔ انبیاء علیہم السلام معلّمین اوّلین ہیں جنہوں نے دنیا کو تعلیم و تربیت دینا سکھلایا۔ یہ انسان کی سب سے بڑی خصوصیت ہے جس کی بناء پر یہ افضل ہے۔

نبوت تعلیم ہی ہے...... نبوت بھی تو تعلیم ہی کا نام ہے۔ نبی اس لئے آتے ہیں کہ انباء کریں۔ انباء خبر دینے اور علم پہنچانے کو کہتے ہیں۔ تو نبوت کا حاصل ہی تعلیم و تربیت ہے اور نبوت سے بڑا کوئی مقام نہیں۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم سے بڑھ کر کوئی مقام نہیں۔ تو تعلیم وہ خصوصیت ہے جو انسان کے سوا کسی کو نہیں دی گئی۔ جنات و ملائکہ میں کوئی پیغمبر نہیں۔ بلکہ ملائکہ اور جنات انبیاء بشری کے تابع بنائے گئے ہیں۔ جیسا کہ اس عالم میں یہودی بھی ہیں، نصرانی بھی ہیں، عیسائی بھی ہیں اور مسلم بھی ہیں۔ اسی طرح سے جنات کے اندر یہودی بھی ہیں، عیسائی بھی ہیں، نصرانی بھی ہیں دہریئے بھی ہیں، ملحد بھی ہیں، بددین بھی ہیں۔ سب طرح کے موجود ہیں۔ وہ بھی انہیں انبیاء علیہم السلام کے اوپر ایمان لائے تھے۔ بعضے عیسائی ہیں۔ بعضے موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے۔ بعضے ان سے پہلے پیغمبروں پر ایمان لائے۔ ان میں پیغمبری نہیں ہے۔ پیغمبری بشر کے اندر ہے اور جنات تابع بنائے گئے ہیں۔ پیغمبری کے معنی سوائے تعلیم و تربیت کے اور کیا ہیں؟ صرف یہ کہ علم پہنچ کر ان کو روشن بنایا جائے اور علم سے منور بنایا جائے۔ تو یہ سب سے بڑی خصوصیت ہے جس سے انسان اشرف الکائنات اور افضل المخلوقات بنا۔

بلا تعلیم انسانیت ختم ہو جاتی ہے...... اس کا حاصل یہ نکلا کہ جب یہ انسان کی خصوصیت ہے۔ تو خصوصیت کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ جب تک وہ خصوصیت رہتی ہے انسان انسان رہتا ہے۔ جب وہ خصوصیت ختم ہو جائے تو انسانیت ختم ہو جاتی ہے۔ اگر تعلیم انسان کی خصوصیت ہے تو جب تک تعلیم انسانوں میں موجود ہے۔ انسان انسان رہتا ہے۔ جب تعلیم نکل جائے گی ان کی انسانیت خطرے میں پڑ جائے گی۔ ناقص و نا تمام رہ جائے گی اور جب تعلیم نہیں رہے گی، علم نہیں رہے گا، تو علم جب ضد ہے تو آدمی جمادات و نباتات سے بھی بدتر ہو جائے گا۔ اس سے اندازہ ہوا کہ انسان کی برتری تعلیم و تعلّم سے اور تربیت سے ہی قائم ہے۔ یہ ضد ہے تو انسان انسان نہیں ہے۔

مدارس بقاءِ انسانیت کا ذریعہ ہیں...... آج جو مدارس و مکاتب قائم کئے جا رہے ہیں، یہ دراصل انسانی خصوصیت کو اجاگر کیا جا رہا ہے۔ انسان کی افضلیت کو برقرار رکھنے کے لئے یہ سب کچھ کیا جا رہا ہے۔ اگر یہ مدارس قائم نہ کئے جائیں، یہ جوامع قائم نہ کی جائیں اور تعلیم نہ دی جائے اور فرض کیجئے کہ تعلیم مٹ گئی تو انسانیت مٹ گئی، یہ تعلیم و تعلّم کا سارا جھگڑا انسان کی بقاء کے لئے ہے۔ کیونکہ یہ خصوصیت ہے۔

اس لحاظ سے جامعہ قاسمیہ کا قائم ہونا یہ ایک سعادت ہے اور مبارک علامت ہے۔ یہ انسانیت کے برقرار رکھنے کا ایک سلسلہ ہے۔ جتنا مضبوط ہوگا اتنی انسانیت مضبوط ہوگی۔ جتنی نیک نیتی اور اخلاص سے تعلیم دی جائے گی، اتنا ہی فی الحقیقت آدمیت کو اونچا بنایا جائے گا۔

علم مستند...... اور کوئی علم اس وقت تک اونچا نہیں ہوتا جب تک اس کا انتساب صحیح نہ ہو، علم تو ہزاروں ہیں لیکن جب آپ یہ کہیں گے کہ یہ علم مجھے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہنچا ہے تو وہ علم مستند ہو جائے گا، جیسے مہر لگ گئی، پکا ہو گیا۔ اگر آپ یوں کہیں کہ میری رائے یوں ہے، دنیا کہے گی آپ اپنی رائے اپنے پاس رکھیں، ہماری رائے یہ ہے، ہر انسان کی الگ الگ رائے ہے۔ لیکن جب انسان یوں کہے گا کہ جو کچھ کہہ رہا ہوں اللہ کے رسول کا کہا ہوا کہہ رہا ہوں، جوں ہی گردن جھکا دی جائے تو وہ کہے گا بے شک گردن جھکی ہوئی ہے۔

یہ کیا چیز ہے؟ برگزیدہ شخصیت کی طرف علم کی نسبت قائم ہوگئی۔ تو علم میں انتساب سے مقبولیت آتی ہے۔ اگر انتساب نہ ہو مقبولیت نہ ہوگی۔

اس کی وجہ فی الحقیقت یہ ہے کہ علم ایک وراثت ہے۔ جیسے حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''إِنَّ الْأَنْبِيَاءَ لَمْ يُوَرِّثُوا دِينَارًا وَّلَا دِرْهَمًا وَلٰكِنْ وَرَّثُوا الْعِلْمَ'' ① انبیاء (علیہم السلام) اپنے ورثے میں درہم و دینار نہیں چھوڑتے، روپیہ پیسہ نہیں چھوڑتے، محلات اور بلڈنگیں نہیں چھوڑتے، وہ اپنے ترکے میں علم و معرفت اور اخلاقی کمالات اور باطنی و ظاہری علوم چھوڑتے ہیں۔ یہ انبیاء علیہم السلام کا ورثہ ہے۔

علمی وراثت کی شرط...... اور فرماتے ہیں: ''اَلْعُلَمَاءُ وَرَثَةُ الْأَنْبِيَاءِ'' ① علماء اس ورثے کو پاتے ہیں۔ لیکن وراثت کب ملتی ہے؟

جب نسب صحیح ہو۔ باپ کا وارث بیٹا تب بنتا ہے جب یہ ثابت ہو جائے کہ واقعی اس باپ کا بیٹا ہے۔ اور اگر بیٹا ہی یوں کہے کہ یہ میرا باپ ہی نہیں، پھر کہاں سے وراثت مل جائے گی، یا سلسلے کے بیچ میں کوئی انقطاع پڑ جائے۔ دادا سے ایک جائداد چلتی آرہی ہے اس کے باپ تک پہنچی۔ اس نے بیچ میں ایک واسطہ قطع کر دیا۔ تو میراث سلسلے سے آرہی تھی، جب سلسلہ نہیں رہا، میراث رک جائے گی۔ تو میراث جب ملتی ہے جب مورثِ اعلیٰ تک سلسلہ یکسانی کے ساتھ قائم ہو، مثلاً علوم دین، علوم اسلام میں اور ان علوم میں جو اللہ تک پہنچانے والے ہیں۔ ہمارے مورثِ اعلیٰ جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ آپ کی اوّلین روحانی اولاد صحابہ کرامؓ ہیں۔ صحابہؓ کے بعد دوسری پشت تابعین عظام ہیں۔ تابعین کے بعد تبع تابعین ہیں۔ تبع تابعین کے بعد پھر ائمہ کرام، علمائے مجتہدین اور محدثین و فقہاء درجہ بدرجہ، طبقہ بطبقہ یہ سب وارث بنتے چلے آرہے ہیں اور ایک سلسلہ قائم ہے۔

تو آج آپ قرآن پڑھیں گے تو یوں کہیں گے کہ قرآن میرا اور میرے باپ کا بنایا ہوا نہیں، یہ اللہ کے رسول کا لایا ہوا ہے اور یہ میرا سلسلہ ہے اور میں نے یہ حدیث فلاں سے سنی، اس نے فلاں سے سنی اور اس نے فلاں سے سنی۔ سلسلہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ جائے گا۔ ایک ایک حدیث کی سند محدثین کے یہاں موجود ہے۔

---

① السنن لأبي داؤد، كتاب العلم، باب الحث على طلب العلم ج: ۱ ص: ۲۷ رقم: ۳۱۷.

② السنن للترمذي، كتاب العلم، باب ماجاء في فضل الفقه على العبادة ج: ۹ ص: ۲۹۶.

پھر احادیث کی قسمیں ہیں کہ سند اگر شبہ سے بالاتر ہو اور مورث یقین ہو تو وہ حدیث قرآن کے درجے میں آ جائے گی، جیسے اس کا منکر کافر ویسے اس کا منکر بھی کافر۔ اگر مورث یقین نہیں ہے مورث ظن ہے تو اس کا منکر کافر نہیں ہوگا مگر فاسق ہو جائے گا اور مبتدع کہلائے گا۔ اگر اس سے بھی کم درجہ ہے یعنی شبہات ہیں تو اس کا منکر نہ کافر ہوگا نہ فاسق، تو حدیث کے علم کا درجہ استناد پر موقوف ہے۔ اسی لئے محدثین نے چار لاکھ افراد کے قریب جو راویانِ حدیث ہیں۔ ان کی سوانح عمری مرتب کر دی کہ ان کا کردار کیسا تھا؟ ان کا کیریکٹر کیسا تھا؟ کس طرح سے یہ حدیث منتقل ہو کر آئی، تو ایک مسلمان کو بحمد اللہ یہ خصوصیت حاصل ہے کہ وہ اپنے رسول کے ایک جملے کو سنے گا تو رسول تک سند پہنچا دے گا۔ گویا مطلب یہ ہے کہ اس سند کے ساتھ یہ علم کی وراثت مجھ تک پہنچ گئی ہے۔ اس لئے میں صحیح معنی میں روحانی طور پر اولادِ رسول ہوں اور میں صحیح وارث ہوں۔ تو وراثت تب ملتی ہے جب اوپر سے لے کر نیچے تک نسب ملا ہوا ہو۔ اگر بیچ میں انقطاع ہو جائے وراثت ختم ہو جاتی ہے۔

تو یہی روحانی وراثت میں بھی ہے کہ علم کی وراثت تب ملے گی کہ یہاں سے لے کر تلمذ اور شاگردی کا سلسلہ قائم ہونا چاہئے کہ یہ میرا استاذ اور یہ میرے استاذ کا استاذ اور آگے تک سلسلہ پہنچ جائے۔ اور وہ بھی بصیرت کے ساتھ یعنی راویوں کے احوال اور کردار کے ساتھ۔

اگر بیچ میں سے آپ خدانخواستہ صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کو نکال دیں پھر ہم تک علم پہنچتا ہی نہیں۔ تابعین کو نکال دیں، علم نہیں پہنچے گا۔ اس لئے کہ زنجیر ٹوٹ گئی یا آپ کسی کو استاذ نہ بنائیں اور یوں کہیں کہ میرے اوپر یہ علم آیا ہے پھر تو سرے سے نسب ہی قائم نہ ہوا تو وراثت وہ نہ رہی جو پیغمبر کی تھی۔ کچھ آپ کے وساوس اور کچھ اوہام ہوں گے۔ جن کو آپ نے علم سمجھ لیا۔ علم تو وہ ہے جو سند کے ساتھ منتقل ہو کر آپ تک پہنچے۔

علومِ اسلامیہ کی خصوصیت...... یہ اسلام کی خصوصیت ہے، آج دنیا میں کس قوم کے پاس خدائی کتابوں کی سند موجود ہے؟ اور مسلمانوں میں پیغمبر کے کلام تک کی سند موجود ہے۔ وہ روایت یہاں سے لے کر اوپر تک ملا سکتے ہیں۔

اہتمامِ استناد...... اور قرآن و حدیث تو بجائے خود ہے، فقہ کی جو کتابیں ہیں، ان کی سند موجود ہے۔ اگر امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے مبسوط لکھی ہے تو مبسوط کی روایت موجود ہے کہ یہ ہمیں فلاں سے پہنچی، انہوں نے فلاں سے سنا اور انہوں نے فلاں سے۔ تصوف کی سند موجود ہے۔ رسالہ قشیریہ جو تصوف کی بنیادی کتاب ہے۔ جتنے تصوف کے مسائل اور اصطلاحات ہیں ان کی سند جنید و شبلی تک اس میں پہنچائی گئی ہے۔ اور جنید و شبلی سے آگے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک۔ تو یہ اسلام کی خصوصیت ہے کہ اس امت نے ہر دینی فن کو سند کے ساتھ قبول کیا ہے۔ بلا سند اور بلا حجت کے کوئی بات نہیں ہے۔ لفظوں کی بھی روایت کی ہے تو سند موجود ہے۔ مثلاً میں نے قرآن شریف حفظ کیا، اگر میں سند پڑھوں تو اللہ میاں تک سلسلہ پہنچا سکتا ہوں، مجھے تجوید کے ساتھ میرے استاذ قاری عبدالوحید خان صاحب نے حفظ کرایا، انہیں تجوید کے ساتھ قاری عبدالرحمٰن صاحب رحمانی نے حفظ کرایا،

انہیں قاری ابراہیم صاحب مکی نے تجوید کے ساتھ حفظ کرایا۔ اس طرح حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ تک سند پہنچ جائے گی اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حفظ کرایا۔ تو جتنے مجودین اور قراء ہیں ان سب کی سند موجود ہے۔

تصوف کے سلسلہ میں یہ جو شجرے پڑھے جاتے ہیں یہ سند ہی تو ہے کہ میں نے فلاں شیخ سے بیعت کی۔ اس نے فلاں سے کی، اس نے فلاں سے کی اور سلسلہ حضرت علی رضی اللہ عنہ تک پہنچا دیتے ہیں اور پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک۔ تو یہ جو شجرہ ہے یہ درحقیقت نسب نامہ ہے، یہ رواۃ کا سلسلہ ہے۔ تو فقہاء کے ہاں الگ سند، محدثین کے ہاں الگ سند، قراء اور مجودین کے ہاں الگ سند، صوفیاء کے ہاں الگ سند ہے۔ ہر چیز سند سے ہے جو دوسروں کے ہاں نہیں پائی جاتی۔

بقائے سلاسل تعلیم ہی کے ذریعے ممکن ہے..... تو مسلمانوں کی یہ خصوصیت ہے۔ اس خصوصیت کا حاصل یہی نکلتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کو پڑھایا، سلسلہ ہم تک پہنچ گیا۔ یہ تعلیم ہی سے پہنچا ہے۔ محض علم سے نہیں پہنچا۔ علم جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے وہ آپ کی ذات بابرکات کے ساتھ خاص ہے۔ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم تعلیم نہ دیتے تو ہم کیسے عالم بنتے؟ ہم تک علم کیسے پہنچتا؟ تو تعلیم کے ذریعے ہم تک علم پہنچا۔ تو درحقیقت انسانی خصوصیت اور بشری کمال تعلیم و تعلم میں منحصر ہے۔ یہی افضلیت کی وجہ ہے جس نے انسان کو کائنات پر بڑھایا ہے۔ ورنہ مطلق علم تو حیوانات میں بھی ہے۔ تھوڑے بہت کا فرق ہے۔ آپ میں زیادہ ہے ان میں کچھ کم ہے۔ لیکن ہے۔ مگر کوئی معلم نہیں۔ انسانوں میں سب سے پہلے معلم حضرات انبیاء علیہم السلام ہیں، پھر ان کے بعد ان کے اصحاب کرام ہیں۔ پھر ائمہ عظام، پھر علماء ربانیین۔

تردید باطل تعلیم پر موقوف ہے..... "يَحْمِلُ هٰذَا الْعِلْمَ مِنْ كُلِّ خَلَفٍ عُدُوْلُهُ يَنْفُوْنَ عَنْهُ تَحْرِيْفَ الْغَالِيْنَ وَ انْتِحَالَ الْمُبْطِلِيْنَ وَ تَأْوِيْلَ الْجَاهِلِيْنَ." ① نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر قرن اور ہر دور میں اس علم کو اٹھاتے رہیں گے، سلف سے منتقل کر کے ہر زمانے میں خلف موجود ہوں گے جو علم کو لیتے رہیں گے اور صحیح مستند پیغمبر کا علم پہنچتا رہے گا۔ جو اخلاف رشید ہوں گے وہ اسلاف سے علم لیتے رہیں گے اور آگے چلا کرتے رہیں گے۔

اس علم کی بدولت ہر قرن میں ایسے لوگ رہیں گے جو غلو کرنے والوں کی تحریفات کا پردہ چاک کرتے رہیں گے اور مبطلین کی دروغ بافیوں کا پردہ چاک کرتے رہیں گے اور جاہلوں کی رکیک تاویلات کو چاک کرتے رہیں گے۔ ہر زمانے میں ایسے لوگوں کے ہونے کی خبر دی گئی۔

وہ ہوں گے تو تعلیم ہی کے ذریعے سے ہوں گے، تو اصل بنیادی چیز تعلیم ہے۔ جس پر امت کا دارومدار ہے، افراد کا دارومدار ہے۔ اور اشخاص کا دارومدار ہے۔ اور تعلیم کے لئے مدارس قائم کئے جاتے ہیں۔ اس لئے

---

① الحديث اخرجه الامام البيهقي في سننه الكبرىٰ ج: ۱۰ ص: ۲۰۹ . و الهيثمي وضعفه، مجمع الزوائد. ج: ۱ ص: ۱۴۰ .

مدارس فی الحقیقت انسانیت کی بقاء کے لئے قائم ہو رہے ہیں۔ انسانیت اجاگر نہیں ہو سکتی اور خصوصیت انسانی باقی نہیں رہتی اگر مدارس و مکاتب نہ ہوں، اس لئے میں اپنے عزیز کو اور ان حضرات کو جو ان کے معاون ہیں۔ اس جامعہ قاسمیہ کے قیام پر مبارکباد دیتا ہوں۔

تعلیم و تعلّم کے لحاظ سے برگزیدہ شخصیت...... اور اس سے بھی زیادہ اس پر کہ اس جامعہ قاسمیہ میں جو تعلیم دی جائے گی اس کا ایک ہستی کی طرف استناد کیا گیا ہے جو فی الحقیقت علم میں بھی اونچی ہے اور عملی میں بھی اونچی ہے۔ دارالعلوم دیوبند کو حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے قائم کیا اور دس بارہ شاگرد ایسے پیدا اور مہیا کئے کہ اس وقت ہندوستان میں علوم حدیث کا دار و مدار انہی پر ہے۔ دارالعلوم میں تو حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ نے چالیس برس تک حدیث کا درس دیا۔ ہزاروں طلبہ و فضلاء ان سے فیضیاب ہوئے۔ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے فضلاء اور شاگرد کون ہیں؟

علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ جو آپ کے پاکستان کے شیخ الاسلام ہیں۔ مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ جو وہاں شیخ الاسلام کہلاتے ہیں۔ مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ مولوی عبد العلی صاحب رحمۃ اللہ علیہ مدرسہ عبد الرب کے محدث تھے۔ مولانا احمد حسن صاحب امروہی رحمۃ اللہ علیہ جو مدرسہ شاہی مراد آباد کے محدث تھے۔ تو جہاں جہاں یہ بڑے بڑے مدارس ہیں۔ حضرت کے تلامذہ نے وہاں حدیث پہنچائی اور فقہ پہنچایا۔

افادیتِ مدارس...... اور یہ خاص حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی شان تھی کہ دارالعلوم دیوبند قائم کر کے جہاں جہاں گئے مدارس قائم کرتے چلے گئے۔ امروہہ میں مدرسہ قائم کیا، مراد آباد میں مدرسۃ الغرباء قائم کیا، انبیٹھہ، شاہجہان پور اور بریلی میں مدارس قائم کئے۔ اسی طرح گلاوٹھی میں قائم کیا اور اپنے شاگردوں اور مریدین کو تاکید کی کہ جہاں رہو مدرسے قائم کرو! آج ہم دیکھتے ہیں کہ جہاں جہاں مدارس ہیں وہیں کچھ علم کی روشنی پائی جاتی ہے۔ جہاں مدارس نہیں جس کا جو جی چاہے کہتا ہے۔ ظلمت پھیلی ہوئی ہے، مستند علم کا نشان نہیں ہے، یا موضوع روایتیں ہیں جو لوگ پڑھ دیتے ہیں یا غیر مستند باتیں ہیں، لیکن محدثانہ اور محققانہ طرز پر بیٹھ کر سندِ صحیح کے ساتھ علم کو پہنچانا اور پرکھ کر دینا، یہ چیز نہیں پائی جاتی۔ جہاں مدارس ہیں وہاں پائی جاتی ہے۔

درجاتِ تربیت...... اس آیت میں یہی فرمایا گیا کہ ﴿مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ﴾ کسی بشر کے لئے زیبا نہیں اور جائز نہیں ہے۔ کسی بشر کے لئے؟ جس کو اللہ تعالیٰ علم دے، نبوت دے، وہ لوگوں سے یوں کہے کہ لوگو! میرے بندے بن جاؤ اور میری عبادت کرو۔ یہ اس کے لئے جائز نہیں۔ وہ یوں کہے گا۔ ﴿وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ﴾ ① ربانی بنو رب والے بنو اللہ والے بنو میرے بندے مت بنو اور ربانی کسے کہتے ہیں؟

---

① پارہ: ۳، سورۃ اٰل عمران، الآیۃ: ۷۹.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے صحیح بخاری میں اس کی تفسیر فرمائی کہ ربانی کون ہے؟ فرماتے ہیں ”اَلَّذِیْ یُرَبِّی النَّاسَ بِصِغَارِ الْعِلْمِ ثُمَّ بِکِبَارِھَا“ ① ربانی وہ ہے کہ مخلوقِ خدا کو چھوٹے چھوٹے مسائل سے تربیت دے کر بڑے مسائل تک پہنچائے۔ محض بڑے بڑے کبیر اور کلیاتی مسائل کا پیش کرنا ربانی کی شان نہیں ہوتی۔ ربانی تو جزئیات پیش کرتا ہے۔ کہیں نماز کے مسائل، کہیں وضو کے مسائل، کہیں نکاح وطلاق کے مسائل، کہیں معاشرت کے۔ چھوٹی چھوٹی جزئیات پر تربیت کرتا ہے۔ اس کے بعد بڑے بڑے علوم سامنے لاتا ہے۔ اسے اس سے اپنی ہیچ مدانی محسوس نہیں ہوتی کہ میں اتنا بڑا عالم ہوں۔ میں نماز کا کیا مسئلہ بیان کروں؟ وضو کا مسئلہ کیا بیان کروں۔ یہی سب سے بڑی کائنات ہے کہ ابتداء مخلوق کو چھوٹے مسائل سے تربیت دے تاکہ عملی زندگی درست ہو۔ پھر اونچے اونچے مسائل بیان کرے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور عرض کیا: ”عَلِّمْنِیْ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ غَرَائِبَ الْعِلْمِ“ یا رسول اللہ! علم کے کچھ عجائبات، کچھ نکتے اور کچھ لطیفے ارشاد فرمایئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ”ھَلْ عَرَفْتَ رَأْسَ الْعِلْمِ؟“ یہ جو علم کے کچھ لطیفے اور نکتے سیکھنے آیا ہے کیا اصل علم بھی تیرے پاس ہے؟ بنیادی علم بھی تیرے پاس ہے جس کے اوپر نکتوں کی تعمیر کھڑی کی جائے؟

اس نے عرض کیا کہ: ”مَاشَاءَ اللّٰہُ“۔ جتنا اللہ نے چاہا فرمایا: ”ھَلْ عَرَفْتَ اللّٰہَ؟ قَالَ مَاشَاءَ اللّٰہُ“ جتنی میری استعداد تھی پہچان چکا ہوں۔ فرمایا: ”ھَلْ عَرَفْتَ الْمَوْتَ؟“ تو نے اپنی موت کو پہچان لیا؟ ”قَالَ مَاشَاءَ اللّٰہُ“ فرمایا! پہلے ان دو علموں کا حق ادا کر کے آ۔ پھر ہمارے پاس آنا۔ پھر ہم عجائبات بتلائیں گے۔ پہلے ان چیزوں پر تو عمل کرلے۔ تو ربانی وہ ہے کہ عمل کی چھوٹی چھوٹی چیزیں بتلائے اور رفتہ رفتہ بڑے علوم تک پہنچائے، تو قرآن حکیم میں فرمایا کہ ہم جس کو علم وحکمت اور نبوت دیتے ہیں اس کا یہ منصب نہیں ہے کہ وہ لوگوں سے یہ کہے کہ لوگو! میرے بندے بن جاؤ، میری عبادت کرو۔ وہ یوں کہے گا۔ ②

بلا تعلیم ربانیت پیدا نہیں ہوتی …… ﴿وَلٰکِنْ کُوْنُوْا رَبّٰنِیّٖنَ﴾ تم ربانی بنو، رب والے بنو اور کس طرح سے؟ آگے صورت بتلائی۔ ﴿بِمَا کُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْکِتٰبَ وَبِمَا کُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ﴾ ③ کتاب کی جو تعلیم دیتے ہو اور درس وتدریس کا جو مشغلہ اختیار کرتے ہو اس کے سبب سے تمہیں ربانی بننا پڑے گا۔

حاصل یہ نکلا کہ درس وتدریس کا مشغلہ نہ ہو تو ربانیت کا پیدا ہونا مشکل ہے۔ محض وعظ گوئی سے اور محض

---

① الصحیح للبخاری، کتاب العلم، باب العلم قبل القول والعمل، ج: ۱، ص: ۱۱۷. ② احیاء علوم الدین، کتاب العلم، باب وبیان علامات علماء الآخرة ج: ۱ ص: ۷۰. علامہ عراقی فرماتے ہیں: رواہ ابن السنی وابو نعیم فی کتاب الریاضة لھما، وابن عبدالبر من حدیث عبداللّٰہ بن المسور مرسلا وھو ضعیف جداً دیکھئے: تخریج احادیث الاحیاء ج: ۱ ص: ۱۵۵. ③ پارہ: ۳، سورة آل عمران، الآیة: ۷۹.

تقریروں سے ربانی نہیں بنایا جاسکتا۔ تقریریں تو مذکرات ہیں جو بھولا ہوا سبق یاد دلا دیتی ہیں۔ تقریر تربیت کی چیز تھوڑا ہی ہے۔ یہ تو وقتی بات ہوتی ہے۔ تو تقریر یا خطابت یہ تربیت نہیں کرسکتیں یہ تو محض مذکر ہیں۔ اور یاد دہانی تو اس کی کی جائے گی جس سبق کو آدمی پہلے پڑھ چکا ہو اور جو پڑھا ہی نہ ہو تو یاد کا ہے کو دلایا جائے گا؟ تو حقیقت میں مربی جو شے ہے وہ تعلیم اور تدریس ہے اور تعلیم وتدریس بھی کتاب کے ساتھ۔ ﴿تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ﴾ یعنی کتاب اللہ سامنے ہو اور اس کا درس دو۔ اس کی تعلیم دو جو علوم کا سرچشمہ ہے۔ تو اس کا حاصل یہ نکل آیا کہ ربانیت بغیر تعلیم وتربیت کے پیدا نہیں ہوتی اور تعلیم وتعلم ہی انسان کی خصوصیت ہے جو دوسروں میں نہیں پائی جاتی۔ تو معلوم ہوا کہ حقیقی معنی میں ربانی بنانا یہ انسان کا کام ہے دوسروں کا کام نہیں ہے، حتی کہ ملائکہ بھی اگر جدوجہد کریں تو انسانوں کو ربانی نہیں بنا سکتے وہ زیادہ سے زیادہ علم لاکر پہنچا دیں گے۔ چاہے انہیں معنی معلوم نہ ہوں۔ جیسے کتاب علم پہنچا دیتی ہے۔ لیکن حقیقی معنی میں اس کو سمجھنے والا اور سمجھانے والا انسان ہوگا۔ اس واسطے علم ہو اور علم کے بعد تعلیم ہو، تعلیم کے بعد استناد ہو، اس کی سند اور نسبت صحیح ہو، یہ مقبول ہوجاتی ہے۔

عظمتِ استناد...... الحمد للہ جامعہ قاسمیہ کے جو مقاصد بیان کئے گئے ہیں۔ اس میں تینوں باتیں پائی جاتی ہیں۔ علم بھی ہے، تعلیم بھی ہے اور تعلیم کے ساتھ ایک ذات کے ساتھ استناد بھی ہے اور وہ ذات مقبولانِ الٰہی میں سے ہے۔ میں تو کہتا ہوں ہمارا اصل وجود نسبت سے ہے۔ ہمارے وجود کے معنی یہ ہاتھ اور پیر، یہ جگہ گھیرنا، یہ نہیں ہے۔ ہمارا وجود نسبت سے قائم ہے۔ ایک مومن کیوں مومن ہے؟ اس کا ایمانی وجود کیا ہے؟ اسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت ہے۔ وہ جب اپنا تعارف بحیثیت مومن کے کرائے گا تو وہ یہ کہے گا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا غلام ہوں۔ بس یہ میرا تعارف ہے۔ یہ نسبت ہی تو ہوئی کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا غلام ہوں اور میں کسی کا نہیں ہوں میں تو ذاتِ بابرکاتِ نبوی کا غلام ہوں۔

جیسے دھوپ سے اگر پوچھا جائے کہ تو کون ہے؟ وہ اس کے سوا اور کیا تعارف کرائے گی کہ میں آفتاب کا ایک سایہ ہوں۔ تو آفتاب کی طرف نسبت دے دینا یہی اس کا وجود ہے۔ اگر دھوپ آفتاب سے کٹ جائے، اس کا وجود ہی باقی نہیں رہتا۔ تو حاصل یہ نکلا کہ وجود حقیقت میں نسبت واحتساب کا نام ہے۔ اگر ہمارا علم کسی مقدس ذات کی طرف منسوب ہو۔ وہ علم کارآمد اور معتبر ہے، اگر کسی ذات کی طرف منسوب نہیں، محض اپنے ہی اندر سے اٹھا ہے، اسے دماغی بخار کہا جائے گا۔ اس کا نام علم نہیں رکھا جائے گا۔ اسے اوہام ووساوس کا مجموعہ کہا جائے گا۔ خواہ عقل بھی اس میں شامل ہو۔

نسبتِ علمی...... کیوں کہ عقل محض بھی علوم پیدا نہیں کرسکتی۔ اس لئے کہ عقل غلط بھی چلتی ہے، صحیح بھی چلتی ہے۔ اس کے غلط اور صحیح ہونے کا بھی تو معیار ہونا چاہئے جس پر پرکھ کر ہم کہیں یہ عقل صحیح ہے اور یہ غلط ہے۔ ایک فلسفی کہتا ہے کہ سورج گھومتا ہے، ایک کہتا ہے کہ زمین گھومتی ہے، ایک فلسفی عقلی دعووں سے کہتا ہے کہ خدا موجود ہے۔ ایک

کہتا ہے کہ بالکل موجود نہیں ہے۔ علت تامہ موجود ہے۔ ایک فلسفی کہتا ہے کہ قیامت آنے گی، دوسرا کہتا ہے کہ ہرگز نہیں آئے گی، عالم قدیم ہے۔ یوں ہی آ رہا ہے یوں ہی چلتا رہے گا۔ یہ سارے عقل مند ہی تو ہیں لیکن متضاد دعوے ہیں۔ ایک کا دعویٰ سچا ہوگا ایک کا دعویٰ جھوٹا ہوگا اور دونوں عقل سے کہہ رہے ہیں تو جب عقل غلطی بھی کر سکتی ہے اور صحیح بھی ہو سکتی ہے۔ تو غلط اور صحیح ہونے کی کوئی کسوٹی تو ہوگی جس پر پرکھ کر ہم کہیں کہ یہ عقل صحیح ہے اور یہ غلط، تو عقل کی کسوٹی نقل اور وحیِ خداوندی ہے۔ اس علم پہ پرکھ کر ہم کہیں گے کہ یہ عقل صحیح کہہ رہی ہے اور یہ عقل غلط کہہ رہی ہے۔ اس عقل کے دعوے کے ساتھ خدا کا علم شامل ہے۔ اس عقل کے دعوے کے ساتھ خدا کا علم شامل نہیں ہے۔ کسی میں یہ قطعیت ہے اور کسی میں محض وہمیت ہے، تو عقل کی صحت وسقم کا مدار خود وحی کے اوپر ہے۔ اصل بنیاد وحی ہے اور وحی کا علم نسبت ہی تو لئے ہوئے ہے کہ اللہ کا علم، اللہ کے رسول کا علم، رسول کے صحابہؓ کا علم اور صحابہؓ کے تابعین کا علم۔ اس نسبت نے علم کو معتبر بنایا، اگر یہ نسبت نہ ہو اور ایک شخص یوں کہے کہ میرا علم۔ تو اس کو دیوار پہ مارا جائے گا۔ کہا جائے گا کہ تیرا علم ہے تو ہمارا بھی علم ہے۔ ہم تیری بات کیوں مانیں؟ ہم بھی تو انسان ہیں۔ لیکن جب دونوں مل کر کہیں گے کہ نہ میرا علم نہ تیرا علم، خدا کا علم۔ دونوں گردن جھکا دیں گے کہ بے شک اب جھکنا پڑے گا۔ تو خدا کے علم کے معنی یہ ہیں کہ وہ علم جو خدا کی طرف سے آیا۔ جو اللہ کی طرف منسوب ہے۔

قبولیتِ نسبت ..... تو نسبت سے علم بڑا بنتا ہے اور قابلِ قبول بنتا ہے۔ تو جامعۃ قاسمیہ کے لفظ میں جیسے تعلیم کی طرف اشارہ ہے ویسے ہی نسبت کی طرف بھی اشارہ ہے کہ یہ ایک ایسی ذات کی یادگار میں ہے جو معلم ہند ہو کر گزری ہے، جس نے بڑے بڑے محدث پیدا کئے، جس نے سینکڑوں ہزاروں مدارس قائم کئے۔

آج اگر آپ دیکھیں، آپ کے پاکستان میں قصبے قصبے میں مدرسے موجود ہیں۔ میں افغانستان گیا تو گاؤں گاؤں میں فضلاء دیوبند موجود ہیں، برما میں گیا تو شہر شہر میں فضلائے دیوبند اور مدارس موجود، اخیاب میں پہنچا تو چار سو کے قریب علماء جمع ہوئے جو فضلاء دیوبند تھے، ملنے کے لئے آئے۔ افریقہ میں جاؤ تو ہزاروں کی تعداد میں فضلاء موجود۔ تو یہ جگہ جگہ مدارس، جگہ جگہ فضلاء، اور جگہ جگہ معلم۔ یہ درحقیقت عالم اسباب میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا فیض ہے۔ جنہوں نے دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھ کر گویا علم کی ایک فیکٹری قائم کر دی کہ وہاں سے علم کی مشینیں تیار ہوتی رہیں۔

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے سات برس کی عمر میں خواب دیکھا تھا کہ میں بیت اللہ کی چھت پر کھڑا ہوا ہوں اور میرے ہاتھ اور پیروں کی دسوں انگلیوں سے دودھ کی نہریں جاری ہیں جو اطراف عالم میں پھیل رہی ہیں۔ تو ان کے ماموں مولوی عبدالسمیع صاحب مرحوم نے تعبیر دی تھی کہ حق تعالیٰ شانہ تمہارے ذریعے سے علوم نبوت کا فیضان کریں گے۔

کسی کو وہم بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ نانوتہ ایک کوری بستی جو ضلع سہارن پور (انڈیا) میں ہے، کوئی اس کی خصوصیت

نہیں تھی کہ وہاں ایک ایسی شخصیت بھی پیدا ہوگی کہ مشرق ومغرب میں اس کے ذریعے علوم کے دریا بہیں۔ جب دارالعلوم قائم ہوا تو لوگوں نے کہا کہ یہ تعبیر ہے۔ آج دارالعلوم کے نقشِ قدم پر مدینہ منورہ میں اگر مدرسہ شرعیہ قائم ہے تو فضلاءِ دیوبند کا قائم کیا ہوا ہے۔ مکہ میں مدرسۃ الفلاح کا قیام ہوا تو مولانا محمد اسحاق صاحب امرتسری کے ذریعہ جو دارالعلوم دیوبند کے فاضل تھے۔ مکہ ہو، مدینہ ہو، بخارا ہو، بلخ ہو، افغانستان ہو، افریقہ ہو ہزاروں ہزار مدرسے قائم ہیں۔ تقریباً بیس ہزار کے قریب دارالعلوم دیوبند نے ایسے علماء تیار کر دیے۔ جن پر فتوی کا مدار اور حدیث سنانے کا مدار اور قرآنِ کریم کی تعلیم کا مدار ہے۔ مشائخ طریقت ان میں ہیں اور صوفیت کی تعلیم بھی ان میں ہے۔

عزتِ نسبت...... تو ایک ایسی ذات جس کے فیضان سے ہزارہا علماء تیار ہوں، ہزارہا مدارس تیار ہو جائیں۔ اس کی طرف نسبت کر دینے سے یقیناً ہم لوگوں کی عزت ہے اور اس جامعہ کی بھی یقیناً عزت ہے کہ نسبت کی وجہ سے مقبولیت پیدا ہو جائے گی کہ قبولیت نسبت سے آتی ہے۔

آپ مکہ مکرمہ میں جاتے ہیں اور بیت اللہ کے در و دیوار کو عزت و عظمت سے چومتے ہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ اس کی اللہ سے نسبت ہے۔ اس کا نام بیت اللہ ہے۔ یعنی اللہ کا گھر، حالانکہ اللہ میاں اس میں رہتے تھوڑا ہی ہیں، وہ تو جسم سے پاک اور بری و بالا ہیں۔ مگر ایک نسبت ہے اور اس نسبت کی وجہ سے بیت اللہ مکرم و معظم ہے۔ اور تجلیات کا مورد بن گیا۔

تو بیت اللہ قابلِ تعظیم اور واجب التعظیم نسبت کی وجہ سے بنا۔ بیت اللہ کے اوپر غلاف ڈال دیا۔ حالاں کہ آپ ہی نے تو اسے پاکستان سے سی کر بھیجا تھا۔ وہاں جب پڑ جائے گا تو آپ اسے چومیں گے۔ اگرچہ اس سے پہلے چومنا نہایت غلطی ہے۔ اس واسطے کہ ابھی اسے وہ نسبت حاصل نہیں ہوئی، ابھی تو اسے آپ کی طرف نسبت ہے۔ جب اسے بیت اللہ سے نسبت ہوگی جب اسے چومنا۔ تو جب اسے بیت اللہ پر ٹانگ دیا جائے گا اور بیت اللہ سے مس کر دے گا تو اس میں برکات کے آثار آ جائیں گے۔ پھر بے شک آپ اسے چومیں تو آپ کے لئے عزت و عظمت اور مقبولیت ہے۔ تو پردوں میں مقبولیت آ گئی اس لئے کہ دیوارِ کعبہ کو لگ گیا۔ دیوارِ کعبہ میں مقبولیت آئی کہ اللہ کا نام لگ گیا۔ بیت اللہ مسجدِ حرام میں ہے تو مسجدِ حرام ساری مسجدوں سے افضل بن گئی۔ مسجدِ حرام جس شہر میں ہے تو اس شہر کا نام بلدِ امین ہو گیا۔ کیوں کہ وہ مسجدِ حرام کا شہر بن گیا۔ وہ مکہ شہر جس صوبے میں ہے وہ حجاز کا صوبہ مقدس بن گیا، اس لئے کہ اس میں مکہ واقع ہے۔ تو نسبت در نسبت سے فضیلت اور بڑائی آئی۔ اس طرح سے علم خود بڑی چیز ہے اور کسی بڑی شخصیت کی طرف انتساب ہو جائے تو اس کی اور بڑائی ہو کر نمایاں ہو جاتی ہے۔

اس واسطے اس جامعہ کا قیام اور اس کے قائم کرنے والے دونوں مستحق مبارکباد ہیں۔ یہ چند جملے تھے جو مجھے اس آیت کے تحت اس جامعہ کے متعلق عرض کرنے تھے۔

دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ اس جامعہ کو مضبوط بنائے اور اس کو فیضان کا ذریعہ بنائے اور ایسے معاون اس کے لئے پیدا ہو جائیں تاکہ جو اس کے مقاصد ہیں وہ آگے بڑھیں اور علم پھیلے اور یہ علم کا منارہ بن جائے۔

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ رَبَّنَا اغْفِرْلَنَا ذُنُوْبَنَا وَ اِسْرَافَنَا فِیْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَی الْقَوْمِ الْکٰفِرِیْنَ. اَللّٰهُمَّ اسْتَعْمِلْنَا بِالْقُرْاٰنِ اَجْمَعَنَا.

۱۴ شعبان المعظم ۱۴۰۸ھ

تاثیر الاعمال

"اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ۔ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ، وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ، اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا، وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا۔

اَمَّا بَعْدُ..... فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ﴿حٰفِظُوْا عَلَی الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوۃِ الْوُسْطٰی وَقُوْمُوْا لِلّٰہِ قٰنِتِیْنَ﴾ صَدَقَ اللّٰہُ الْعَظِیْمُ۔ ①

تمہید..... بزرگانِ محترم! حدیث قدسی میں حق تعالیٰ شانہ فرماتے ہیں کہ "اَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِیْ بِیْ" میں بندے کے گمان کے ساتھ ہوں، جیسا گمان میرے ساتھ قائم کرے گا ویسا ہی میرا عمل اس کے ساتھ ہوگا۔ اگر آپ نے ایک ناکارہ کے بارے میں اچھا گمان کرلیا ہے تو کیا عجب ہے کہ حق تعالیٰ اس ناکارہ کو کارآمد بنادے۔ بہر حال اس وقت میں کچھ زیادہ کہنے کی ہمت تو نہیں ہے، نہ کچھ قوت ہی ہے اور سفر بھی بہت لمبا رہا۔ اس کی وجہ سے کچھ تھکاوٹ بھی ہے۔ اس لئے زیادہ وقت تو میں نہیں لے سکوں گا۔ البتہ جلسے کے احترام کی وجہ سے چند جملے ضرور عرض کروں گا۔

خواصِ اعیان..... اتنی اصولی بات سمجھ لیجئے کہ دنیا کی ہر چیز میں اللہ نے ایک خاصیت رکھی ہے۔ دوا ہو، غذا ہو ہر چیز کی ایک خاصیت ہے اور اس کے استعمال سے وہ خاصیت ظاہر ہوتی ہے۔ مثلاً گل بنفشہ ہے۔ زکام زائل کرتا ہے۔ یہ اس کی خاصیت ہے۔ جب آپ اسے استعمال کریں گے اور زکام ہوگا تو وہ زائل ہوگا۔ ملٹھی کی خاصیت یہ ہے کہ وہ کھانسی دفع کرتی ہے، جب بھی آپ استعمال کریں گے، کھانسی ہوگی، اللہ تعالیٰ اسے زائل فرمادیں گے۔ تو ہر دوا کی ایک خاصیت ہے۔ اسی طرح ہر غذا کی ایک خاصیت ہے۔ گیہوں کھائیں گے تو اور خاصیت ہے، چنا کھائیں گے تو اور خاصیت ہے، چاول کھائیں گے تو اس کی اور خاصیت ہے۔ بہر حال ہر چیز کی ایک خاصیت ہے۔

خواصِ افعال..... اور میں کہتا ہوں کہ یہ چیزیں تو اعیان میں سے ہیں، ان کی خاصیتیں تو ہیں ہی، انسان کی ہر حرکت میں ایک خاصیت ہے۔ ہر وضع میں ہر انداز میں ایک اثر ہے۔ اگر آپ کسی کے سامنے یوں اشارہ کریں،

---

① پارہ: ۲ سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲۳۸.

ممنون کرم ہو جائے گا اور اگر یوں کریں تو لڑائی بن جائے گی۔ اگر کسی کو انگوٹھہ دکھلا دیں تو چڑ پیدا ہو جائے گی اور کسی کو سلام کرنے کے لئے ہاتھ اٹھائیں تو محبت پیدا ہو جائے گی۔ رخ دے کر بات کریں، اس کا اثر اور ہے اور منہ پھیر کر بات کریں، اس کا اثر دوسرا ہے۔ ہر ہیئت کا اثر اور ہر شے کا ایک اثر ہے۔

اسی طرح سمجھئے کہ شرعی اعمال کی بھی کچھ خاصیتیں ہیں۔ جتنے اعمال حق تعالیٰ نے مقرر فرمائے ہوئے ہیں، ہر عمل کی ایک خاصیت اور اس کی ایک خاص تاثیر ہے، جب اسے استعمال کیا جائے گا اس کے اثرات ظاہر ہوں گے۔

روزے کی خصوصیت...... مثلاً روزہ ہے، اس کی ایک خصوصیت اور خاصیت ہے۔ اور وہ قہر نفس ہے۔ جب آپ نفس کا دانہ پانی بند کر دیں گے اور نفس کو مقہور و مجبور کر دیں گے تو نفس مقہور ہو کر کے گناہ کی طرف نہیں جائے گا۔ یہ تو خمارِ گندم ہے۔ جتنی زیادہ غذا کھائی جاتی ہے، طاقت بڑھتی ہے، گناہ کی سوجھتی ہے اور سات دن فاقہ کر لیں تو گناہ کی طرف طبیعت ہی مائل نہیں ہوگی۔ اس لئے کہ نفس کے اندر ہی جان باقی نہیں ہوگی، تو روزہ قہر نفس کے لئے رکھا گیا ہے کہ اس کو مقہور کر دے، قہر کے نیچے دبا دے تاکہ وہ کھل کر کوئی عمل نہ کر سکے اور مجبور ہو جائے۔

اسی واسطے حدیث میں ارشاد فرمایا گیا کہ: روزہ رکھنے میں۔ نفس تو مقہور ہوتا ہی ہے اور نفس کے آثار و خواص تو مغلوب ہوتے ہی ہیں۔ نفس کے ساتھ شیطان کا ساز باز ہے۔ رمضان میں شیاطین بھی قید کر دیئے جاتے ہیں۔ وہ جو کھل کر نفس پر اثر ڈالتے ہیں وہ گھٹ جاتا ہے۔ اس لئے کتنے بھی نیچے درجے کا مسلمان ہو، اس میں کچھ نہ کچھ رمضان کا احترام ضرور ہوگا۔ اگر روزہ بھی نہیں رکھے گا تو بھی دن میں کھاتے ہوئے شرمائے گا۔ بے روزہ رہنے کو اعلانیہ ظاہر کرنے سے شرمائے گا اور عار محسوس کرے گا۔ یہ خاصیت ہے۔

زکوٰۃ کی خصوصیت...... زکوٰۃ کی بھی ایک خاصیت ہے۔ پہلی خاصیت یہ ہے کہ بخل کا رذیلہ انسان کے اندر سے زائل ہوتا ہے۔ بخل کا جو مادہ ہے وہ گھٹ جاتا ہے۔

دوسرے یہ کہ غرباء کے لئے سہولت اور آسانی پیدا ہو جائے گی۔ اس سے حسن معاشرت پیدا ہوتا ہے۔ جتنا آپ غرباء پر خرچ کریں گے۔ وہ آپ کے ممنون کرم ہوں گے اور جان نثار بن جائیں گے۔ آپ تو یوں خوش ہوئے کہ میں نے اللہ کا ایک فرض ادا کیا کہ زکوٰۃ دے دی۔ غریب یہ سمجھے گا کہ میرے اوپر کرم کیا اور احسان کیا۔ تو امیر اور غریب میں ایک ربط اور رشتہ قائم ہو جائے گا۔ اور وہی حسن معاشرت کی بنیاد ہے۔ تو زکوٰۃ کے اندر جہاں نفس کے اندر یہ اثر پڑتا ہے کہ بخل کا رذیلہ زائل ہو، وہاں معاشرت کی خوبی بھی پیدا ہو جاتی ہے اور تمدن کی خوبی بھی سامنے آتی ہے اور امیر و غریب میں باہمی میل جول پیدا ہو جاتا ہے۔ تو یہ زکوٰۃ کی خاصیت ہے۔

ظہورِ خواص کی شرط...... جب آپ اسے استعمال کریں گے یہ خاصیت ظاہر ہوگی، اب کوئی استعمال ہی نہ کرے تو وہ بات جداگانہ ہے۔ جیسے کوئی دوائی استعمال نہ کرے تو بیماری کیسے زائل ہوگی۔ محض طبیب کے نسخہ لکھ دینے سے تو بیماری زائل نہیں ہوگی۔ استعمال ہی کرنے سے زائل ہوگی۔ یہی صورت شرعی اعمال کی ہے کہ ہر عمل کی

ایک خاصیت ہے۔ ظاہر جب ہی ہوگی جب اسے استعمال کیا جائے۔

ماہرین خواص کی اطاعت ..... حق تعالیٰ نے جس طرح سے اطباءِ جسمانی پیدا فرمائے، ڈاکٹر ہیں، طبیب ہیں، وہ ان خواص و آثار کو جانتے ہیں۔ مریض کی حالت دیکھ کر وہ نسخہ لکھتے ہیں، مریض اگر طبیب کی اطاعت کرے گا، شفا پائے گا۔ اطاعت نہیں کرے گا بیمار پڑا رہے گا۔ بیماری بڑھ جائے گی، ہلاکت کے قریب پہنچ جائے گا۔ تو اطباء جانتے ہیں۔ ہر شخص دوا کی خاصیت کو نہیں جانتا۔ اسے طبیب کی اطاعت کرنی پڑتی ہے۔

اگر کوئی طبیب نسخہ لکھے۔ اور بیمار یوں کہے کہ آپ نے اس نسخے میں گل بنفشہ کو چھ ماشے کیوں لکھا ہے۔ ایک تولہ کیوں نہ لکھ دیا۔ اور ملٹھی آپ نے تین ماشے کیوں لکھی ہے چھ ماشے کیوں نہیں لکھی۔ تو طبیب کان پکڑ کر مطب سے نکال دے گا کہ تو مجھے تعلیم دینے کے لئے آیا ہے یا شفا پانے کے لئے نسخہ لینے آیا ہے؟۔ تو لامحالہ مریض کو اطاعت کرنی پڑے گی۔ جتنی مقدار وہ لکھ دے اور جو وقت وہ تجویز کرے۔ اسی وقت میں وہ دوا استعمال کی جائے گی۔ اتنی ہی مقدار میں استعمال کی جائے گی جتنی مقدار طبیب لکھ دے گا۔

پھر جو پرہیز بتلائے گا وہ بھی کرنی پڑے گی اگر آپ پرہیز نہ کریں تو دوا فائدہ نہیں دے گی۔ زکام کو زائل کرنے کے لئے اس نے گل بنفشہ لکھا۔ وہ آپ نے پی لیا۔ مگر صبح سے شام تک سیر بھر دہی برف ملا کے پی لی۔ اس سے تو زکام اور ترقی پر آ جائے گا۔ تو دوا موثر نہیں ہوتی۔ جب تک پرہیز نہ ہو۔ ہر علاج کے اندر دو جز ہوتے ہیں ایک دوا، ایک پرہیز۔ بلکہ پرہیز زیادہ نافع ہوتی ہے۔ اگر جم کر پرہیز کرے تو بیماری آدھی ہو جاتی ہے۔ دوا سے پھر بقایا آدھی بیماری زائل ہو سکتی ہے۔ مگر ہر صورت میں طبیب کی اطاعت کرنی پڑے گی۔ رائے زنی کرنے کی گنجائش نہیں ہوگی کہ اس نسخے میں آپ نے پانچ دوائیں کیوں لکھی ہیں۔ چھ کیوں نہ لکھ دیں؟ مریض کو اس کا حق نہیں ہوگا، طبیب کہے گا کہ میں فن کی رو سے جانتا ہوں کہ کتنی مقدار ہونی چاہئے۔ تجھے اگر علاج کرانا ہے تو یہ نسخہ اسی مقدار میں استعمال کر۔

یہی صورت بعینہ طب روحانی یعنی شریعت کی ہے۔ جو اللہ نے نازل فرمائی۔ اس کے لئے اطبائے روحانی بھی نازل کئے، وہ انبیاء علیہم السلام ہیں۔ انبیاء کی تعلیم سے ان کے ورثاء پیدا ہوتے ہیں۔ جن کو علمائے ربانی کہا جاتا ہے۔ وہ انبیاء سے وراثت پاتے ہیں اور وہ طب روحانی ان کے پاس آتی ہے۔ مریض سامنے آتے ہیں وہ بھی نسخے لکھتے ہیں۔ ہر مرض کے مناسب حال دوا تجویز کرتے ہیں۔ اگر مریض یہ کہنے لگے کہ آپ نے فلاں وقت میں مجھے دو ہی رکعتیں کیوں بتلائی ہیں، میں چار کیوں نہ پڑھ لوں؟ وہ کان پکڑ کے نکال دیں گے کہ تو علاج کے لئے آیا ہے یا تعلیم دینے کے لئے آیا ہے؟ اتنی ہی مقدار لازمی ہے۔ شریعت نے ایک تسبیح کی مقدار بتلائی کہ سو مرتبہ پڑھا کرو۔ مریضوں کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ یہ کہیں سو کے سوا سو کیوں نہ ہوئے؟ اور سو کے نوے کیوں نہ کر دیئے گئے۔ جتنی مقدار اللہ تعالیٰ نے تجویز کی ہے۔ وہی نافع ہوگی۔ جتنی مقدار تجویز نہیں کی وہ نافع نہیں ہو سکتی۔ تو ہر عمل کی ایک خاصیت ہے، روزے کی بھی ایک خاصیت ہے، زکوٰۃ کی بھی ایک خاصیت ہے، حج کی بھی ایک

خاصیت ہے اور نماز کی بھی ایک خاصیت ہے۔

نماز کی خصوصیت...... نماز کی خاصیت کیا ہے؟ نماز پڑھنے والے میں دیدار خداوندی کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر نماز کا تارک ہے تو وہ جو میدانِ محشر میں دیدار خداوندی ہوگا اس کی استعداد نہیں پیدا ہوگی، وہ دیدار الٰہی سے محروم رہے گا۔ تو نماز کی خاصیت یہ ہے کہ وہ قلب کے اندر دیدار خداوندی کی صلاحیت پیدا کر دیتی ہے۔

دیدار خداوندی کے مراتب...... یہاں نماز پڑھنے میں آپ اللہ تعالیٰ کو عقیدے کی آنکھ سے دیکھتے ہیں۔ کیوں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: عبادت اس طرح سے کرو کہ جیسے تم اللہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو۔ اس عقیدے سے نماز پڑھے گا تو گویا عقیدے کی آنکھ سے حق تعالیٰ کو دیکھ رہا ہے، گو اس آنکھ سے نہیں دیکھ رہا۔ کوئی بزرگ ہے۔ ولی کامل ہے۔ وہ کشف کی آنکھ سے تجلیاتِ خداوندی کو دیکھتا ہے۔ جب نماز پڑھتا ہے تو تجلیاتِ الٰہیہ اس کے سامنے ہوتی ہیں۔ مگر قیامت کے بعد ایک وقت آئے گا کہ جس کے دیکھنے کی مشق آپ نے قلب سے حواس سے اور باطنی آنکھ سے کی تھی، وہ آج ظاہری آنکھ سے سامنے آ جائے گی اور دیدار خداوندی عیاناً ہونا شروع ہو جائے گا۔ مختلف تجلیات نمایاں ہوں گی۔ جس میں بندے حق تعالیٰ شانہ کو دیکھیں گے۔ یہ دیکھنے کی استعداد نماز ہی پیدا کرتی ہے۔ ①

حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد شریف میں تشریف رکھتے تھے اور چودھویں رات کا چاند چمک رہا تھا۔ چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین چاند کو بھی اور چاندنی کو بھی دیکھ رہے تھے۔ ارشاد فرمایا کہ تم جو چاند کو دیکھ رہے ہو تو ایک کا دیکھنا دوسرے کے دیکھنے میں حارج تو نہیں ہے؟ وہ اپنی جگہ دیکھ رہا ہے، وہ اپنی جگہ دیکھ رہا ہے۔ اس کے دیکھنے میں وہ رکاوٹ تو نہیں بنا ہوا، اس کے دیکھنے میں، وہ رکاوٹ نہیں بنا ہوا۔ دنیا کے کروڑوں اربوں انسان چاند کو ایک وقت میں دیکھتے ہیں مگر ایک کے دیکھنے میں دوسرے کا دیکھنا حارج نہیں ہوتا۔ فرمایا اسی طرح قیامت میں بندے اپنے پروردگار کو دیکھیں گے۔ اربوں کھربوں ہوں گے مگر ایک کے دیکھنے میں دوسرے کا دیکھنا حارج نہیں ہوگا۔ جس طرح سے تم چاند کو دیکھ رہے ہو۔ ②

فجر و عصر کی خصوصیت...... اور اس کے بعد فرمایا! اگر تم اس کی استطاعت رکھتے ہو اور یہ کر سکو کہ صبح کی نماز اور شام کی نماز پابندی کے ساتھ ادا کرو تو دیدار خداوندی کا یہی ذریعہ بنیں گی۔ گویا خاصیت تو ہر نماز میں ہے مگر خصوصیت سے یہ دو نمازیں، عصر کی اور صبح کی، یہ دو نمازیں وہ ہیں کہ یہ حق تعالیٰ کے دیدار کی زیادہ استعداد پیدا کرتی ہیں۔

اور بظاہر اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ان دونوں نمازوں میں عالمِ غیب آدمی کے قریب ہو جاتا ہے۔ یہ جو اعمال لکھنے والے ملائکہ ہیں، یہ رات کے اور ہیں اور دن کے اور ہیں۔ دن کے لکھنے والے صبح کی نماز کے وقت

---

① الصحیح للبخاری، کتاب الایمان، باب سوال جبرئیل ج: ۱ ص: ۸۷.

② الصحیح للبخاری، کتاب الصلوۃ، باب فضل صلوۃ الفجر ج: ۲ ص: ۴۱۷ رقم: ۵۴۷۔

آتے ہیں اور رات کے لکھنے والے انہیں چارج دے کر واپس ہو جاتے ہیں۔ یہ دن بھر اعمال لکھتے ہیں، عصر کی نماز جب پڑھتے ہیں تو یہ رات والے ملائکہ کو چارج دے دیتے ہیں۔ رات کو وہ اعمال لکھتے ہیں۔ تو صبح کی نماز میں بھی کروڑوں، اربوں، کھربوں ملائکہ جمع ہوتے ہیں۔ جو اعمال لکھنے والے ہیں اور اسی طرح عصر کی نماز کے وقت بھی جمع ہوتے ہیں۔ ہر بندے کے اوپر دو دو فرشتے ہیں جو اعمال لکھتے ہیں۔ تو اگر بندے ایک ارب ہیں تو وہ چار ارب ہوں گے۔ غرض اربوں کی تعداد میں یہ ملائکہ صبح اور شام کی نماز کے وقت آتے ہیں۔

فجر وعصر میں نزولِ ملائکہ کی حکمت...... اور عجیب حکمت ہے حق تعالیٰ کی کہ ان دو نمازوں کے لئے ملائکہ کا تبادلہ رکھا، کیوں رکھا؟ اس لئے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام کو خلافت دی جا رہی تھی اور حق تعالیٰ نے فرمایا تھا: ﴿إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً﴾ ① میں زمین میں اپنا نائب مقرر کرنے والا ہوں جو میری طرف سے دنیا میں میرا قانون چلائے گا۔ میری طرف سے نیابت کرے گا اور جو احکام میں نے بندوں کے لئے جاری کئے ہیں، انہیں پھیلائے گا۔ میں ایک نائب مقرر کرنے والا ہوں، تو ملائکہ کو خلجان گزرا۔ جس کی وجہ تھی کہ۔

﴿أَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ﴾ ②

آپ ایسی نوع کو خلیفہ بنا رہے ہیں۔ جو دنیا میں خون ریزی الگ کرے گی، فساد الگ مچائے گی اور ہم خدام کہاں چلے گئے ہیں جو ہر وقت آپ کی تسبیح وتہلیل میں مصروف رہتے ہیں۔ گویا در پردہ اشارہ ادھر تھا کہ خلافت ہمیں دی جائے، یہ انسان تو نہایت ہی مفسد اور سفاک ہوگا۔

انسان کی تاریخ خون سے بھری پڑی ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کے وقت سے آدمی کا جو خون آدمی کے ذریعہ سے بہنا شروع ہوا ہے۔ وہ آج تک بند نہیں ہوا۔ بلکہ بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے۔ تو انسان انسان کو پھاڑ کھا رہا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ انسان کو درندہ کہنا یہ درندے کی توہین ہے۔ اس لئے کہ درندہ مثلاً شیر ہے، اگر پھاڑتا ہے تو بکری کو پھاڑے گا۔ شیر شیر کو تو نہیں پھاڑتا۔ انسان ایسا درندہ ہے کہ اپنے ہی بھائی بندوں کو پھاڑ کھاتا ہے۔ جتنے مہلک ہتھیار ایجاد ہو رہے ہیں اور انسان ایجاد کر رہے ہیں، وہ انسانوں ہی کی تباہی کے لئے ہو رہے ہیں۔ سانپ بچھوؤں کو ہلاک کرنے کے لئے تو یہ توپیں اور بندوقیں نہیں ہیں۔ آدمی آدمی کو ہلاک کرنے کے لئے مہلک ہتھیار تیار کر رہا ہے۔ تو انسانی تاریخ خون سے بھری ہوئی ہے۔ انسان ہی انسان کا خون بہا رہا ہے۔ انسان ہی انسانوں کے حق میں فساد برپا کر رہا ہے۔ کچھ صلاح پہ آنا چاہتے ہیں۔ یہ فساد انگیزی کر کے صلاح کے راستے سے ہٹا دیتا ہے، تو فساد بھی ہے، خون ریزی بھی ہے تو ملائکہ نے یہی عرض کیا تھا کہ اس نوع کے اندر خون بھرا ہوا ہے اور فساد بھرا ہوا ہے یہ آپ کی نیابت کرے گا؟ یہ تو نیابت کو اور فاسد بنا دے گا اور ہم خدام کہاں چلے گئے ہیں جو رات دن تسبیح اور تقدیس میں مصروف ہیں۔ ہمیں خلیفہ بنایا جائے۔

---

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۳۰۔ ② پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۳۰۔

خلافتِ آدم پر شبہ کا حاکمانہ جواب ...... تو حق تعالیٰ نے اس کا ایک جواب تو حاکمانہ دیا کہ: ﴿اِنِّیْۤ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ ① تم نہیں جانتے، ہم حقیقتِ حال کو جانتے ہیں۔ ملائکہ خاموش ہو گئے۔ لیکن یہ ضروری نہیں تھا کہ خاموش ہونے سے دل کا خلجان بھی نکل گیا ہو، حاکم کے حکم سے آدمی دب کر ادبا چپ کا تو ہو جاتا ہے لیکن ضروری نہیں کہ دل کا خلجان بھی نکل جائے۔ اس لئے دوسرا جواب حکیمانہ دیا۔

خلافتِ آدم پر شبہ کا حکیمانہ جواب ...... اور وہ یہ تھا۔ ﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾ ② حضرت آدم علیہ السلام کو تمام ناموں کی تعلیم دے دی۔ دنیا کی جتنی چیزیں ہیں۔ ان سب کے نام بتلائے۔ ان سب کی خاصیتیں بتائیں۔ اللہ کے جتنے نام ہیں وہ بتلائے، ان کے خواص و آثار بتلائے۔ تو اسماءِ الٰہیہ اور اسماءِ کونیہ سب حضرت آدم علیہ السلام کو بتلائے۔ اس کے بعد ملائکہ سے کہا۔ ﴿اَنْۢبِـُٔوْنِیْ بِاَسْمَآءِ هٰۤؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ﴾ ③ اگر تم اپنے دعوے میں، وہ جو تمہارے دل میں دعویٰ ہے کہ ہم خلافت کے مستحق ہیں، سچے ہو ذرا چیزوں کے نام تو بتلاؤ۔

اس واسطے کہ خلافت علم سے چلتی ہے اور علم کا ابتدائی مقام یہ ہے کہ کسی چیز کا نام معلوم ہو۔ اگر نام معلوم نہ ہو تو شئی مجہولِ مطلق ہے۔ نام معلوم ہوگا تو شئی کو تلاش کرے گا اور اگر نام ہی معلوم نہیں تو کسی سے کیا پوچھے گا؟ اور کیا کہہ کر پوچھے گا؟ تو علم کا ابتدائی درجہ ناموں کا معلوم ہونا ہے۔

پھر اس کے بعد دوسرا درجہ ان ناموں کی مسمیات کا ہے کہ وہ کیا کیا چیزیں ہیں جن کے یہ نام ہیں۔ پھر ان کے افعال کیا ہیں؟

پھر ان کے حقائق کیا ہیں؟ اور ان کے نفوس کے اندر جذبات کیا ہیں؟ یہ چوتھا درجہ ہے علم کے بعد، علم کے بعد، علم کے بعد علم۔ علم کے درجات نکلتے ہیں مگر ابتدائی درجہ علم کا ناموں کا معلوم کرنا ہے۔ تو حضرت آدم علیہ السلام کو جن پر حکمرانی کروانی تھی اور جن کا نظم بندھوانا تھا ان سب چیزوں کے نام بتلا دیئے۔

ملائکہ سے کہا کہ ان کے نام تو بتلاؤ؟ ملائکہ نہیں بتلا سکے۔ اس لئے کہ جن ملائکہ کو جس نوع پر متعین کیا ہے اس کے ناموں سے تو وہ واقف ہیں، دوسرے ناموں سے واقف نہیں ہیں جو ملائکہ بارشیں لانے پر مقرر ہیں۔ وہ بارش کے احوال کو تو جانتے ہیں لیکن بقیہ دوسرے احوال کا انہیں پتہ نہیں۔ جو اعمال لکھنے والے ہیں، اعمال کی حد تک علم رکھتے ہیں، لیکن اعمال سے جو خارج چیزیں ہیں، ان کا انہیں پتہ نہیں ہے، تو ملائکہ کو ہر نوع کی اتنی ہی چیزیں معلوم ہیں جن پر انہیں مقرر کیا گیا ہے، ساری دنیا کی ساری چیزوں کے نام انہیں نہیں بتلائے گئے۔ اس لئے کہ ساری دنیا سے ملائکہ کا کوئی تعلق نہیں۔

غرض ملائکہ جواب نہیں دے سکے۔ پھر حق تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام سے فرمایا: ﴿یٰۤاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ

---

① پارہ: ١، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ٣٠۔ ② پارہ: ١، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ٣١۔

③ پارہ: ١، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ٣١۔

بِاَسْمَآئِهِمْ ﴾ ① اے آدم! تم چیزوں کے نام بتلاؤ"۔ حضرت آدم علیہ السلام نے فرفر تقریر شروع کر دی۔ یہ آسمان ہے، یہ زمین ہے، یہ لوٹا ہے اور یہ روٹی ہے اور اس کے یہ آثار اور اس کی یہ خاصیات ہیں، تمام چیزوں کے نام اور آثار گنوانے شروع کیے۔ جو ملائکہ کے علم میں نہیں تھے۔

اب ملائکہ خاموش ہوئے۔ اور کہا۔ ﴿سُبْحٰنَکَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا، اِنَّکَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَکِیْمُ﴾ ② بے شک آپ پاک ہیں۔ آپ نے جتنی چیزوں کے نام ہمارے حلقۂ عمل کے بارے میں بتلا دیئے ہیں۔ ہمیں اتنا تو معلوم ہے، سب معلوم نہیں۔ آدم کو تو ساری چیزوں کے نام معلوم ہیں۔ زمین و آسمان کی چیزیں، زمین کی پیداوار کی چیزیں اور آسمان کے رہنے والوں کے پتے اور ان کے آثار و خواص سیارات کا پتہ، چاند سورج کا پتہ، پھر ان چاند سورج کے جو آثار ہیں ان کا پتہ، انسانی بدن کے اندر تمام اعضاء کا پتہ، معدہ کیا کام کرتا ہے۔ جگر کیا کام کرتا ہے، قلب کا کیا کام ہے، دماغ کا کیا کام ہے۔ ہر ہر چیز حضرت آدم علیہ السلام پر روشن کر دی گئی جو ملائکہ پر نہیں تھی۔ آخر ہار مانی اور خاموش ہوئے اور کہا کہ سُبْحٰنَکَ، آپ پاک ہیں۔ وہ جو ہمارا خلجان تھا، اس سے آپ برتر و بالا ہیں۔ بلاشبہ آپ کا انسان کو نائب بنانا برحق ہے اور آدم ہی اس کا مستحق تھا۔

لیکن ابھی ایک درجہ جواب کا اور باقی ہے۔ وہ یہ کہ ملائکہ نے کہا تھا کہ یہ زمین پر فساد کرے گا اور خون بہائے گا۔ اس کا جواب ابھی تک نہیں ہوا تھا۔ یہ تو ہو گیا کہ آدم سب سے زیادہ علم رکھتا ہے۔ جو تمہارے اندر نہیں۔ یہ بھی جواب ہو گیا کہ آدم کے حقائق کو ہم جانتے ہیں تم نہیں۔ لیکن وہ جو کہا تھا کہ فساد ہوگا خون پھیلے گا، وہ چیز ابھی تک باقی تھی؟

حق تعالیٰ نے اس کا جواب حکیمانہ طریق پر یہ دیا کہ جہاں کوئی عمل خیر ہو اور انسان اس کے اندر جمع ہوں، ملائکہ کو حکم دیتے ہیں کہ اس مجلس کے اندر جاؤ۔ ایک جلسہ ہوا، اس میں بہت سے اللہ والے جمع ہیں، اللہ کے ناموں کا ذکر ہو رہا ہے، مسائل کا ذکر ہو رہا ہے۔

تو حدیث میں فرمایا گیا۔ "اِنَّ لِلّٰہِ مَلٰٓئِکَۃً سَیَّاحِیْنَ" اللہ کے ہاں کروڑوں، اربوں کی تعداد میں ملائکہ ہیں جن کا کام یہی ہے کہ دنیا میں گھومیں پھریں اور دیکھیں کہ انسان کیا کام کر رہا ہے۔ جب دیکھتے ہیں کہ ایک مجلس خیر و برکت کی ہے۔ مسائل کا ذکر ہے تو وہ دوڑ پڑتے ہیں اور پچھلوں کو آواز دیتے ہیں۔ "هَلُمُّوْٓا اِلٰى مَقْصَدِكُمْ" دوڑو، تمہارا مقصد اس مجلس میں پورا ہو رہا ہے۔ وہ اپنے پچھلوں کو بلاتے ہیں، یہاں تک کہ اس مجلس اور جلسے میں چہار طرف آسمان تک اربوں کھربوں ملائکہ کا چھت لگ جاتا ہے۔ "غَشِیَتْهُمُ الرَّحْمَةُ وَحَفَّتْهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ" ملائکہ اس مجلس کو ڈھانپ لیتے ہیں اور رحمت اس کو گھیر لیتی ہے۔ اب یہ مجلس ختم ہونے کو ہے، ختم ہوئی۔ حق تعالیٰ ملائکہ سے ارشاد فرماتے ہیں، جب یہ ملائکہ مجلس میں آتے ہیں اور دیکھتے ہیں جو کچھ مجلس میں ہو رہا ہے، اب یہ آسمانوں کی طرف چڑھتے ہیں تو ان سے حق تعالیٰ سوال کرتے ہیں اس حال میں کہ اللہ تعالیٰ سب کچھ جانتے

---

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۳۳۔ ② پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۳۲۔

ہیں۔ مگر حکمت کے تحت سوال ہوتا ہے کہ بندوں کو کس حالت میں پایا؟

عرض کرتے ہیں کہ آپ کے ذکر میں مصروف تھے۔ کیا ذکر کرتے تھے؟ آپ کی جنت کے طالب تھے اور جہنم سے ڈرتے تھے۔ فرماتے ہیں کہ جنت کو انہوں نے دیکھا ہے جو طلب کر رہے تھے یا جہنم کو دیکھ لیا ہے جو خوف کھا رہے تھے؟

عرض کرتے ہیں دیکھا تو نہیں، آپ کے انبیاء کی زبان سے سنا ہے اور ایمانًا مانا ہے کہ جنت بھی حق ہے اور دوزخ بھی حق ہے۔ گویا پہلا الزام تو یہ ہوتا ہے کہ تم جنت و دوزخ کو آنکھ سے دیکھ رہے ہو۔ اگر رات دن تسبیح میں مصروف رہو تو تمہارا کیا کمال ہے۔ کمال اس انسان کا ہے کہ دیکھی ایک چیز نہیں اور پھر تسبیح و تہلیل اور ہمارے ذکر میں مصروف ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں کہ اے ملائکہ! میں تمہیں گواہ کرتا ہوں کہ جتنے اس مجلس میں موجود تھے، جو مانگتے تھے، وہ میں نے دیا۔ یعنی جنت۔ اور جس سے ڈرتے تھے اس میں نے انہیں بچا لیا۔ یعنی جہنم۔ اور میں نے ان کی مغفرت کر دی۔ تو ملائکہ عرض کرتے ہیں کہ یا اللہ! بہت سے تو وہ لوگ تھے جو گھروں سے قصد کر کے آئے تھے کہ اس مجلس میں شریک ہوں گے، اس جلسے میں بیٹھیں گے۔ مگر بعض تماشہ بین بھی کناروں پر آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ ان کا مقصد نہیں تھا کہ اس جلسے میں آئیں۔ جب قریب سے گزرے تو انہوں نے کہا کہ بھئی! کیا ہو رہا ہے، ہم بھی دیکھتے چلیں۔ وہ کھڑے ہو گئے تو کیا وہ بھی اس مغفرت میں شامل ہیں؟

جواب میں فرماتے ہیں "هُمُ الْقَوْمُ لَا يَشْقٰى جَلِيْسُهُمْ." اس جلسے میں بیٹھنے والی ایسی قوم ہے کہ ان کے آس پاس والا بھی محروم نہیں رہ سکتا، وہ بھی مغفرت میں شامل ہے۔ سب کی مغفرت ہو گئی۔ ①

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ایک بڑے جلسے کی مغفرت کرنی تھی۔ ہزاروں آدمی اس میں جمع تھے۔ تو اس کی کیا ضرورت تھی کہ ملائکہ آسمانوں پر چڑھیں اور ان سے سوال کیا جائے کہ بندے کیا کر رہے ہیں، وہ جواب دیں۔ پھر انہیں گواہ بنایا جائے اور مغفرت کی جائے۔ اور پھر ان جلسوں کو دیکھا جائے تو ایک ہی جلسہ تو نہیں۔ ایک ہی وقت میں ہزاروں جلسے ہو رہے ہیں۔ اسی پاکستان میں آج ایک جلسہ یہاں ہے۔ ہر شہر میں معلوم نہیں کتنے جلسے ہو رہے ہوں گے۔

اور ہر جلسے پر یہی کہ ملائکہ آئیں اور پھر چڑھیں اور حق تعالیٰ سوال کریں اور مغفرت کی جائے۔ پھر ایک پاکستان ہی نہیں، ہندوستان کے شہروں میں جلسے ہو رہے ہوں گے۔ ترکی کے لوگ ہیں وہاں بھی جلسے ہوں گے۔ عرب کے لوگ ہیں، وہاں بھی ہوں گے۔ دنیا میں سارے جلسوں کو لو، تو لاکھوں جلسے ہوں گے۔ تو ہر جلسے پر یہی کہ ملائکہ آئیں۔ پھر وہ اوپر چڑھیں اور ان سے سوال ہو۔ تو یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب بخشنا تھا تو بخش دیتے۔ اس کی کیا ضرورت تھی کہ ملائکہ اس طرح سے آئیں اور ان سے سوال کیا جائے اور انہیں گواہ بنایا جائے کہ تم گواہ رہو کہ ہم نے بخشش کی۔

---

① السنن للترمذی، ابواب الدعوات، باب ما جاء ان للہ تعالی ملائکۃ...... ج: ۱۲، ص: ۲۷ رقم ۳۵۲۳

یہ درحقیقت ان کے خلجان کا جواب ہے کہ تم نے یہ کہا تھا کہ انسان کی تاریخ خون سے بھری ہوئی ہے، یہ انسان ہی تو ہے جو ہر وقت ہمارے ذکر میں مصروف ہے۔ تم نے بھی جا کے فائدہ اٹھایا۔ تو انسانی نوع میں یہ بھی داخل ہے کہ ذکر اللہ میں مصروف، مسائل سننے میں مصروف، کتاب و سنت کے احکام جاننے میں مصروف۔ تو تم نے سارے انسانوں پر کیسے حکم لگایا تھا کہ سارے ہی فسادی ہوں گے، سارے ہی مفسد ہوں گے، سارے ہی سفاک ہوں گے۔ ان میں یہ بھی تو ہیں۔ ایک لاکھ فسادی ایک طرف اور ایک صالح ایک طرف۔ اس کی وجہ سے ہزاروں کی نجات ہو سکتی ہے۔ تو انسانوں کے اندر یہ بھی تو ہیں۔ یہ جواب ہے اس کا کہ جو تمہارے دلوں کے اندر خلجان گزرا تھا۔

ملائکہ پر اتمامِ حجت...... حج جب ہوتا ہے، وہی صورت وہاں بھی ہوتی ہے۔ ملائکہ اربوں کھربوں جمع ہیں۔ حق تعالیٰ ملائکہ سے فرماتے ہیں کہ "یہ بندے ننگے سر، ننگے پیر، گرد آلود، ریگستان میں پڑے ہوئے ہیں، آخر یہ کیوں پڑے ہوئے ہیں؟ کیوں آئے ہیں؟ میری ہی محبت تو انہیں کھینچ کر لائی ہے۔ اس محبت کا تقاضا یہ ہے کہ جتنے حج کرنے والے ہیں میں نے ان سب کی مغفرت کی۔ اور آج یہ ویسے ہو گئے جیسے ماں کے پیٹ سے آج پیدا ہوئے ہیں"۔

ملائکہ پر یہ حجت تام کی جاتی ہے کہ یہی وہ انسان ہے جسے تم نے کہا تھا کہ بڑا مفسد ہوگا، بڑا سفاک ہوگا۔ یہ سفاکی کر رہے ہیں؟ یہ مفسدہ پردازی کر رہے ہیں؟ ہمارے ذکر میں مصروف، ہماری اطاعت میں مصروف۔

غرض ایسے تمام مواقع میں ملائکہ بھیجا جاتا ہے تاکہ عملی طور پر جواب ہو جائے کہ تم نے جو پوری نوع پر حکم لگایا تھا کہ یہ مفسد نوع ہے خلافت کے لائق نہیں۔ سارے ایسے نہیں ہیں۔ بے شک زیادہ ایسے ہوں گے جو سفاک ہوں گے مگر ان کے اندر کم و بیش وہ بھی ہوں گے جو اللہ کا نام لینے والے ہوں گے، خدا کی یاد کرنے والے ہوں گے اور انہیں پر دنیا قائم ہے۔ ایک بھی نہ رہے تو دنیا باقی نہیں رہ سکتی۔

ذکرِ انسانی پر نظامِ دنیا قائم ہے...... حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "لَاتَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰی یُقَالَ فِی الْاَرْضِ اَللّٰہُ اَللّٰہُ" قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی جب تک ایک بھی اللہ اللہ کرنے والا دنیا میں موجود ہے۔ جب ایک بھی نہیں رہے گا جب قیامت قائم ہوگی اور یہ سارا عالم درہم برہم کر دیا جائے گا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا اللہ کے نام پر قائم ہے۔ جب نام نکل جائے گا۔ دنیا تباہ ہو جائے گی۔ اور ختم ہو جائے گی۔ تو دوسرے لفظوں میں ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ دنیا قائم ہے اللہ کے نام لینے والوں کے اوپر، جب تک اللہ کا نام لینے والے موجود ہیں، دنیا قائم ہے۔ جب وہ مٹ جائیں گے تو دنیا ختم کر دی جائے۔ جس ملک کے اندر اللہ کا نام لینے والے باقی نہ رہیں وہ تباہی کی طرف جائے گا، اور جس ملک میں سارے ہی اللہ کا نام لیں، وہ بقاء اور ترقی کی طرف جائے گا۔ بہر حال اللہ کے نام میں ترقی ہے۔ تو جہاں کہیں بھی اللہ کا نام لینے والے جمع ہوتے ہیں تو فرشتوں کو بھیج کر انہیں جواب دیا جاتا ہے اور انہی کو گواہ بناتے ہیں کہ تم گواہ رہو، میں نے ان کی مغفرت کی۔ انہی میں سے ایک شکل یہ بھی ہے صبح اور عصر کی نماز کے وقت لاکھوں ملائکہ جمع ہوتے ہیں۔ جب یہ

دن والے چڑھتے ہیں اور رات والوں کو چارج دے دیتے ہیں۔ حق تعالیٰ پوچھتے ہیں کہ بندوں کو کس حالت میں چھوڑا؟ عرض کرتے ہیں کہ نماز پڑھ رہے تھے۔ اور یہ کہتے ہیں کہ: ”اَتَیْنَاهُمْ وَهُمْ يُصَلُّوْنَ وَتَرَكْنَاهُمْ وَهُمْ يُصَلُّوْنَ.“ جب ہم اعمال نامے لینے کے لئے گئے اور چارج لینے کے لئے گئے جب بھی نماز پڑھتے ہوئے دیکھا اور جب صبح کی نماز میں چھوڑ کر آئے، جب بھی یہ نمازہی پڑھ رہے تھے۔ تو ترک بھی ہم نے انہیں نماز میں ہی کیا اور جب ہم پہنچے جب بھی نمازہی پڑھ رہے تھے۔ ①

گویا جواب دیا جاتا ہے کہ یہی ہے وہ انسان، جس کے بارے میں تم نے خلجان ظاہر کیا تھا کہ بڑا مفسد ہوگا، یہ فسدے کا کام ہے؟ کہ جب تم گئے جب بھی عبادت میں مصروف تھا، جب تم چھوڑ کر آئے جب بھی عبادت میں مصروف تھا۔ یہ ملائکہ پر اس خلجان کی وجہ سے حجت تمام کی جاتی ہے۔ بہر حال میرے عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ ہر عمل کی ایک خاصیت ہے۔ تو نماز کی خاصیت یہ ہے کہ اس سے دیدارِ خداوندی کی استعداد اور صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ تارکِ نماز کے اندر دیدِ خداوندی کی استعداد پیدا نہیں ہوگی۔

جلوۂ خداوندی رُوحِ عبادت ہے...... اور وجہ اس کی یہ ہے کہ نماز اکمل ترین عبادت ہے اور عبادت میں لطف جب ہی آتا ہے جب عابد و معبود کا آمنا سامنا ہو۔ اگر معبود بالکل غائب ہو تو نماز کے اندر لطف نہیں آئے گا' نمازی اور عبادت گزار یہ کہے گا کہ ایک خیالی چیز کی عبادت کر رہا ہوں، کوئی میرے سامنے تو ہے نہیں۔ یہ خطرہ گزر سکتا تھا۔ تو اصل میں نماز کا مقصد ہی یہ ہے کہ عابد اور معبود کا آمنا سامنا ہو۔ اسی لئے حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب حضرت جبرئیل علیہ السلام نے سوال کیا: ”مَا الْاِحْسَانُ يَا رَسُوْلَ اللهِ؟“ احسان کیا چیز ہے یا رسول اللہ؟ فرمایا: ”اَنْ تَعْبُدَ اللهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ“ ② احسان یہ ہے کہ اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم آنکھوں سے حق تعالیٰ شانہٗ کو دیکھ رہے ہو۔ یعنی یہ تصور اور یہ دھیان باندھو کہ اللہ کے سامنے میں حاضر ہوں اور اگر تمہارے اندر اتنی قوت نہیں ہے تو کم سے کم یہ تصور رکھو کہ اللہ تو تمہیں دیکھ رہا ہے اس کی نگاہوں سے تم اوجھل نہیں ہو۔ غرض دیکھنا اور آمنا سامنا ہونا یہ عبادت کی روح معلوم ہوتی ہے کہ محسن اور احسان والا عبادت میں جب ہی بنے گا جب معبود کا آمنا سامنا ہو۔ تو حق تعالیٰ شانہ، کے بارے میں تصور کی آنکھ سے ہم دیکھتے ہیں کہ معبود ہمارا سامنے ہے اور ہم اس کی عبادت کر رہے ہیں۔

دنیا میں تجلیاتِ ربانی کا ظہور...... زیادہ عبادت کی، قلب میں روشنی پیدا ہوئی۔ تو تجلیات اور انوارِ ربانی سامنے آنا شروع ہو جاتے ہیں، تو جو آنکھوں سے دیکھتا ہے وہ ذات کو تو نہیں دیکھ سکتا، ذات تو وراء الوریٰ ہے اور نفسِ ذات تو قیامت کے بعد بھی نہیں دیکھ سکے گا۔ وہ اتنی لطیف، اتنی چمک اور اتنی نورانیت میں ہے کہ آنکھ کتنی

---

① الصحیح للبخاری، کتاب مواقیت الصلوة، باب فضل صلاة العصر، ج: ۲، ص: ۳۹۰ رقم ۵۲۲.

② الصحیح للبخاری، کتاب الایمان، باب سؤال جبریل ......، ج: ۱، ص: ۸۷.

لطیف بن جائے۔ مگر یہ طاقت نہیں رکھتی کہ ذات بابرکات کو دیکھ سکے۔ تجلیاتِ ربانی کو دیکھے گی، عکوس کو دیکھے گی۔ یعنی عکسِ خداوندی مختلف صورتوں میں سامنے آئے گا، اسے دیکھے گی۔ ذات کا دیکھنا، وہ کبھی نہیں ہوگا۔ مگر بہر حال تجلیات و انوار سامنے آتے ہیں جو اہل اللہ کے سامنے آنے لگتے ہیں۔

تجلیٔ اخروی...... البتہ قیامت کے دن اس تجلی کو دیکھیں گے جو اقرب الی الذات ہے، یعنی جو ذات کے بالکل اقرب ہے۔ گویا اس کا دیکھنا ذات کا دیکھ لینا ہے۔ مگر تجلی کو دیکھیں گے۔ اس لئے کہ سب سے بڑا مقام دیدارِ خداوندی کا جنتیں ہوں گی۔

دربارِ خداوندی کا انعقاد...... حدیث میں فرمایا گیا کہ ہر ہفتہ میں۔ وہاں ہفتے تو نہیں ہوں گے مگر ایک ہفتے کی جتنی مسافت اور مقدار ہوتی ہے۔ اس میں دربارِ خداوندی ہوگا۔ اوپر نیچے سو جنتیں ہیں اور ہر جنت آسمانوں اور زمینوں سے بڑی ہے، ان سو کے اوپر پھر کرسی ہے۔ اس کے اوپر سمندر ہے۔ اس کے اوپر پھر عرشِ خداوندی ہے۔ تو کرسی گویا جنتوں کی چھت کے اوپر ہے۔ اس میں دربار ہوگا۔

آخرت میں رؤیتِ خداوندی کا مقام...... وہ دربار کہاں ہوگا؟ تو حدیث میں اس کی شرح یہ فرمائی گئی کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام ایک دفعہ حاضر ہوئے تو ایک آئینہ ان کے ہاتھ میں تھا۔ آئینے کے بیچ میں ایک نکتہ تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ نکتہ کیسا ہے؟ عرض کیا کہ اس کا نام مزید ہے۔ فرمایا: مزید، کیا چیز ہے؟

عرض کیا یا رسول اللہ! جنت میں ایک میدان ہے جس کا نام مزید ہے اور وہ اتنا بڑا ہے کہ لاکھوں برس سے میں اس میں گھوم رہا ہوں اور اب تک مجھے اس کے کناروں کا پتہ نہیں چلا کہ کہاں ہیں۔ اس کی ہر چیز سفید ہے، زمین سفید ہے، کنکریاں سفید ہیں، گھاس بھی سفید۔ غرض ہر چیز سفید ہے۔ تو جب جمعہ کا دن آئے گا وقت اس دربار کے لئے تیاری کی جائے گی۔ اس تمام میدان میں بیچوں بیچ تو اللہ تعالیٰ کی کرسی بچھائی جائے گی۔ جس کا ذکر قرآن کریم میں ہے۔

﴿وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَا يَـُٔوْدُهٗ حِفْظُهُمَا﴾ ○ آسمانوں اور زمینوں سے کہیں زیادہ کرسی بڑی ہے، لیکن اس میدان میں جب کرسی بچھے گی تو وہ ایسی معلوم ہوگی جیسے ایک بڑے میدان میں ایک چھوٹا سا چھلہ ڈال دیا جائے۔ وہ بیچوں بیچ بچھائی جائے گی۔ اس کے اردگرد انبیاء علیہم السلام کے منبر ہوں گے۔ وہ نور کے منبر ہوں گے۔ ہر منبر کے پیچھے امتوں کی کرسیاں ہوں گی۔ ہر نبی کی امت اس کے پیچھے ہوگی اور کرسیاں جو ہوں گی وہ علیٰ قدرِ مراتب ہوں گی۔ جو عمل میں انبیاء علیہم السلام سے زیادہ قریب ہیں، ان کی کرسیاں منبر کے قریب اور جو عمل میں بعید تھے، کوتاہ عمل تھے، ان سے ان کی بعید۔ درجہ بدرجہ۔ ②

دربارِ خداوندی میں اہلِ جنت کی شرکت...... جب یہ دربار کا دن آئے گا تو تمام اہلِ جنت دربار کی شرکت کے لئے چلیں گے۔ اب یہ لاکھوں میل کا فاصلہ ہوگا مگر سواریوں پر جائیں گے، تخت ہوا ہوں گے۔ وہاں کوئی مشین

---

① پارہ: ۳، سورۃ البقرۃ، آیۃ: ۲۵۵۔ ② تفسیر ابن کثیر تحت قولہ تعالیٰ ولدینا مزید، ج: ۷، ص: ۳۰۲۔

نہیں ہے۔ جیسے طیارے نہیں ہوں گے کہ ان کی مرمت کی ضرورت پیش آئے۔ بلکہ قوتِ متخیلہ کے تابع ہوں گے۔ تخت پر بیٹھ کر آپ نے ارادہ کیا کہ چلے اب وہ تخت چلنا شروع ہوا، اور لاکھوں میل کا فاصلہ وہاں کی سواریاں پل بھر میں طے کریں گی۔ کوئی براق پر سوار ہے، کوئی تختِ ہوا پر سوار ہے۔ درجہ بدرجہ مختلف سواریاں ہوں گی۔ اس میدان میں آ کر بیٹھیں گے۔ جہاں کرسیاں ہوں گی۔

پھر کرسیوں میں یہ نہیں کہ وہاں نظم کرنے والے کھڑے ہوں کہ بھئی! یہ کرسی تمہاری ہے۔ یہ سیٹ تمہاری ہے۔ وہاں تو بیٹھ جانا یہ نہیں ہوگا۔ ہر شخص اپنی قلبی شہادت سے اپنے مقام کو پہنچے گا۔ ٹھیک اسی کرسی پر جا کر بیٹھے گا جو اس کے نامزد ہے۔ یہ نہیں ہوگا کہ دوسری کرسی پر بیٹھ جائے، تو تمام لوگ جمع ہو جائیں گے اور میدان بھر جائے گا۔ اس میں جو بالکل عوام ہوں گے، جن میں عملی کوتاہیاں زیادہ تھیں، تو کرسیوں کے پیچھے چبوترے ہوں گے۔ ان پر مشک وعنبر کے غالیچے ہوں گے، وہ اس پر بیٹھے ہوئے ہوں گے۔ اب یہ پورا دربار بھر گیا بیچ میں حق تعالیٰ کی کرسی ہے۔ اب کرسی کے اوپر تجلیاتِ ربانی کا ورود شروع ہوگا۔ جیسے احادیث میں فرمایا گیا ہے، یہ محسوس ہوگا کہ جب اللہ کی تجلیات اتریں گی تو کرسی اس طرح چرچرائے گی جیسے اب ٹوٹ کے دی، اب ٹوٹ کے دی۔ وہاں بوجھ بدن کا نہیں ہوگا۔ حق تعالیٰ بدن سے پاک ہیں۔ وہ بدن کے خالق بھی ہیں اور روح کے خالق بھی ہیں۔ وہ عظمت کا بوجھ ہوگا۔ ان کے کمالات کا بوجھ ہوگا جس کو ارواح محسوس کریں گے۔ وہ حسی اور جسمانی بوجھ نہیں ہوگا۔ تو کرسی گویا ایسے چرچرائے گی جیسے تحمل کی طاقت نہیں ہے۔

اب گویا تجلیات اتر چکی ہیں۔ حق تعالیٰ شانہ موجود ہیں، اور انبیاء علیہم السلام اردگرد نورانی منبروں پر ہیں اور ان کے پیچھے امتیں اربوں کھربوں اولین وآخرین جمع ہیں۔

دربارِ خداوندی میں شرابِ طہور کا دور...... حدیث میں ہے کہ حق تعالیٰ ملائکہ علیہم السلام کو فرمائیں گے کہ وہ جو ہم نے قرآن کریم میں وعدہ کیا تھا ﴿وَسَقٰهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا﴾ ① ایک پاک قسم کا شربت ہم پلائیں گے، وہ ان بندوں کو تقسیم کرو۔ ملائکہ تقسیم شروع کریں گے۔ گویا شاہی دربار کی طرف سے ایک ضیافت ہوگی۔ اس کو پئیں گے۔ اس سے ایسا سرور پیدا ہوگا، اس کو نشہ تو نہیں کہہ سکتے۔ روحانی نشہ ضرور ہوگا۔ یعنی دنیا کی شراب میں تو یہ نشہ ہے کہ عقل باقی رہتی ہے۔ آدمی مجنون ہو جاتا ہے خبطی بن جاتا ہے۔ اس شراب کے پینے سے عقل میں اور تیزی پیدا ہوگی اور معارفِ الٰہیہ اور علومِ ربانیہ اور زیادہ کھلنے شروع ہو جائیں گے۔ انوار وبرکات بڑھ جائیں گے۔ تو یہ شرابِ طہور تقسیم ہوگی۔

حضرت داؤد علیہ السلام کی تلاوتِ مناجات...... اس کے بعد حضرت داؤد علیہ السلام جن کو آواز کا معجزہ دیا گیا تھا، اتنی پاکیزہ پاک اور خوشنما آواز تھی کہ جب وہ حمد وثنا کی مناجاتیں پڑھتے تھے تو چرند و پرند سب ان کے ارد

---

① پارہ: ۲۹، سورۃ الدھر، الآیۃ: ۲۱.

گرد جمع ہو کر سر دھنتے تھے اور مست ہو جاتے تھے۔ حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ اے داؤد! ان اہلِ دربار کو وہ مناجاتیں سناؤ جو تم دنیا میں پڑھتے تھے اور اسی اعجازی آواز سے سناؤ۔

حضرت داؤد علیہ السلام حمد وثنا کی وہ مناجاتیں پڑھنا شروع کریں گے۔ تو آواز تو معجزہ تھی ہی۔ اور وہاں میدان میں سارے اللہ والے جمع ہیں، سارے انبیاء علیہم السلام جمع ہیں۔ اربوں کھربوں ملائکہ جمع اور خود حق تعالیٰ شانہ موجود۔ تو اس کی تاثیر کی کیا انتہا ہوگی۔ جب وہ مناجاتیں پڑھی جائیں گی تو عجیب قسم کے اس کے آثار نمایاں ہوں گے، سب بندے اس کے اندر محو ہو جائیں گے۔

جمالِ خداوندی کے دیدار کا سوال...... اس کے بعد حق تعالیٰ فرمائیں گے: ”سَلُوْنِیْ مَا شِئْتُمْ“ جس کا جو جی چاہے ہم سے مانگو اور ہم سے سوال کرے۔ بندے عرض کریں گے کون سی نعمت ہے جو آپ نے ہمیں عطا نہیں کر دی۔ جنت ساری نعمتوں کا مجموعہ ہے۔ وہاں نقص کا نشان نہیں۔ ہر چیز میں کمال ہے، جب آپ نے ہمیں سب کچھ دے دیا تو اب ہم کیا مانگیں؟ ہمارے تو خیال سے بھی زیادہ بلند چیزیں ہمیں مل چکی ہیں۔ اب کیا مانگیں ہمارا تو تخیل بھی نہیں جا سکتا۔

ارشاد ہوگا۔ نہیں، مانگو! جب کسی کی سمجھ میں نہیں آئے گا تو سب مل کر علماء کی طرف رجوع کریں گے کہ تم فتویٰ دو اور مشورہ دو کیا چیز مانگیں۔ ہمیں تو سب کچھ مل چکا ہے۔ ①

تو میں عرض کیا کرتا ہوں کہ لوگ دنیا میں علماء سے کنارہ کشی چاہتے ہیں کہ چھوڑ دیں، یہ وہاں بھی پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ وہاں بھی فتوے کی ضرورت پڑے گی۔ وہاں بھی علماء کی حاجت پڑے گی۔ علمِ خداوندی کے بغیر نہ دنیا میں کام چل سکتا ہے نہ آخرت میں کام چل سکتا ہے۔

علماء فتویٰ دیں گے کہ ایک چیز نہیں ملی، وہ مانگو۔ بے شک ساری نعمتیں مل گئیں۔ مگر ایک چیز ابھی تک نہیں ملی اور وہ یہ کہ جمالِ خداوندی کا دیدار ابھی تک نہیں ہوا۔ وہ طلب کرو۔ اس وقت بندے عرض کریں گے کہ: ”اے اللہ! اپنا جمالِ مبارک دکھلا دیجئے۔ آپ نے سب نعمتیں دے دیں۔ مگر یہ نعمت ابھی تک باقی ہے“۔ یہ درخواست منظور ہو جائے گی۔

نعمتِ مزید...... اور حق تعالیٰ فرمائیں گے: ”اَنْ کَمَا اَنْتُمْ“ ہر چیز اپنی اپنی جگہ ٹھہری رہے۔ اگر یہ نہ فرما دیں تو: ”لَاَحْرَقَ سُبُحَاتُ وَجْهِهٖ مَابَيْنَ يَدَيْهِ“ اس کے چہرے کی پاکیزگیاں ہر چیز کو جلا کر خاک کر دیں۔ خود فرما دیں گے کہ ہر چیز تھمی رہے۔ اس کے بعد حجابات اٹھنے شروع ہو جائیں گے۔ اور سب حجابات اٹھ کر ایک حجابِ کبریائی کا باقی رہ جائے گا۔ ②

اس وقت بندوں کی یہ کیفیت ہوگی کہ ایک تو شرابِ طہور۔ روحانی نشہ چڑھا تھا۔ حضرت داؤد علیہ السلام

---

① الدر المنثور في التفسير بالمأثور، تحت قوله تعالى: وجوه يومئذ ناضرة، ج: ۱، ص: ۱۵۳.

② تفسير ابن كثير ج: ۷، ص: ۴۰.

کے مضمونوں سے معرفت کا نشہ بڑھا۔ حق تعالیٰ کا جمال دیکھ کر اتنے محو ہوں گے کہ ایک کو دوسرے کی خبر نہیں رہے گی۔ اور یہ سمجھیں گے کہ کوئی نعمت ہی ہمیں اب تک جنت میں نہیں ملی تھی۔ آج ہمیں نعمت ملی ہے۔ اس نعمت کا نام شریعت کی اصطلاح میں "مزید" ہے۔ تو حضرت جبرئیل علیہ السلام نے کہا کہ یہ وہ میدان مزید ہے۔ اس میں وہ نعمت ملے گی جو سب کے اوپر مزید ہے۔ جس کو قرآن کریم میں فرمایا گیا: ﴿وَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ﴾ ① ہم ضابطے کا اجر تو سب کو دیں گے۔ اور کچھ مزید بھی ہے جو ہم بعد میں عطا کریں گے۔ وہ مزید یہ نعمت ہو گی۔

یوم المزید اور اس کے آداب...... اسی لئے شریعت کی اصطلاح میں جمعہ کا نام "یَوْمُ الْمَزِیْدِ" ہے تو دنیا میں اس میدان مزید کی نقل جمعہ کا دن رکھی گئی ہے۔ جمعہ کا دن گویا دربار خداوندی کا دن ہے۔ امام اور خطیب نائب خداوندی ہو کر بیٹھتا ہے۔ اسی واسطے فرمایا فرمایا گیا ہے کہ کوشش کرو کہ امام کے قریب بیٹھو۔ جو جمعہ کے اندر امام کے قریب بیٹھنے کی عادت ڈالے گا۔ اسے وہاں بھی اللہ کے قریب اور انبیاء علیہم السلام کے قریب جگہ ملے گی اور جو یہاں سستی کرے گا، پیچھے رہے گا۔ وہاں بھی پیچھے رہ جائے گا۔

اسی واسطے فرمایا گیا: "اِذَا خَرَجَ الْاِمَامُ فَلَا صَلٰوۃَ وَلَا کَلَامَ." ② جب خطبہ پڑھنے کے لئے خطیب نکل آئے تو نہ سلام و کلام کرنے کی اجازت ہے، نہ نماز پڑھنے کی اجازت ہے، نہ تلاوت کرنے کی اجازت ہے۔ اس وقت سب سے بڑی عبادت یہ ہے کہ آدمی خطیب کو دیکھے۔ اگر سامنے نہ ہو تو کم سے کم اس کی آواز سے کان لگائے۔ آواز سنائی نہ دے تو استماع کرے۔ کان لگائے۔ یعنی خطیب ہی کی طرف متوجہ رہے۔ اس وقت یہی سب سے بڑا کام ہے۔ یہ خطبہ عام وعظوں کی طرح وعظ نہیں ہے۔ اس میں تو بات بھی کر سکتے ہیں۔ ایک دوسرے کی طرف دیکھ بھی سکتے ہیں۔ لیکن خطبے کے آداب یہ ہیں کہ نہ کنکر سے نہ تنکوں سے کھیلو، نہ نماز پڑھو، نہ ذکر کرو۔ بس امام کو دیکھو۔ اس وقت تمہاری سب سے بڑی یہی عبادت ہے۔

چنانچہ فرمایا گیا: "مَنْ مَسَّ الْحَصَا فَقَدْ لَغَا." جس نے کنکری چھوئی اس نے لغو حرکت کی۔ ③ جس نے چٹائی کا کوئی تنکا چھوا، اس نے لغو حرکت کی۔ اس کا کام یہ نہیں تھا، اس کا کام یہ تھا کہ امام کو دیکھے۔ سامنے نہ ہو تو کم سے کم یہ ہے کہ ادھر آنکھ لگائے۔ آواز نہ آئے تو ادھر کان لگائے۔ غرض ہمہ تن امام کی طرف متوجہ رہے۔ جو جتنا یہاں اس توجہ کی مشق کرے گا۔ وہی میدان مزید میں اللہ کی طرف متوجہ ہوگا۔ جو جتنا یہاں قریب ہوگا وہاں قریب ہوگا۔ جو جتنا زیادہ جمعہ میں متوجہ ہوگا، وہاں متوجہ ہوگا تو جمعہ درحقیقت اس دربار خداوندی کی ایک نقل ہے جو دنیا میں ہمیں دی گئی ہے۔ اس کا نام میدان مزید تھا اور دن کا نام بھی مزید، وہی نام جمعہ کے دن کا ہے۔ اسے یوم

---

① پارہ: ۲۶ سورۃ ق، الآیۃ: ۳۵۔ ② علامہ زیلعیؒ فرماتے ہیں: غریب مرفوعاً قال البیہقی: رفعہ وہم فاحش انما ہو من کلام الزہری، دیکھئے نصب الرایۃ، کتاب الصلوٰۃ، باب صلاۃ الجمعۃ ج:۲ ص:۲۰۴.

③ السنن لابن ماجہ، کتاب اقامۃ الصلوٰۃ والسنۃ فیہا، باب مسح الحصا فی الصلوٰۃ ج:۳ ص:۲۰۹.

المزید کہا گیا ہے کیوں کہ اجر وثواب کے اندر زیادت پیدا کرتا ہے۔

تو حدیث مجھے اس پر یاد آ گئی تھی کہ عبادت میں اصل تو یہ ہے کہ معبود سامنے ہو اسے دیکھ کر عبادت کرے۔ لیکن دنیا میں یہ چیز ناممکن ہے بلکہ ذات کا دیکھنا آخرت میں بھی ناممکن ہے۔ تجلیات ہی کو دیکھے گا، عکس ہی کو دیکھے گا، پردوں کو دیکھے گا۔ ذات نگاہ کے احاطے میں نہیں آ سکتی۔ ﴿لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ﴾ ① ذات کے اوپر آپ کی نگاہ غالب نہیں آ سکتی، نہ چھا سکتی ہے۔

رؤیت باری کے بارے میں معتزلہ کا مسلک...... اسی واسطے مسلمانوں میں ایک معتزلہ کا فرقہ ہے، اس نے دیدار خداوندی کا انکار کر دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ دیدار وغیرہ کچھ نہیں ہوگا۔ یہ ناممکن اور محال ہے اور اس کو عقلاً محال کہتا ہے کہ یہ نہیں ہو سکتا۔

مسلکِ اہلِ حق...... لیکن انبیاء علیہم السلام اور اہلِ حق کا مسلک یہ ہے کہ قیامت کے دن حق تعالیٰ کا دیدار ہوگا۔ قرآن کریم میں فرمایا گیا: ﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ﴾ ② بہت سے تروتازہ چہرے ہوں گے جو پروردگار کو دیکھ رہے ہوں گے اور کفار کو دھمکی دی گئی ہے کہ: ﴿كَلَّا إِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ﴾ ③ کفار کو دھمکی دی گئی ہے کہ قیامت کے دن تمہارے اور اللہ کے درمیان حجابات آ جائیں گے، تم اللہ کو نہیں دیکھ سکو گے۔ نہ دیکھنے کی دھمکی دینا جبھی ممکن ہے جب دیکھنا ممکن ہو۔ بہر حال قرآن کریم اور تمام آسمانی کتابوں کا مسلک اور تمام انبیاء علیہم السلام کا مسلک یہی ہے کہ آخرت میں دیدار خداوندی ہوگا۔ مگر معتزلہ ایک فرقہ ہے جو اسے نہیں مانتا۔ وہ کہتا ہے کہ عقلاً محال ہے۔

مناظرے میں معتزلہ کی شکست...... چنانچہ مامون کے زمانے میں یہ بڑا فتنہ پھیلا۔ معتزلہ غلبہ پا گئے اور انہوں نے کہنا شروع کر دیا کہ دیدار خداوندی محال ہے۔ عقلاً ممکن نہیں ہے، واقعتاً تو ہوگا ہی نہیں۔ عقل بھی قبول نہیں کر سکتی۔ اس کے انہوں نے دلائل بیان کیے۔ مسلمان فتنے میں گرفتار ہونا شروع ہوئے۔ علماء نے جوابات دینا شروع کیے مگر مشکل مسئلے کا اعتراض جلد سمجھ میں آ جاتا ہے اور جواب دیر سے سمجھ میں آتا ہے۔ دقیق مسئلہ تھا تو اعتراض تو سب کی سمجھ میں آ گیا۔ جواب سمجھ میں نہ آئے۔ فتنہ بڑھتا رہا۔ علماء عاجز آ گئے۔

آخر اس زمانے کے شیخ ہیں۔ حضرت شیخ شبلیؒ۔ ان کی خدمت میں علماء کا ایک وفد حاضر ہوا کہ حضرت! جتنا ہمارے امکان میں تھا ہم جوابات دے چکے۔ مگر وہ جوابات علمی ہیں اور عوام علم کی باتیں سمجھتے نہیں۔ اس واسطے شبہات تو ان کے دلوں میں بیٹھ گئے۔ جوابات نہیں بیٹھتے۔ مگر اب ہم کیا کریں۔ اب تو اہل اللہ کچھ قلبی تصرف و توجہ سے کام کریں تو یہ فتنہ رفع ہو۔ محض علم سے رفع نہیں ہوگا۔

حضرت شیخ شبلیؒ نے فرمایا کہ: اچھا! اعلان کر دو کہ ہم معتزلہ سے مناظرہ کریں گے۔ اعلان ہو گیا۔ اور جامعہ

---

① پارہ: ۷، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۱۰۳۔ ② پارہ: ۲۹، القیامۃ، الآیۃ: ۲۲۔ ③ پارہ: ۳۰، المطففین، الآیۃ: ۱۵۔

بغداد میں لاکھوں آدمی جمع ہوئے۔ اوّل تو اس لئے کہ شیخ شبلی اور وعظ کہیں۔ کبھی نہیں وعظ فرماتے تھے۔ ایک نئی چیز معلوم ہوئی کہ شیخ کبھی مجمع میں وعظ کہنے کے لئے نہیں آتے تھے۔ آج وعظ فرمائیں گے، تو لاکھوں لوگ جمع ہوئے۔

دوسرے یہ کہ نام مناظرہ کا تھا اور مناظرہ در حقیقت جھگڑا ہے۔ چاہے وہ علمی ہی سہی۔ عوام کو جھگڑوں سے زیادہ دلچسپی ہے۔ کوئی سکون کی بات ہو کوئی نہیں جائے گا اور جھگڑا ہو تو ہزاروں وہاں پہنچ جائیں گے۔ تو لوگوں نے کہا کہ آج مناظرہ اور بحث ہوگی۔ بڑا تماشہ ہوگا۔ غرض لاکھوں آدمی جمع ہو گئے۔

منبر بچھایا گیا۔ حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ بیٹھ گئے۔ معتزلہ کے جتنے علماء تھے وہ قطار باندھ کر سامنے بیٹھ گئے۔ تو شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: تمہارا دعویٰ کیا ہے؟ معتزلہ نے کہا کہ دعویٰ ہمارا یہ ہے کہ اللہ کا دیکھنا ناممکن و محال ہے، کبھی نہیں ہو سکتا۔ عقل گوارا نہیں کرتی، عقلاً محال ہے"۔

تو اہل اللہ پر حقائق روشن ہوتے ہیں۔ وہ لفظوں کی گرفت سے تھوڑا ہی گرفت کرتے ہیں۔ وہ لمبی تقریریں تھوڑا ہی کرتے ہیں۔ وہ چٹکی میں ضمیر کو تھام لیتے ہیں۔ شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے دو منٹ میں فیصلہ کر دیا۔ سارے مناظرے ختم ہو لیے۔

"معتزلہ سے پوچھا کہ تمہارے دلائل اپنی جگہ ہیں۔ ہمیں اس سے بحث نہیں۔ ہم تمہارے دل سے بات پوچھنا چاہتے ہیں کہ تمہارا دل بھی چاہتا ہے اللہ کو دیکھنے کو؟" سب نے کہا دل تو چاہتا ہے۔

فرمایا: یہ دلیل ہے کہ دیکھا جانا ممکن ہے۔ اس لئے محال کو دیکھنے کی تمنا کبھی قلب کے اندر نہیں آسکتی۔ اسی چیز کو دیکھنے کی تمنا آئے گی جس کو دیکھا جانا ممکن ہو۔ کبھی آدمی تمنا نہیں کرے گا کہ میں کان سے دیکھ لوں۔ اس لئے کہ کان کے اندر دیکھنے کی قدرت ہی نہیں۔ آنکھ سے ہی دیکھنے کی تمنا کرے گا۔ کبھی یہ تمنا نہیں کرے گا کہ میں زبان سے آواز سن لوں زبان چکھنے کے لئے ہے۔ آواز سننے کے لئے نہیں۔ اس کے لئے کان ہیں۔ تو کان سے سننے کی اور آنکھ سے دیکھنے اور زبان سے چکھنے کی تمنا کرے گا۔ یہ نہیں کر سکتا کہ آنکھ کا کام زبان سے لینے لگے اور زبان کا کام آنکھ سے لینے لگے یہ دل میں آتا ہی نہیں۔

تو شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ: جب تمہارے دل میں تمنا ہے کہ ہم اللہ کو دیکھیں تو تمنا اور دل کے اندر ہونا، اس کی دلیل ہے کہ دیکھا جانا ممکن ہے۔ جس کا دیکھا جانا محال ہو کبھی اس کے دیکھنے کی تمنا دل میں نہیں آسکتی۔ تو امکان تمہارے ضمیر سے ثابت ہو گیا اور وقوع پیغمبر کی خبر سے ثابت ہے۔ اب بتلاؤ تمہارا کیا اعتراض ہے؟

اب وہ چپ چاپ بیٹھے۔ وہ تو ان کا دل پکڑا گیا۔ سارا قصہ ختم ہو گیا۔ ساری بحث ختم ہوئی اور فتنہ ایک منٹ میں ختم ہو گیا۔ بہر حال مقصد یہ تھا کہ دیدارِ خداوندی کی تمنا ہر انسان کے دل میں ہے کہ میں اپنے معبود کو دیکھوں۔ اسی تمنا میں وہ نمازیں پڑھتا ہے۔ اسی تمنا میں وہ عبادتیں کر رہا ہے۔

دیدارِ خداوندی میں درجہ بدرجہ ترقی...... یہاں عقیدے کی آنکھ سے دیکھتا ہے، اور آگے بڑھا تو خواب کی آنکھ

سے دیکھتا ہے، اور آگے بڑھا تو کشف کی آنکھ سے دیکھتا ہے۔ موت کے بعد جب آگے بڑھے گا تو پھر اس آنکھ سے دیکھنا شروع کر دے گا تو درجہ بدرجہ اس کا ابھی سے دیدار شروع ہو گیا ہے۔ نماز کے اندر تصور اور عقیدے سے دیکھنا، یہ دیکھنے کی ابتداء ہے۔ ترقی کرتے کرتے بالآخر وہ چیز آنکھ کے سامنے آ جائے گی۔ جو دل میں جم جاتی ہے۔

یہ ایک فطری اصول ہے کہ اگر آپ تصور سے کوئی چیز دل میں جمالیں تو چند دن کے بعد وہ آنکھوں کے سامنے کھڑی نظر آئے گی۔ ایک بزرگ سے کوئی صاحب بیعت ہوئے۔ شیخ نے انہیں بیعت کر لیا اور ذکر، شغل بتلا دیا۔ محنت بھی کی، مجاہدے بھی کئے۔ مگر یکسوئی نصیب نہیں ہوتی تھی کہ ہر چیز سے کٹ کے توجہ الی اللہ پیدا ہو جائے۔ بہت علاج کئے مگر یہ نہیں ہوتی تھی۔

تو شیخ نے کہا تمہیں کسی چیز سے محبت بھی ہے؟ اس نے کہا جی! مجھے بھینس سے محبت ہے۔ جیسی روح ویسے فرشتے۔ فرمایا اچھا بیٹھ کر چلہ کرو۔ چالیس دن بھینس کا تصور کرو۔ چلہ کرایا۔ وہ حجرے میں بیٹھ گئے۔ طبیعت کا میلان تو بھینس کی طرف تھا ہی۔ تصور کیا تو وہ دل میں جمنے لگی۔ چالیس دن کے بعد شیخ گئے اور فرمایا باہر آؤ۔ دروازہ کھولا۔

اس نے کہا باہر کیسے آؤں۔ بھینس کھڑی ہوئی ہے۔ راستہ رکا ہوا ہے۔ حالانکہ نہ بھینس تھی نہ کچھ تھا۔ مگر دل میں بھینس اتنی جم گئی تھی کہ آنکھوں سے وہی نظر آنے لگی۔ معلوم ہوا کہ بھینس دروازہ روکے کھڑی ہے۔ تو یہ ایک فطری چیز ہے کہ جو چیز آدمی کے دل میں جم جاتی ہے وہ مصور ہو کر آنکھ کے سامنے آنے لگتی ہے۔

تو جب دل میں جمائیں گے کہ میں اپنے پروردگار کو دیکھ رہا ہوں اور عقیدے کی آنکھ سے دیکھیں گے اور پھر ترقی کر کے خواب میں دیکھنے لگیں گے۔ تو ایک وقت آئے گا کہ اس آنکھ سے بھی اللہ کا دیدار ہو جائے گا۔ جس درجہ میں بھی ہو۔ بہر حال دیدار ہو گا۔ تو اصل نماز تو وہاں ہو گی۔

روح کا عروج اور عرش کے سامنے سجدہ...... جیسے کہ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ جب آدمی انتقال کرتا ہے تو اس کی روح کو آسمانوں کی طرف چڑھا دیا جاتا ہے۔ صالح آدمی ہے تو لاکھوں ملائکہ اس کے ساتھ ہوتے ہیں۔ تو اس کی روح کو عروج نصیب ہوتا ہے۔ آسمان اول کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔ وہاں کے ملائک اس کے ساتھ ہوتے ہیں۔ اگلا آسمان آیا تو اس کے دروازے کھلتے ہیں تو وہاں کے ملائک اس کا استقبال کرتے ہیں۔ اس جلوس کے ساتھ وہ عرش کے نیچے پہنچتی ہے اور وہاں جا کر سجدہ کرتی ہے۔ تو وہ سجدہ جو عین عرش کے سامنے ہے، مرنے کے بعد نصیب ہو گا مرنے سے پہلے مشکل ہے۔

دنیوی جذبات کا برزخ میں ظہور...... جس کے دل میں نماز کی لو لگی ہوئی ہے وہ برزخ میں بھی نماز کی لو لے کر جائے گا، حشر میں بھی نماز کا جذبہ لے کر جائے گا۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ جب میت کو قبر میں رکھ دیا جاتا ہے تو دو ملائکہ آ کر اس سے سوال کرتے ہیں، وہ پوری زندگی کا جائزہ لیتے ہیں اور تین سوال ہوتے ہیں۔ مـــــن

رَبُّکَ؟ تیرا رب کون تھا؟ وَمَا دِیْنُکَ؟ تیرا دین کیا تھا؟ وَمَنْ ھٰذَا الرَّجُلُ؟ اور یہ کون ہے؟ ①

یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ یہ سوال کرتے ہیں۔ تو حدیث میں فرمایا گیا کہ میت کو ایسا متمثل ہوتا ہے کہ سورج غروب ہونے کے قریب ہے۔ دھوپ پر زردی چھا چکی ہے۔ مغرب کا وقت قریب ہے۔ حالاں کہ سورج وہاں نہیں ہوتا۔ مگر وہ وقت کی صورت مثالی نمایاں ہوتی ہے۔ تو ملائکہ یہ پوچھتے ہیں کہ مَنْ رَبُّکَ؟ وہ کہتا ہے کہ دَعُوْنِیْ اُصَلِّیْ میاں پرے کو ہٹو۔ مجھے نماز پڑھنے دو۔ وقت تنگ ہو رہا ہے۔ غروب ہو جائے گا تو میری عصر کی نماز قضا ہو جائے گی۔ تو ایک فرشتہ دوسرے سے کہتا ہے کہ اس سے کیا رب کا سوال کرتے ہو۔ یہ تو رب پر اتنا مٹا ہوا ہے کہ یہاں بھی نماز پڑھنے کو تیار ہے۔ دوسرا فرشتہ کہتا ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ یہ جواب سچا دے گا مگر ہماری تو ڈیوٹی ہے، ہمیں تو ادا کرنی ہے، سوال کرنا ہی ہے۔ یہ ہم جانتے ہیں کہ جواب حق دے گا۔

مگر دَعُوْنِیْ اُصَلِّیْ پرے کو ہٹو۔ مجھے نماز پڑھنی ہے۔ یہ کون کہے گا؟ جسے دنیا میں نماز کی عادت ہوگی۔ اور جو دنیا میں ٹلاتا رہتا ہے اسے دَعُوْنِیْ اُصَلِّیْ کہنے کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔ اس کے لئے تو دنیا میں روز وقت تنگ ہوتا تھا تو نہ نماز کا تھا نہ روزہ کا۔ تو دنیا میں جس چیز کی مشق کر لیں گے وہی سامنے آئے گی۔ جس چیز کی عادت ڈال لیں گے آخرت میں وہی متمثل بنے گی۔ ②

دنیوی جذبات کا آخرت میں ظہور...... حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے: "تُحْشَرُوْنَ کَمَا تَمُوْتُوْنَ وَ تَمُوْتُوْنَ کَمَا تَحْیَوْنَ." تمہارا حشر اس حالت پر ہوگا جس حالت میں موت آئے گی اور موت اس حالت پر آئے گی جس حالت پر زندگی گزاری ہے۔ اگر لہو ولعب، کھیل کود اور مختلف عیش و آرام کی حالتوں میں زندگی گزاری ہے، موت کے وقت بھی انہی چیزوں کا دھیان رہے گا اور قبر سے اٹھے گا تب بھی انہی چیزوں کا دھیان رہے گا۔

اور اگر اللہ کے ذکر اور اس کے نام لینے میں اور اس کے فرائض کے ادا کرنے میں زندگی گزاری ہے۔ وہی جذبہ موت کے وقت رہے گا کہ کسی طرح میری نماز قضا نہ ہو۔ کسی طرح میرا ورد اور وظیفہ قضا نہ ہو۔ اور جب قبر سے اٹھے گا وہی جذبہ ہوگا کہ کہیں میرا ورد قضا نہ ہو جائے، بعد میں پتہ چلے گا کہ یہ میدان محشر ہے۔ مگر وہ یہی سمجھے گا کہ یہ دنیا ہے۔

حدیث میں ہے کہ اگر کوئی حاجی لَبَّیْکَ کہہ رہا تھا اور اتفاق سے اونٹ سے گر پڑا اور موت واقع ہوئی تو قیامت کے دن جب اٹھے گا تو لَبَّیْکَ لَبَّیْکَ اس کی زبان پر جاری ہوگا اور وہ سمجھے گا کہ میں میدان عرفات میں ہوں۔ بعد میں اس پر کھلے گا کہ یہ میدان محشر ہے۔ میدان عرفات نہیں ہے۔ مگر جذبہ وہی رہے گا جو دنیا میں پیدا کیا تھا۔ تو موت حقیقت میں قاطع نہیں ہوتی کہ کسی چیز کو قطع کر دے۔ متمم اور مکمل ہوتی ہے، جو دنیا کی زندگی کے جذبات ہیں ان کو حد کمال تک پہنچا کر نفس کا جوہر بنا دیتی ہے۔ تو جس حالت پر زندگی گزرے گی اسی

---

① السنن لابی داؤد، کتاب الجنائز، باب فی المسألة فی القبر، ج: ۳، ص: ۳۶۷، رقم: ۳۲۱۲۔

② السنن لابی داؤد کتاب الجنائز باب فی المسألة فی القبر، ج: ۳، ص: ۳۶۷، رقم: ۳۲۱۲۔

حالت پر موت آئے گی اور جس حالت پر موت آئے گی اسی حالت پر حشر ہوگا۔

تو میرے عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ دنیا میں جب نماز کی عادت تھی اور وقت ٹلا کر پڑھنے کی نہیں تھی، بروقت پڑھنے کی تھی وقت ٹلنے لگا اور تنگ ہونے لگا تو پریشانی اور اضطراب ہوتا تھا کہ کہیں میری نماز قضاء نہ ہو جائے۔ وہی قبر میں کہے گا دَعُوْنِیْ اُصَلِّیْ پرے کوہٹو۔ وقت تنگ ہو رہا ہے۔ مجھے نماز پڑھنے دو۔ جسے دنیا میں عادت نہیں تھی وہ وہاں بھی نہیں کہے گا اور آخرت میں بھی یوں ہی جذبہ رہے گا۔

سایۂ عرش میں اشتیاقِ نماز...... ہمارے حضرت حاجی امداد اللہ قدس اللہ سرہ، جو پوری جماعتِ دیوبند کے شیخ طریقت ہیں۔ ان کا ارشاد ہے کہ اگر حق تعالیٰ نے مجھ سے قیامت کے دن پوچھا کہ امداد اللہ! مانگ کیا مانگتا ہے۔ تو میں عرض کروں گا کہ "یا اللہ! نہ مجھے جنت کی ضرورت ہے، نہ حوریں مطلوب ہیں، نہ محلات مطلوب ہیں، نہ باغات مطلوب ہیں۔ مجھے تو اپنے عرش کے نیچے ڈیڑھ گز کی جگہ دے دیجئے کہ کھڑا ہو کر نماز پڑھتا رہوں"۔ اللہ سے میں یہ مانگوں گا۔ تو اہل اللہ کو نماز میں وہ لطف میسر ہوتا ہے کہ سلطنتیں بھی چھوڑنے کے لئے تیار ہیں مگر نماز چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

لطفِ نماز...... حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: "جُعِلَ قُرَّةُ عَیْنِیْ فِی الصَّلٰوۃِ" ① "نماز میں میری آنکھوں کی ٹھنڈک رکھی گئی ہے"۔ نماز پڑھ کر آنکھیں ٹھنڈی ہوتی ہیں۔ دل میں سرور اور فرحت پیدا ہوتی ہے۔ بہر حال نماز ایک ایسی چیز ہے کہ اس سے دل میں سرور اور فرحت اور دیدارِ خداوندی کی صلاحیت اور دیدار کی تڑپ کہ کسی طرح میں اپنے معبود کو دیکھ لوں، پیدا ہوتی ہے۔ یہ نماز کی خاصیت ہے۔

تو ایک زکوٰۃ کی خاصیت تھی کہ حسنِ معاشرت پیدا ہو، ایک روزے کی خاصیت تھی کہ نفس کے اندر سے شہوانی جذبات گھٹ جائیں۔ ایک زکوٰۃ کی خاصیت یہ تھی کہ نفس کے اندر سے بخل کا رذیلہ مٹ جائے۔ اسی طرح ایک نماز کی خاصیت ہے کہ اس سے دیدارِ خداوندی کی صلاحیت بھی پیدا ہو جائے اور تڑپ بھی پیدا ہو جائے، تو عبادات میں اللہ تعالیٰ کو خاص تعلق نماز ہی سے ہے۔

حقیقی عبادت...... حقیقت میں اگر حقیقی عبادت ہے تو نماز ہے۔ دوسری عبادتیں دوسری وجوہ سے عبادت بن گئی ہیں۔ اپنی ذات سے عبادت نہیں ہیں۔ نماز اپنی ذات سے عبادت ہے۔ اس لئے کہ عبادت کے معنی عبادت تذلل کے ہیں۔ یعنی اللہ کے آگے انتہائی ذلت اختیار کرنا۔ کیوں کہ اللہ کی ذات وہ ہے کہ انتہائی عزت میں ہے کہ عزت کا کوئی مقام نہیں ہے کہ اس کے پاس نہ ہو۔ اس لئے اس کے سامنے اتنی ذلت پیش کرنی چاہئے کہ ذلت کا کوئی درجہ باقی نہ رہے، جو بندہ اپنے پروردگار کے سامنے پیش نہ کر دے۔

اب ظاہر بات ہے کہ زکوٰۃ ہے اس میں غایت تذلل کہاں ہے؟ زکوٰۃ میں تو آپ غریب کو عطاء کرتے

---

① السنن للنسائي، كتاب العشرة، باب حب النساء، ج: ۱۲، ص: ۲۷۷، رقم: ۳۹۷۷.

ہیں۔ تو عطا کرنا تو اللہ کی شان ہے۔ آپ اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ مشابہت پیدا کر رہے ہیں۔ وہ بھی معطی ہے۔ آپ بھی عطا کر رہے ہیں، تو اس میں ذلت کیا ہوئی؟ یہ تو عین عزت کی چیز ہوئی۔ جب اس میں ذلت کا نشان نہیں تو عبادت کیسے بنی؟

آپ روزہ رکھتے ہیں، کھانا چھوڑ دیا پینا چھوڑ دیا، بیوی چھوڑ دی۔ یہ تو حق تعالیٰ کی شان ہے کہ کھانے سے بھی بری، پینے سے بھی بری، بیوی سے بھی بری۔ یہ اللہ کے ساتھ مشابہت ہوئی۔ اس میں ذلت کہاں ہے۔ یہ تو عین عزت کا مقام ہے۔ غرض روزہ اپنی ذات سے عبادت نہیں، اس میں غایت تذلل ہی نہیں۔ لیکن نماز وہ ہے کہ اول سے لے کر آخر تک سوائے اظہارِ ذلت کے اور کوئی چیز نہیں۔

ابتداءً آپ نوکر چاکروں کی طرح سے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوتے ہیں اور غلاموں کی طرح گردن جھکا دیتے ہیں۔ یہ ذلت کا ابتدائی درجہ ہے جو آپ اپنے رب کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ اس کے بعد آگے بڑھے۔ سر جھکایا، رکوع کیا۔ اس میں پہلے سے بھی ذلت کا بڑا درجہ ہے۔ اس کے بعد تیسرا درجہ ہے کہ ناک اور پیشانی زمین پر رگڑتے ہیں جو انتہاء ذلت کا مقام ہے، اس کے بعد پھر اور ہے کہ آپ تشہد میں بیٹھ کر بھیک مانگتے ہیں کہ یا اللہ مجھے یہ دے۔ بھیک مانگنا سب سے زیادہ ذلت کی چیز ہے۔ تو نماز میں جتنے افعال ہیں، قیام ہو، رکوع ہو، سجدہ ہو، تشہد ہو سب میں اپنی نیازمندی اور ذلت کا اظہار ہے۔ اس لئے حقیقی معنی میں اگر عبادت ہے تو صرف نماز ہے۔ دوسری چیزیں دوسری وجوہ سے عبادت بنی ہیں۔ زکوٰۃ اپنی ذات سے عبادت نہیں ہے۔ پھر کیوں عبادت بنی؟ تعمیلِ حکم کی وجہ سے۔ حکمِ خداوندی ہے کہ زکوٰۃ دو۔ تعمیل کی۔ تو تعمیلِ ارشاد کی وجہ سے یہ عبادت بن گئی۔

روزہ اپنی ذات سے عبادت نہیں ہے، تعمیلِ حکم کی وجہ سے عبادت بن گیا ہے۔ حکم ہے کہ روزہ رکھو۔ تعمیل کی وجہ سے عبادت بن گیا۔ لیکن نماز اپنی ذات سے عبادت ہے، اس لئے کہ جتنی ہیئتیں ہیں، سب اظہارِ ذلت کی ہیں۔

پھر نماز کے اندر جو بھی آپ پڑھیں گے تسبیح و تہلیل میں، یا تو اللہ تعالیٰ کی عظمت کا اظہار ہے یا اپنی فدویت کا اظہار۔ یا اللہ کی عظمت کا اظہار کریں گے کہ ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ ① ساری تعریفیں اللہ کے لئے ہیں وہ رحمٰن ہے، رحیم ہے، ﴿مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ﴾ ② یوم الدین کا مالک ہے، یا اپنی فدویت کا اظہار ہے کہ ﴿اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ﴾ ③ ہم آپ ہی کی عبادت کریں گے اور ہم تو آپ ہی سے مانگتے ہیں۔ غرض یا تو اللہ کی عظمت کا اظہار یا اپنی ذلت کا اظہار۔ اس کے سوا نماز میں اذکار ہوں یا اعمال ہوں، سب کی یہی حیثیت ہے۔ تو حقیقی معنی میں اگر عبادت ہے تو وہ نماز ہے۔ دوسری عبادتیں دوسری وجوہ سے عبادتیں بنی ہیں۔ یہ اپنی ذات سے عبادت ہے۔ تو ظاہر بات ہے کہ عبادت کرنے والے عابد کا جذبہ ہوگا کہ معبود میرے سامنے ہو تاکہ میں دیکھوں میں جس کی عبادت کر رہا ہوں۔ تو یہ جذبہ لے کر کھڑا ہوا ہے۔

---

①②③ سورۃ الفاتحۃ الآیۃ: ۲-۴۔

جذبۂ عبادت کی تسکین......اللہ نے اس جذبے کی تسکین کا سامان کر دیا کہ دنیا گندی جگہ ہے۔ دیدارِ خداوندی یہاں نہیں ہو سکتا۔ تو عقیدے کی آنکھ سے اللہ کو دیکھو، دل میں یقین کے ساتھ تصور باندھو کہ میں اللہ کو دیکھ رہا ہوں۔ اس کے بعد ہم مزید روشنی دیں گے کہ تمہارے اوپر کچھ انکشاف ہوگا، انوارِ ربانی کچھ نظر پڑنے لگیں گے۔ اس کے بعد میں اور انکشاف ہوگا۔ آنکھوں سے بھی تجلیاتِ الٰہیہ دنیا میں نظر آ سکتی ہیں۔ اس کے بعد مزید انکشاف ہوگا۔ مگر وہ موت کے بعد قیامت کے دن ہوگا کہ ذات کے ہم پلہ تجلی سامنے آئے گی اور بندے آنکھوں سے اپنے پروردگار کو دیکھیں گے۔ تو نماز کی ایک خاصیت ہے تو بات اس پر چلی تھی کہ دواؤں کی الگ الگ خاصیتیں ہیں۔ اسی طرح سے عبادات کی بھی الگ الگ خاصیتیں ہیں۔

مجموعۂ شریعت پر عمل کی تاثیر......اور جیسے دواؤں میں ایک مقدار ہے جو فن دان طبیب مقرر کرتا ہے کہ یہ دوا تین ہی ماشے ہوگی اور یہ ایک تولہ ہوگی۔ ایسے ہی تسبیحات کے عدد بھی شارع علیہ السلام نے متعین کیے ہیں کہ رکوع میں "سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْمِ" کہو تو کم سے کم تین مرتبہ ہو۔ تین سے کم نہ ہو۔ پانچ دفعہ کہہ لو۔ سات دفعہ کہہ لو۔ مگر تین سے کم سنت کے مطابق نہیں ہوگا۔ تو مقدار تین بتلائی گئی۔ اسی طرح "سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی" کم سے کم تین دفعہ۔ فاتحہ پڑھو تو ایک دفعہ، اس میں تکرار نہیں تو سورت پڑھو تو ایک دفعہ، اس میں تکرار نہیں، تشہد میں درود شریف پڑھو تو ایک دفعہ، اس میں تکرار نہیں تو ہر چیز میں کہیں تکرار ہے، کہیں تکرار نہیں۔ جہاں تکرار ہے وہاں عدد معین ہے کہ اتنے عدد میں پڑھو۔ دو دفعہ یا تین دفعہ۔

اسی طرح نمازوں کی رکعات کے اعداد متعین کر دیئے، صبح کی نماز دو رکعت کی، مغرب کی نماز تین رکعت کی، بقیہ نمازیں چار چار رکعت کی۔ تو کسی کو یہ حق نہیں ہے وہ کہے کہ یہ چار رکعت والی کی پانچ رکعت کیوں نہ کر دیں؟ اور تین والی کی دو دو رکعت کیوں نہ کر دیں؟

جو جواب طبیب دنیا میں فن کی رو سے دے گا کہ جو مقدار فن کی رو سے ضروری ہے وہی میں لکھوں گا، مریض کو کمی زیادتی کرنے کا حق نہیں ہے۔ وہی انبیاء علیہم السلام کی طرف سے جواب ہے کہ اللہ نے یہ اذکار کی دوائیں مقرر کی ہیں۔ اس کی مقداریں بھی خود مقرر کی ہیں۔ ہمیں ان میں کمی یا زیادتی کرنے کا کوئی حق نہیں۔ جتنی مقدار آئے گی اتنی استعمال کریں گے۔ زیادہ کریں گے، ہلاکت واقع ہوگی۔ اگر کوئی ظہر کی نماز پڑھے اور یہ خیال کرے کہ نماز تو اچھی چیز ہے، لاؤ آج آٹھ یا بارہ رکعات پڑھ لوں۔ وہ منہ پر ماردی جائے گی اور ہلاکت کے قریب ہو جائے گا۔ حالاں کہ اس نے زیادتی ہی تو کی ہے۔ مگر زیادتی بھی ناجائز، کمی بھی ناجائز۔ یہ مقدار شارعِ حقیقی کی طرف سے معین ہے، وہی مقدار رکھنی پڑے گی۔ اس واسطے جب مجموعۂ شریعت پر عمل ہوگا پھر روحانی صحت کامل نصیب ہو جائے گی۔ جیسے کہ گل بنفشہ پیا تو زکام دفع ہو گیا۔ ملٹھی کھائی تو کھانسی رفع ہو گئی، یاقوتی کھائی تو دماغ میں طاقت پیدا ہو گئی، مفرح بارد کھایا تو قلب میں فرحت پیدا ہو گئی اور اگر ان ساری چیزوں کا مجموعہ معجون مرکب بنا

کر کھاؤ تو صحت کامل بن جاتی ہے۔ یہی صورت شریعت کی ہے کہ الگ الگ اعمال کی بھی خاصیتیں ہیں اور مجموعۂ شریعت کو استعمال کرو تو مکمل طریق پر روحانی صحت حاصل ہو گئی تو آدمی چاق و چوبند ہو گا۔

تو یہ میں نے اس لئے عرض کیا کہ ہماری اور آپ کی نجات دنیا میں بھی آخرت میں بھی شریعت کے اتباع پر موقوف ہے۔ ہم اور آپ سب مریضان نفوس ہیں۔ کوئی شہوتوں میں گرفتار ہے، کوئی شبہات میں گرفتار ہے، کسی میں عقائد کی خرابی ہے، کسی میں کبر کی خرابی، کسی میں عمل کی خرابی ہے، ان ساری چیزوں کو رفع کرنے والی چیز قرآن و حدیث اور شریعت ہی تو ہے، جب آپ سب کو استعمال کریں گے تو نہ عقائد کا فتنہ باقی رہے گا، نہ عمل کا فتنہ باقی رہے گا، کوئی روگ باقی نہیں رہے گا۔ سلامتی پر آ جائیں گے۔

علم و عمل کی بنیادیں..... جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "تَرَکْتُ فِیْکُمُ الثَّقَلَیْنِ. لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدِیْ اَبَدًا اِنْ تَمَسَّکْتُمْ بِھِمَا. کِتَابُ اللّٰہِ وَسُنَّتِیْ" ① میں دو وزنی چیزیں تم میں چھوڑ کر جاؤں گا۔ اگر ان دونوں کو مضبوط پکڑے رہو تو کبھی گمراہ نہیں ہو گے۔ کسی فتنے میں مبتلا نہیں ہو گے۔ اور وہ دو وزنی چیزیں کیا ہیں؟ اللہ کی کتاب اور میری سنت۔ یعنی میرا اسوۂ حسنہ۔

علم حاصل کرو قرآن سے اور عمل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ برکات سے حاصل کرو۔ علم و عمل جب درست ہو گا تو علمی فتنے بھی ختم ہو جائیں گے۔ جو عقائد کو برباد کرتے ہیں اور عملی فتنے بھی ختم ہو جائیں گے جو اتباعِ سنت کو برباد کرتے ہیں اور منکرات و بدعات میں لوگوں کو مبتلا کرتے ہیں۔ تو منکرات و بدعات ختم نہیں ہو سکتیں جب تک سنت طریقہ سامنے نہ رکھا جائے، عملی فتنے اور شہادت ختم نہیں ہو سکتے۔ جب تک قرآن کو سامنے نہ رکھا جائے۔ انہی دو کے مجموعے کا نام شریعت ہے، شریعت کی یہی دو بنیادیں ہیں، کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ، تو ایک سے علم حاصل کرو، ایک سے عمل حاصل کرو، ایک سے فکر صحیح کرو، ایک سے اخلاق درست کرو، اخلاق و کمالات کا مجموعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات ہے۔

اعمالِ صالحہ کا مجموعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس ہے، علوم کاملہ کا مجموعہ قرآن کی ذات ہے۔ ان دونوں ذاتوں کو اگر آپ ہاتھوں میں تھام لو تو کبھی فتنے میں گرفتار نہیں ہو گے، جب مسلمان تباہ ہوئے ہیں، انہیں دو چیزوں کے ترک کرنے سے تباہ ہوئے ہیں، جب ان دو کو اختیار کر لیا۔ جب ہی نجات پا گئے اور عروج پا گئے۔

بہرحال یہ چند کلمات میں نے عرض کئے، میں تو بہت تھوڑی دیر چاہتا تھا، کچھ دماغ میں قوت نہیں تھی، اور صلاحیت بھی نہیں رہی تھی ضعف بھی بہت تھا۔ مگر خیر بات بڑھ گئی۔

صدقِ طلب..... تو مقصد اصلی یہ تھا کہ اتباعِ شریعت کو اصل سمجھا جائے۔ اتباعِ سنت کو اصل سمجھا جائے۔ اس کے لئے جن معلومات کی ضرورت ہے۔ وہ معلومات حاصل کی جائیں۔ اگر آپ خود عالم ہیں تو اپنے علم کی روشنی

---

① موطا امام مالک، کتاب الجامع، باب النهي عن القول بالقدر ج: ۵ ص: ۳۷۱.

میں آپ سنت کی پیروی کریں۔ اگر آپ عالم نہیں ہیں تو قرآن کریم نے طریقہ بتلایا کہ: ﴿فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ ① تم اگر نہیں جانتے تو جاننے والوں سے پوچھو۔ اوران سے سوالات کر کے، استفتاء کر کے فتویٰ لو۔

پھر اس کے اوپر چلو۔ تو یا اپنے علم پر چلو یا دوسرے کے علم پر اعتماد کر کے اس سے پوچھ پوچھ کر چلو۔ اگر دل کے اندر تڑپ ہوگی تو یا خود علم حاصل کر کے یا علم والوں سے پوچھ کر چلنے پر مجبور ہوں گے اور اگر دل میں طلب نہیں ہوگی تو پھر کچھ بھی نہیں۔ اس واسطے میں کہتا ہوں کہ پانی کی تلاش زیادہ مت کرو۔ اپنے اندر پیاس پیدا کرو۔ پیاس پیدا ہوگئی تو پانی خود آپ کے پاس آجائے گا۔ پیاس ہی نہیں، طلب ہی نہیں۔ جیسا کہ ہمارے ڈاکٹر اقبال مرحوم جو ”شکوہ جواب شکوہ“ ان کی مشہور نظم ہے، اس میں ایک موقع پر کہتے ہیں۔

راہ دکھلائیں کسے، رہرو منزل ہی نہیں

ہم تو راہ دکھلانے کے لئے موجود ہیں۔ مگر کوئی چلنے والا بھی تو ہو؟

راہ دکھلائیں کسے، رہرو منزل ہی نہیں   جس سے تعمیر ہو آدم کی، وہ گل ہی نہیں

وہ مٹی ہی باقی نہیں رہی جس سے آدمی کی تعمیر ہوتی تھی، خدا جانے لوگوں میں مٹی کہاں کہاں سے آگئی ہے کہ اتباعِ شریعت، اتباعِ سنت اور اتباعِ دین کا کوئی رجحان نہیں آرہا۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ مٹی ہی خراب ہوگئی ہے کہ

جس سے تعمیر ہو آدم کی، وہ گل ہی نہیں

تو خوب کہا ہے کہ۔

ہم تو مائل بہ کرم ہیں، کوئی سائل ہی نہیں   راہ دکھلائیں کسے، رہرو منزل ہی نہیں

حدیث میں ہے کہ روزانہ حق تعالیٰ کی تجلیات آسمانِ دنیا پر اترتی ہیں اور ہاتھ پھیلاتے ہیں، جیسا ہاتھ ان کی جنابِ اقدس کے لائق ہے اور فرماتے ہیں: ”اَنَا الرَّازِقُ اَمَنْ ذَالَّذِیْ یَسْتَرْزِقُنِیْ اَنَا الْغَافِرُ مَنْ ذَالَّذِیْ یَسْتَغْفِرُنِیْ“ ② ”میں رزق دینے والا ہوں، کوئی ہے رزق مانگنے والا؟ میں مغفرت کرنے والا ہوں، کوئی ہے مغفرت کا طلب کرنے والا؟“

اخیر شب میں تہائی رات میں طلوعِ فجر تک آوازیں لگتی رہتی ہیں۔ جن کو اللہ توفیق دیتے ہیں وہ مانگتے ہیں، دعائیں کرتے ہیں۔ ورنہ ہم جیسے پڑے ہوئے سوئے رہتے ہیں۔ تو یہی کہا جائے گا کہ۔

ہم تو مائل بہ کرم ہیں، کوئی سائل ہی نہیں   راہ دکھلائیں کسے رہرو منزل ہی نہیں

اس لئے میں عرض کرتا ہوں کہ اتباعِ شریعت اور اتباعِ سنت آسان ہو جائے گا اپنے اندر پیاس پیدا کرلو۔ جذبہ پیدا ہو جائے کہ ہم متبع بن کر رہیں، مبتدع اور مخترع بن کر نہ رہیں کہ ایجاد کر کے رواج کو دین بنا دیں۔ جو رواج

---

① پارہ: ۱۷، سورۃ الانبیاء، الآیۃ: ۷۔ ② مسند احمد، مسند ابی ھریرۃ ج: ۱۵ ص: ۲۳۷۔

پڑ گیا وہی دین جو رسم پڑ گئی وہی دین بلکہ ہر معاملہ میں دیکھوں کہ اللہ کے رسول نے کیا فرمایا۔ اس کے اوپر صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کا کیا عمل تھا۔ جو صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے تعامل سے ثابت ہو، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے ثابت ہو، اس پر چلو، جو بے خل و غش راستہ ہے، شادی ہو، بیاہ ہو، غمی ہو، خوشی ہو، ہر ایک میں دیکھو کہ میرے پیغمبر نے اس کے اندر کیا نمونہ دکھلایا ہے، اس کے مطابق کرو۔ اس میں کوئی گھاٹا نہیں، کوئی خسارہ نہیں۔ آسان راستہ ہے، حقیقت میں دنیا طلبی مشکل ہے۔ دنیا میں جھگڑوں میں پڑ کر ہزاروں طوق و سلاسل آپ نے اپنے گلے میں ڈال لئے ہیں اور اپنے کو گویا زنجیروں میں باندھ لیا۔ شریعت ان زنجیروں کو کھولنے کے لئے آئی ہے کہ آزادی اور سہولت کے ساتھ عمل کر کے دنیا بھی کما لو اور اللہ تک بھی پہنچ جاؤ۔ اس لئے میں نے یہ چند جملے عرض کئے کہ

آب کم جو تشنگی آور بدست

پانی کی تلاش زیادہ نہ کرو۔ پیاس پیدا کرو۔ پانی خود بخود مہیا ہو جائے گا۔ اتباع حق، شریعت پر عمل کرنے اور آخرت کی نجات کی پیاس ہونی چاہئے، اپنی موت کو یاد کرو۔ اس عالم کے ختم ہونے کو یاد کرو، تو جب ایک دن ختم ہونا ہے تو ایک دن جواب دہی کا بھی آتا ہے۔ اس کے لئے کچھ نہ کچھ تو تیاری کی ضرورت ہے۔

حکیمانہ بات...... حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیسی حکیمانہ بات فرمائی اور انبیاء علیہم السلام سے زیادہ حکیمانہ بات کہہ کون سکتا ہے۔ فرمایا: "اِعْمَلْ لِلدُّنْیَا بِمِقْدَرِ بَقَآئِکَ فِیْھَا وَاعْمَلْ لِلْاٰخِرَۃِ بِمِقْدَارِ بَقَآئِکَ فِیْھَــا" "دنیا کے لئے اتنا کام کرو جتنا دنیا میں رہنا ہے اور آخرت کے لئے اتنا کام کرو جتنا آخرت میں رہنا ہے"۔

یہاں چند دن رہنا ہے تو تھوڑا کام بھی کافی ہے، وہاں ابدالآباد تک رہنا ہے تو بہت سے کام کی ضرورت ہے۔

احترام جلسہ...... بہر حال یہ چند جملے میں عرض کئے۔ ہمت اور طاقت تو تھی نہیں، مگر جلسے کے احترام نے مجبور کیا۔ اب جب لوگ جمع ہوں، لاؤڈ اسپیکر رکھ دیا جائے اور ایک شخص کو لا کر بٹھلا دو اور تو تقاضا یہ بھی کہہ دیں کہ ہم بالکل تقریر کرنے کی درخواست نہیں کرتے، چاہے۔ آپ تقریر کریں چاہے نہ کریں۔

یہ بڑے عمدہ پیرائے میں تقریر کے لئے مجبور کرنا ہے، جب ہیئت جلسہ کی بن گئی، لاؤڈ اسپیکر رکھ دیا گیا تو آدمی جھک مارے گا اور تقریر کرے گا۔

آپ تو بری ہو گئے کہ دیکھئے ہم نے تو فرمائش نہیں کی تھی، نہ مجبور کیا تھا۔ آپ دعا کر کے اٹھ جاتے، ہم اس پر بھی راضی تھے۔ مگر ہیئت ایسی بنا دیں کہ میں کچھ عرض کرنے پر مجبور تھا۔ ارادہ تھوڑا تھا، مگر بہر حال ہو گیا کچھ زیادہ۔ بہر حال نفع ہی کی چیزیں بیان ہوئی۔ مسائل ہی علم میں آئے۔ اب دعاء کر لیجئے کہ حق تعالیٰ شانہ، توفیق عطا فرمائیں۔ اپنی مرضیات پر چلائیں۔ اپنے رسول پاک کی سنتوں پر چلنے کی توفیق عطاء فرمائیں۔ ہمارے دلوں میں دین کی محبت عطا فرمائے۔ ہمارے دلوں کے اندر موت کی یاد اور قیامت کی حاضری کا جذبہ رہے اور حق تعالیٰ کے سامنے جواب دہی کا جذبہ تازہ رہے۔

اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْلَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَکُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ. اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْکَ رَحْمَةً وَّھَیِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا، اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ وَاَدْخِلْنَا الْجَنَّةَ مَعَ الْاَبْرَارِ یَا عَزِیْزُ یَا غَفَّارُ. بِرَحْمَتِکَ یَآ اَرْحَمَ الرّٰحِمِیْنَ۔

۲۱ ذی الحجہ ۱۴۰۸ھ جمعۃ المبارک

آدابِ دعاء

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ۔ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَافَّةٍ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا۔

اَمَّا بَعْدُ!..... فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ، ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾ ① صَدَقَ اللّٰهُ الْعَظِيْمُ

سیّدالایام...... بزرگانِ محترم! اتنا وقت نہیں ہے کہ کوئی مستقل مضمون شروع کیا جائے۔ جمعہ سے قبل جو تھوڑا سا وقت ہے۔ اس میں چند مختصر باتیں منتشر طریق پر گزارش کرتی ہیں۔ جس وجہ سے ہم جمع ہیں وہ جمعہ ہے۔ تو جمعہ نے موضوع متعین کر دیا۔ جمعہ ہی کے متعلق چند باتیں عرض کر دی جائیں گی۔

جمعہ کے بارے میں حدیث میں ارشاد ہے کہ یہ سیّد الایام ہے۔ یعنی تمام دنوں کا سردار اور تمام دنوں کا بادشاہ یہ دن گنا گیا ہے۔ اور اس کو "عید المومنین" بھی فرمایا گیا ہے۔

شانِ جامعیت...... "جمعہ" لغتِ عرب میں اس کا مادہ جَمْعٌ ہے۔ یعنی جمعہ کے اندر جمع کرنے اور جامعیت کی شان موجود ہے۔ کہ یہ منتشر اجزاء کو جمع کر دیتا ہے۔ اسی لئے اس کا نام جمعہ رکھا گیا۔ جب سے اللہ نے اس دن کو پیدا کیا۔ اس دن سے اس کا کام برابر یہی ہے کہ یہ منتشر اجزاء کو جمع کرتا رہتا ہے۔ جتنے بڑے بڑے کام اور عظام امورِ دنیا میں پیش آئے ہیں، جمعہ ہی کے دن پیش آئے اور سب میں جمعیت کی شان موجود ہے۔

اجزائے انسان کی جمعیت...... سب سے پہلے اسی دن میں انسان کے منتشر اجزاء کو جمع کیا گیا، جن سے انسان تیار کیا گیا۔ حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش کے لئے حضرت جبریل علیہ السلام کو جمعہ ہی کے دن حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ:

زمین کی مٹی میں سے ہر ہر موقع سے اجزاء جمع کر کے ایک مٹھی بھر کر لے آؤ تاکہ میں ایک نئی مخلوق تیار

---

① پارہ: ۲۸، سورۃ الجمعۃ، الآیۃ: ۹۔

کروں۔ اس کا واقعہ طویل ہے وہ سنانا مقصود نہیں ہے۔ جبریل علیہ السلام پہنچے اور زمین نے معذرت کی کہ میں اپنے اجزاء نہیں دینا چاہتی کہ میرے ذریعے ایسی مخلوق تیار ہو جو جہنم میں جلائی جائے۔ تو خواہ مخواہ بیٹھے بٹھائے مصیبت میں کیوں گرفتار ہوں۔ اس لئے آپ مجھے معاف کریں۔ انہیں رحم آیا اور چھوڑ کر چلے آئے۔ حضرت اسرافیل علیہ السلام بھیجے گئے، ان کے سامنے بھی زمین نے معذرت کی اور فریاد کی۔ انہیں بھی رحم آیا، وہ بھی چھوڑ کر چلے آئے، حضرت میکائیل علیہ السلام بھیجے گئے، انہیں بھی رحم آگیا، وہ بھی چھوڑ کر چلے آئے عزرائیل علیہ السلام ملک الموت بھیجے گئے۔ ان کے سامنے بھی زمین نے فریاد کی۔ انہوں نے کہا تیری فریاد کے سننے کی بہ نسبت مالک کا حکم ماننا زیادہ اونچی چیز ہے۔ اللہ کا مجھے یہ حکم ہے کہ میں مٹی جمع کروں، مجھے ہر صورت میں جمع کرنی ہے۔ چاہے کوئی جنت میں جائے، چاہے کوئی جہنم میں جائے۔ مجھے اس سے بحث نہیں، مجھے تعمیل حکم کرنی ہے۔ انہوں نے تمام اجزاء جمع کئے اور لاکر پیش کئے۔ حضرت آدم علیہ السلام بنادیئے گئے اور ان کا پتلا تیار کر دیا گیا اور ملک الموت کو فرمایا گیا کہ موت پر ہم نے تم ہی کو مقرر کیا۔ اس لئے کہ موت میں ایک منٹ کی تاخیر اس سے نہیں ہو سکتی جس کا جو وقت مقرر ہے، اگر آپ بھی اس طرح فریاد سنتے تو مرنے کے وقت ہر شخص فریاد کیا کرتا کہ خدا کے لئے چند منٹ کی مہلت اور دے دو۔ تو نظام عالم درہم برہم ہو جاتا، تو ایسا ہی فرد موت کے لئے مناسب ہے۔ لہٰذا تم ہی موت کے اوپر مقرر کئے گئے۔ بہرحال حضرت آدم علیہ السلام کے اجزاء جمعہ کے دن جمع کئے گئے اور پتلا تیار کر دیا گیا تو جامعیت کی شان ابتداء سے چلی کہ منتشر اجزاء اس میں جمع ہوئے۔

جمع شرائع...... پھر جب حضرت آدم علیہ السلام جنت سے اتارے گئے ہیں وہ بھی جمعہ ہی کے دن اتارے گئے ہیں اور یہ وقت انسانی اعمال کے جمع کرنے کا پیش خیمہ تھا۔ جن عملوں سے سعادت میسر آتی ہے، جن اعمال شرعیہ سے انسان کو ترقی دی جاتی ہے وہ دنیا ہی میں پنپ کر ممکن تھے۔ تو شریعتوں کی آمد جبھی ممکن تھی کہ انسان دنیا میں آتا، جنت میں نہ شریعت کی ضرورت تھی نہ احکام وقوانین کی ضرورت تھی، دنیا ہی میں احکام شرعیہ کی ضرورت تھی اور احکام ایک دو نہیں ہزاروں تھے۔ دین اور شریعتیں مختلف رنگوں میں آئیں، تمام انبیاء علیہم السلام مختلف شریعتیں لے کر تشریف لائے۔ ایک لاکھ چوبیس ہزار کے قریب دنیا میں پیغمبر تشریف لائے۔ دین بے شک ایک ہی رہا، اصول ایک ہی رہے۔ مگر شریعتیں مختلف ہوئیں۔ ان تمام شریعتوں کا اجتماع دنیا میں ہوا اور اس کا سبب حضرت آدم علیہ السلام کا نزول ہے۔ تو منتشر شرائع کو جمع کرنے والا دن بھی درحقیقت جمعہ ہی کا دن ہے۔ تو پہلے اس نے اجزائے آدم کو جمع کیا، پھر اجزاء احکام کو اس نے جمع کیا اور اسی دن میں حضرت آدم علیہ السلام کی حضرت حوا علیہا السلام سے ملاقات ہوئی ہے۔ تو دونوں جمع ہوئے، تو وہ بھی اسی دن میں جمع ہوئے۔

اجتماع قیامت...... قیامت قائم ہوگی وہ بھی جمعہ ہی کے دن قائم ہوگی۔ اس دن اولین وآخرین کو ایک میدان میں جمع کیا جائے گا۔ یہی زمین جس میں اونچ نیچ ہے، پہاڑ ہیں، دریا ہیں تو قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا کہ اس

دن زمین ایسی بنادی جائے گی جس میں نہ اونچ ہوگی نہ نیچ ہوگی پہاڑ ہوں گے نہ دریا ہوں گے۔ "کَاَنَّھَا طَبَقُ فِضَّۃٍ" جیسے چاندی کی ایک پلیٹ ہوتی ہے۔ بالکل ہموار زمین۔ تمام بنی آدم قبروں سے نکال کر اس پر جمع کئے جائیں گے۔ حضرت آدم علیہ السلام کی ساری اولاد اوّلین وآخرین جمع ہوگی۔

"یَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ لَّہُ النَّاسُ" جس دن سارے انسان جمع کر دیئے جائیں گے۔ تو وہ بھی جمعہ کا دن ہوگا۔ جس دن قیامت قائم کی جائے گی۔ غرض حضرت آدم علیہ السلام کی مٹی جمعہ کے دن جمع ہوئی۔ احکامِ شرعیہ کے جمع ہونے کا سبب جمعہ کا دن بنا۔ پھر تمام انسانوں کو ایک جگہ ایک میدان میں اسی دن نے جمع کیا تو اس جمعہ کے اندر جامعیت کی شان موجود ہے کہ بکھرے ہوئے کو جمع کر دے۔

اسی واسطے اس کو "عید المومنین" کہا گیا ہے جس میں ایک محلہ یا ایک شہر کے منتشر افراد جمع ہو کر ایک جگہ آجاتے ہیں۔ ان کو جمعہ کا دن جمع کر دیتا ہے۔ اس لئے اس میں جمع کرنے کی یا جامعیت کی شان پائی جاتی ہے۔

تعیینِ جمعہ میں اقوام کا امتحان ...... یہی وہ دن ہے جس کے ذریعہ سے دنیا کی بڑی قوموں کا امتحان لیا گیا ہے اور اس میں صرف مسلمان کامیاب ہوئے۔ اور وہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ کی نگاہ میں یہ دن متعین تھا کہ اس میں اس کی عبادت کی جائے۔ تمام کام چھوڑ کر دن کا زیادہ حصہ عبادتِ خداوندی میں لگایا جائے۔ لیکن ابھی حق تعالیٰ نے ظاہر نہیں فرمایا تھا۔

یہود کی امت جب دنیا میں آئی تو فرمایا کہ عبادت کے لئے ایک دن منتخب کرو! اگر تمہارا انتخاب اس دن تک پہنچ گیا جو ہمارے علم میں ہے تو تم کامیاب قوم سمجھے جاؤ گے۔ ورنہ نہیں۔ یہود نے اٹکل لڑائی تو یوم السبت یعنی شنبہ (ہفتہ) کا دن عبادت کے لئے منتخب کیا۔

اور اس کی بناء یہ قرار دی کہ یہ یوم الراحت ہے۔ یعنی اتوار کے دن سے عالم کی پیدائش شروع کی گئی اور جمعہ پر ختم کی گئی۔ تو شنبہ کا دن فارغ رہا۔ یہ یوم الفراغ ہے۔ لہٰذا یہ خوشی کا دن ہونا چاہئے۔ اس دن یہود نے عید منائی اور عبادت کے لئے اس دن کو منتخب کیا۔ لیکن وہ اس نکتے تک نہیں پہنچے جو حق تعالیٰ کے علم میں مرکوز اور مقدر تھا۔

نصاریٰ کی امت آئی تو ان سے کہا گیا کہ ایک دن عبادت کے لئے منتخب کرو۔ اگر ہمارے علم کے مطابق تمہارا انتخاب ہو گیا تو تم امتحان میں کامیاب سمجھے جاؤ گے۔ انہوں نے اتوار کا دن منتخب کیا اور اسے یوم العید قرار دیا۔

اور بناء یہ قرار دی کہ "یَوْمُ الْاِفْتِتَاح" ہے۔ یعنی دنیا کی پیدائش کا آغاز اتوار کے دن سے کیا گیا ہے اور یومِ افتتاح خوشی کا دن ہوتا ہے۔ لہٰذا انہوں نے اتوار کا دن متعین کر دیا اور اس کو عبادت کے لئے رکھا۔

مسلمان دنیا میں آئے تو حق تعالیٰ نے یہی سوال ان کے سامنے ڈالا کہ ہفتے میں ایک دن عبادت کے واسطے منتخب کرو! جس میں زیادہ حصہ تم عبادت میں صرف کرو گے۔

مسلمانوں نے اپنی تخمین وانتخاب سے جمعہ کا دن متعین کیا کہ اس دن ہم عبادت کریں گے۔

اور اس کی بناء یہ قرار دی کہ یہ یوم تکمیل ہے۔ یعنی اتوار کے دن عالم کی تخلیق شروع ہوئی ہے اور جمعہ کے دن ختم ہوئی اور جمعہ کی آخری ساعت میں حضرت آدم علیہ السلام پیدا کئے گئے۔

جمعہ میں قبولیت دعا کی گھڑی...... اسی واسطے جمعہ کی آخری ساعت اللہ کے ہاں مقبول ہے کہ اس میں جو شخص بھی جس مراد کی دعا مانگنے کے لئے بیٹھے گا، وہ دعا قبول کی جائے گی اور وہ ساعت آخری ساعت ہے۔ یعنی غروب سے پہلے پہلے کا جو گھنٹہ ہوتا ہے جس میں غروب واقع ہوتا ہے۔ وہی آخری ساعت ہے۔ اس ساعت کو مقبول قرار دیا گیا کہ اس میں جو بھی دعا مانگی جائے گی، حق تعالیٰ قبول فرمائیں گے۔

یہ خیال نہ کیا جائے کہ بعض دفعہ ہم دعا مانگتے ہیں اور قبولیت کا اثر ظاہر نہیں ہوتا۔ حالاں کہ نص حدیث ہے کہ ہم قبول کریں گے۔ ہم نے تو بارہا ایسا دیکھا کہ ایک دعا مانگی۔ لیکن وہ قبول نہیں ہوئی۔ مہینہ بھر انتظار کیا، دو مہینے انتظار کیا مگر قبولیت کے کچھ آثار ظاہر نہیں ہوئے۔

قلبی دعا قابل قبول ہے...... اوّل اس پر غور کرنا چاہئے کہ دعا کی کچھ شرائط ہیں اور کچھ آداب ہیں۔ ان شرائط اور آداب کو پورا کر کے آدمی دعا مانگے تو ممکن نہیں کہ قبول نہ ہو۔ ان شرائط و آداب کو اگر چھوڑ دیا جائے اور پھر قبول نہ ہو تو اس میں ساعت مقبول کا کوئی قصور نہیں۔ وہ قصور ہمارا ہوگا۔ مثلاً حدیث میں فرمایا گیا کہ: ’’إِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَجِيْبُ دُعَاءً مِنْ قَلْبٍ غَافِلٍ لَاهٍ‘‘ ① لہو ولعب میں پڑے دل کی دعا ہرگز قبول نہیں کی جاتی۔ اللہ سے دعا مانگ رہا ہے اور خیالات دوسری طرف ملتفت ہیں۔ کہیں بیوی میں، کہیں بچوں میں، کہیں تجارت میں اور کہیں مکان میں۔ تو خیالات بٹے ہوئے ہیں، قلب میں وساوس آ رہے ہیں اور ہاتھ دعاء کے لئے اٹھائے ہوئے ہیں۔ تو یہ دعا قبول نہیں کی جاتی، دعا وہ قبول کی جاتی ہے جس کے بارے میں فرمایا گیا ﴿أَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ إِذَا دَعَاهُ﴾ ② مضطر اور بے قرار ہو کر جب آدمی مانگتا ہے۔ کبھی ممکن نہیں ہے کہ وہ دعا رائیگاں ہو اور قبول نہ کی جائے۔ لیکن جب دل کے اندر اضطرار نہیں، رسمی طور پر مانگ رہا ہے، دل کے اندر بے چینی نہیں ہے۔ خیالات منتشر اور بٹے ہوئے ہیں۔ فرماتے ہیں وہ دعا ہم قبول نہیں کرتے، وہ الفاظ کی دعا ہے اور ہم دل کی گہرائی کی دعا قبول کرتے ہیں۔ دل کی گہرائی سے آدمی مانگے تو ممکن نہیں ہے کہ قبول نہ ہو۔ تو پہلی چیز تو یہ ہے۔

مال حرام قبولیتِ دعا میں مانع ہے...... حدیث میں ہے کہ بعض صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! بعض لوگ دعائیں مانگتے ہیں مگر قبول نہیں ہوتیں۔ فرمایا: ’’مَطْعَمُهُ حَرَامٌ وَمَلْبَسُهُ حَرَامٌ يَقُوْلُ يَا رَبِّ يَا رَبِّ فَأَنّٰى يُسْتَجَابُ لَهُ‘‘ ③

کھانا دیکھو حرام، پیا حرام کا، لباس حرام کا اور کہہ رہا ہے یا رب یا رب دعا کہاں سے قبول ہو جائے گی، یعنی

---

① السنن للترمذي، ابواب الدعوات، باب ماجاء في جامع الدعوات، ج: ۱۲، ص: ۳۷۳، رقم ۳۳۱.

② پارہ: ۲۰، سورۃ النمل، الآیۃ: ۶۲۔ ③ الصحیح لمسلم، کتاب الزکوۃ، باب قبول الصدقۃ ج: ۵، ص: ۱۹۲.

دعا کی قبولیت کے لئے لازمی ہے کہ پاکیزہ بن کر جائے۔ کسی بادشاہ کے دربار میں جاتے ہیں۔ تو قاعدہ ہے کہ کپڑے بدلتے ہیں، بدن کو صاف ستھرا کرتے ہیں، غسل کرتے ہیں، عطر لگاتے ہیں، معطر اور معنبر ہو کر جاتے ہیں۔ دربار کے آداب کا یہی تقاضا ہے۔ اگر کوئی شخص میلے کچیلے کپڑے پہن کر چلا جائے اور اوپر سے عطر کے بجائے گندگی بھی لگا لے تو کیا اس کو دربار میں بیٹھنے بھی دیا جائے گا۔ اسے کان پکڑ کر نکال دیں گے کہ اس نے دربار کے آداب کے خلاف کیا۔ بات سننا تو بعد کی چیز ہے۔ اسے بیٹھنے بھی نہیں دیا جائے گا کہ یہ بے ادب ہے۔ آدابِ دربار کی اسے کوئی رعایت نہیں۔ تو حرام کا کپڑا پہننا یا حرام کی غذا کھا کے جانا ایسا ہی ہے جیسا کپڑے اور بدن کے اوپر نجاست لگا کر جانا۔ بلکہ یہ تو ظاہری نجاست ہے جو پانی سے دھل جاتی ہے، گناہ کی نجاست معنوی نجاست ہے جسے پانی بھی نہیں دھو سکتا۔ وہ زیادہ گندی چیز ہے۔ حق تعالیٰ کے دربار میں آدمی جائے اور گندہ بن کر جائے۔ تو بیٹھنے بھی نہیں دیا جائے گا چہ جائیکہ اس کی دعاء قبول کی جائے۔ اسی کی طرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ فرمایا کہ: "مَطْعَمُهٗ حَرَامٌ وَمَلْبَسُهٗ حَرَامٌ يَقُوْلُ يَا رَبِّ يَارَبِّ فَاَنّٰى يُسْتَجَابُ لَهٗ" لباس حرام کا، کھانا پینا حرام کا۔ اور یا رب یا رب کہتا ہے۔ کہاں سے دعا قبول کی جائے گی؟ وہ تو گندگی لگا کر گیا ہے۔

جیسا کہ یہ ادب تھا کہ دل میں لہو و لعب نہ ہو۔ خیالات بٹے ہوئے نہ ہوں۔ ویسے ہی یہ بھی دعا کے آداب میں سے ہے کہ آدمی پاک بن کر جائے۔ نیت کو صاف کر کے جائے۔ لباس حلال کمائی کا پہن کر جائے۔ ان شاء اللہ قبولیت ہوگی۔

دعا بالقیود...... پھر دعا مانگنے میں بعض لوگ قیدیں لگاتے ہیں۔ یا اللہ مجھے مکان دیجیو، جو اس رنگ کا ہو، ایسے ڈیزائن اور ایسے نقشے کا ہو۔ یہ بے ادبی اور گستاخی ہے۔ حدیث میں ہے کہ ایک دیہاتی نے دعا مانگی "اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْئَلُكَ الْقَصْرَ الْاَبْيَضَ فِي الْجَنَّةِ" ① یا اللہ میاں! مجھ جنت میں محل دیجیو مگر سفید رنگ کا ہو، اتنا بڑا ہو، ایسی منزلیں ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: یہ دعا مانگنے کا کیا طریقہ ہے، تم تو مطلق دعا مانگو۔ اگر جنت میں داخلہ بھی ہو گیا تو یہ عظیم ترین نعمت ہے۔ یہی سب سے بڑا انعام ہے۔ تم نے جو قیدیں لگائیں کہ محل ایسا ہو۔ پیمائش اتنی ہو۔ رنگ ایسا ہو۔

یہ تو معاذ اللہ! اللہ کی ذات کے اوپر واجب کرنا ہے۔ کہ دیکھئے یہ یہ چیزیں دینی پڑیں گی۔ یہ بے ادبی اور گستاخی ہے۔ آدمی مطلق سوال کرے اور مانگے۔ اگر کوئی سائل آپ کے دروازے پر آ کر یوں کہے مجھے آپ پلاؤ پکا کر دیں۔ چینی کی رکابی ہو اور اس کا رنگ سبز ہو اور پھول سنہرے بنے ہوئے ہوں۔ تب تو میں قبول کروں گا۔ تو مالک کہے گا چلا جا نا معقول میرے گھر سے، میں کہاں سے لاؤں۔ میرے بچوں کے پاس بھی نہیں ہے کہ میں ایسی رکابی استعمال کروں، تیرے لئے کہاں سے لاؤں؟ اور یہ مانگنے کا کون سا ڈھنگ ہے؟۔ تو وہ اس کو نکال دے گا۔

---

① السنن لابی داؤد، کتاب الطهارة، باب الاسراف فی الماء، ج: ۱، ص: ۱۳۳، رقم: ۷۷۔

تو اس سے زیادہ گستاخی یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی جناب میں مانگے اور قیدیں اور شرائط لگائے۔ جو واقعی مراد ہے، جس کی وجہ سے وہ پریشان ہے، معذور اور مجبور ہے، اسے مانگ لے۔ اس میں قیدیں اور شرائط لگانا یہ ادب کے خلاف ہے، ممکن ہے کہ دعا ردّ ہو جائے۔

وسعتِ رحمت کے منافی قید سے بھی دعا ردّ ہو جاتی ہے...... یا یہ کہ آدمی (دعا میں) کوئی ایسی قید لگائے جو اللہ کی وسیع رحمت کے خلاف اور منافی ہو۔ جیسے حدیث میں آتا ہے کہ ایک شخص نے دعا مانگی "اَللّٰهُمَّ ارْحَمْنِيْ وَلَا تَرْحَمْ عَلٰى اَحَدٍ" "یا اللہ! مجھ پر رحم کر، اور کسی کے اوپر رحم نہ کیجیو"۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "لَقَدْ تَحَجَّرْتَ وَاسِعًا" ① بندۂ خدا! تو نے ایک لامحدود، وسیع چیز کو کم کر کے رکھ دیا۔ اللہ کی رحمت تو وہ ہے کہ سارے جہانوں پر بٹے، جب بھی شمہ برابر کمی نہیں آ سکتی اور تو کہتا ہے کہ مجھ پر تو رحم ہو اور کسی پر رحم نہ ہو۔ تو یہ اس سے بھی زیادہ گستاخی اور بے ادبی کی بات ہے۔ تو لہو و لعب میں پڑے ہوئے دل سے دعا مانگنا وہ بھی قبول نہیں ہوتی۔ دعا مانگنا، اور اس میں اپنی طرف سے قیدیں اور شرطیں لگانا، وہ بھی مقبول نہیں ہوتی۔ دعا مانگنا اور رحمت کے دائرے کو تنگ کر کے مانگنا، یہ بھی قبول نہیں ہوتی۔ تو دعا کے کچھ آداب اور ڈھنگ ہیں۔ آدمی اس طریق پر مانگے تو ملتا ہے۔ سائل قیدیں نہیں لگایا کرتا، وہ تو مراد پیش کرتا ہے۔ وہ تو کہتا ہے کہ مجھے عطاء کر دیجئے، آپ کے دربار سے مجھے کچھ نہ کچھ مل جائے۔

مانگنے کا ڈھنگ...... تو ہم دعا کے آداب پورے نہیں کرتے اور جب قبولیت کے اثرات ظاہر نہیں ہوتے تو حدیث پر سوال کرتے ہیں کہ گھڑی تو مقبولیت کی تھی، مگر ہمارے حق میں تو کچھ بھی قبول نہ ہوا۔ سوال یہ ہے کہ گھڑی تو مقبولیت کی تھی مگر تم نے مقبولیت کا ڈھنگ بھی اختیار کیا؟ تم نے قبولیت کے آداب بھی اختیار کئے یا نہیں؟۔ تو انسان کی نظر اپنی کوتاہی پر نہیں ہے۔ وہ اللہ کے احکام اور قوانین پر الزام ڈال دیتا ہے۔ یہ غلط طریقہ ہے۔ اگر قبولیت کے آثار ظاہر نہ ہوں تو اپنے اندر غور کرے کہ آیا میں نے کوئی کوتاہی تو نہیں کی؟ کوئی غلطی تو نہیں کی؟

فوری قبولیت...... اچھا! پھر یہ ہے کہ اگر آپ نے سارے آداب پورے کئے، ساری شرائط آپ نے جمع کیں اور دعا مانگی! انشاء اللہ ضرور قبول ہوگی۔ لیکن قبولیت کے طریقے مختلف ہیں۔ بعض دفعہ تو ایسا ہوتا ہے کہ منہ مانگی مراد فوراً ہاتھ کے ہاتھ مل گئی اور آدمی کہا کرتا ہے کہ بھئی! عجیب قبولیت کی گھڑی تھی کہ جو مانگا وہی مل گیا۔ کاش میں اس وقت فلاں چیز مانگ لیتا تو وہ بھی مل جاتی۔ تو بعض دفعہ تو منہ مانگی مراد ہاتھ کے ہاتھ مل جاتی ہے اور انسان دعا مانگ کر کامیاب اٹھتا ہے۔

ازدیادِ قبولیت...... اور بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ وہ شے تو نہیں ملتی۔ مگر اس سے بڑی چیز مل جاتی ہے۔ تو بعد میں خوش ہوتا ہے کہ اچھا ہوا وہ چیز نہ ملی جو مانگی تھی۔ مجھے تو اس سے بھی بڑی چیز مل گئی۔ ایسی چیز ملی کہ اس کے ملنے سے

---

① الصحيح للبخاري، كتاب الهبة، باب قبول الهدية ج: ٧، ص: ٢٦، رقم: ٢٣٤٧.

جو چیز مانگی تھی، اس جیسی ہزاروں چیزیں خود بخود آ جاتی ہیں۔ تو انسان خوش ہوتا ہے کہ بہت اچھا ہوا کہ فلاں مراد کی قبولیت نہ ہوئی، اس سے بڑی چیز مجھے مل گئی۔

تاخیرِ قبولیت...... بعض دفعہ منہ مانگی ہی مراد ملتی ہے۔ مگر ذرا دیر سے ملتی ہے۔ مانگنے والے میں کچھ کھوٹ ہوتا ہے۔ انتظار کیا جاتا ہے کہ وہ کھوٹ رفع ہو اور اس مراد کے لینے کی استعداد پیدا ہو جائے۔ تب اس کو دیتے ہیں، انسان سمجھتا ہے کہ دعا قبول نہیں ہوئی۔ حالانکہ اس کی مصلحت کی وجہ سے قبولیت میں تاخیر کی جاتی ہے۔

مصلحتِ تاخیر...... اس کی مثال ایسی ہے جیسے آپ کا بچہ ہو اور بچے سے زیادہ کون محبوب ہوتا ہے، اولاد سے زیادہ کس سے محبت ہوتی ہے؟ محبوب ترین اولاد ہے اور اللہ نے آپ کو سب کچھ دیا ہے، آپ لکھ پتی ہیں۔ اگر سو روپے روز بھی جیب خرچ دیں تو آپ پر بھاری نہیں۔ آپ کا بیٹا مانگتا ہے کہ مجھے سو روپے دے دیجئے تو کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ فوراً بٹوہ جیب سے نکالا اور سو روپے کا نوٹ اس کے حوالے کیا۔ بیٹا بڑا خوش ہوا کہ باپ محبت والا بھی ہے، کریم النفس بھی، جو میں نے مانگا فوراً دے دیا۔ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ بیٹا مانگ رہا ہے کہ مجھے بیس یا دس روپے ہی روز دے دیجئے اور آپ نہیں دیتے۔ مہینے گزر گئے یہاں تک کہ چھ مہینے گزر گئے اور وہ یہ خیال کر رہا ہے کہ شاید باپ کے دل میں میری محبت باقی نہیں رہی ورنہ لکھ پتی ہے اگر دو سو بھی روز دیتا تو سوائے اس کے کہ کوئی بڑی بات نہیں تھی اور میں تو دس ہی روپے روز کے مانگتا ہوں۔ مگر نہیں دیئے۔ اب وہ کڑ رہا ہے۔ چھ مہینے کے بعد دس روپے روز کے حساب سے آپ نے کئی سینکڑوں کی تھیلی حوالے کی اور کہا کہ لو بیٹا! میں نے اس لئے نہیں دیئے تھے کہ تم مریض تھے۔ معدے کے بھی مریض تھے۔ جگر بھی خراب تھا اور تمہارا علاج ہو رہا تھا۔ اگر میں تمہیں دس روپے روزانہ دیتا تو تم کھانے پینے اور چاٹنے میں اڑا دیتے تو اس سے روپیہ بھی ضائع ہوتا، صحت بھی برباد ہوتی۔ تو میں نے انتظار کیا کہ جب تمہیں پوری تندرستی حاصل ہو جائے، تمہارا معدہ ہر چیز کے ہضم کرنے کے لائق ہو جائے، جب میں تمہیں دوں تا کہ جو بھی کھاؤ، ہضم ہو جائے۔ صحت میں قوت پیدا ہو۔ اب طبیب نے کہہ دیا ہے کہ تم اچھے ہو گئے۔ لہٰذا اب یہ روپیہ موجود ہے۔ اب بیٹا خوش ہوگا اور باپ کو دعائیں دے گا کہ بہت ہی اچھا ہوا کہ وقت پر منہ مانگی مراد پوری نہ کی۔ اگر باپ پوری کر دیتا تو میں بد پرہیزی کرتا اور ہلاکت کے گڑھے میں جا گرتا۔ خوش ہوتا ہے کہ اچھا ہوا بروقت منہ مانگی مراد مجھے نہ ملی۔

تاخیرِ قبولیت پر تشکر...... اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ برس گزر گئے اور بیٹا مانگ رہا ہے اور آپ نہیں دے رہے۔ اس کے دل میں برائی پیدا ہو گئی کہ باپ بے انتہا بخیل ہے اور باپ کے دل میں شفقت باقی نہیں رہی، دوسروں سے شکایتیں کرتا پھرتا ہے۔ مگر باپ کوئی خیال نہیں کرتا اور اس کی رعایت نہیں کرتا۔ بدستور جما ہوا ہے کہ نہیں! کچھ نہیں ملے گا۔

جب دس پندرہ برس گزر گئے۔ تو اس وقت اس نے بیٹے کو جو اس نے مانگا تھا، جمع کر کے ایک بیس ہزار روپیہ دیا اور کہا کہ میں نے اس لئے نہیں دیا تھا کہ اگر سو روپے روز دوں تو محض فضولیات میں اڑا دیتا۔ میں نے

تیرے لئے جمع کیا۔ آج دیتا ہوں تا کہ اس سے جائیداد خریدے اور جائیداد خریدنے کے بعد اتنی آمدنی روزانہ تجھے ہو جائے کہ جتنی تو مانگا کرتا تھا بلکہ اس سے دوگنی ہو جائے۔ تیرے کام آئے گی۔ ورنہ فضول بیس ہزار روپیہ ضائع ہو جاتا۔ اب یہ بیس ہزار تیرے ہی نہیں بلکہ تیری نسل کے بھی کام آئیں گے۔

اس وقت بیٹا دعا دیتا ہے کہ واقعی باپ نے بڑی خیر خواہی کی کہ نہ دیا۔ اور اس صورت سے مجھے دیا کہ نہ صرف میرے ہی بلکہ میری نسل کے بھی کام آئیں گے۔ تو دیکھئے تاخیر یہاں بھی ہوئی۔ لیکن اس تاخیر پر مانگنے والا اخیر میں جا کر شکریہ ادا کرتا ہے۔ جب حقیقت حال کھلتی ہے اور جب حقیقت حال سامنے نہیں تھی، شکایتیں کرتا پھرتا تھا کہ باپ کو محبت نہیں رہی۔ ٹھیک یہی صورت یہاں بھی سمجھئے کہ بندہ حق تعالیٰ سے مانگتا ہے کہ اے اللہ! مجھے ایک جائیداد دے دیجئے۔ مجھے اتنے ہزار یا اتنے لاکھ دے دیجئے۔

کہیں تو ایسا ہوتا ہے کہ ہاتھ کے ہاتھ منہ مانگی مراد مل گئی۔ بندہ بڑا خوش ہوا کہ اللہ نے مانگتے ہی وہ چیز دے دی۔ اگر میں اس سے چوگنا مانگتا وہ بھی مل جاتا۔ وہ تو مقبولیت کی گھڑی تھی۔ اور بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ آپ مانگ رہے ہیں۔ مگر نہیں مل رہا، دو یا تین مہینے یا برس دن گزر گئے۔ برسوں کے بعد اسباب ایسے ہوئے کہ حق تعالیٰ شانہٗ نے وہ مراد پوری کی اور دل میں آپ کے القاء کیا اور آپ کے اوپر واضح کر دیا کہ معصیت اور گناہوں کا مادہ موجود تھا۔ اگر ایسے میں ہم جائیداد دے دیتے تو تم سینما دیکھتے، لہو ولعب میں خرچ کرتے اور زیادہ اللہ کی حجت تمام ہوتی۔ لیکن ایک دم ہم نے پیسے بند کر دیئے، اس کی وجہ سے تمہارے ہاتھ پلے کچھ نہیں رہا۔ تم میں پریشانی بڑھی۔ اس پریشانی کا اثر یہ ہوا کہ اخلاقی حالت درست ہونی شروع ہوئی، وہ جو لہو ولعب میں بالکل آزاد تھے، وہ آزادی ختم ہوئی۔ اب جب حالت درست ہو گئی، حق تعالیٰ نے مراد پوری کر دی تا کہ بے جا مصرف میں رقم صرف نہ ہو۔ گناہ انسان کے نہ بڑھیں۔ بلکہ نیکی اور تقویٰ بڑھے۔ اس وقت بندہ خوش ہوتا ہے کہ اے اللہ! تیرا شکر ہے کہ تو نے مجھے برس دن پہلے یہ جائیداد نہ دے دی۔ میں تو واقعی اڑا دیتا۔ برس دن کے بعد دی جب کہ میرے قلب کی رفتار صحیح ہو گئی، دل کی کلیں درست ہو گئیں۔

دعا کا اُخروی ذخیرہ...... اور بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ بندہ مانگ رہا ہے، مانگ رہا ہے عمر گزر گئی، مرتے دم تک کچھ نہیں دیا گیا۔ اسی افلاس اور پریشانی میں مبتلا ہے اور کہتا ہے کہ معلوم نہیں کون سی مجھ سے ایسی غلطی ہوئی کہ کسی طرح میری دعا قبول نہیں ہوتی۔ عمر بھر مانگتا رہا اور نہ ملا۔ یہاں تک کہ اسی حالت میں موت بھی آ گئی، انتقال کر گیا۔ حدیث میں ہے کہ جب یہ بندہ میدان محشر میں حاضر ہوگا، دیکھے گا کہ اجر وثواب کے بے انتہا ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔ عرض کرے گا یا اللہ! میں نے تو کوئی ایسا عمل نہیں کیا جس کا اجر اتنا بڑا ہوتا، یہ نعمتیں کہاں سے میرے لئے جمع ہوئیں؟

حق تعالیٰ فرمائیں گے، وہ جو تو دعائیں مانگا کرتا تھا، ہم تیری دعاؤں کا ذخیرہ کرتے رہے۔ تیرے پاس عمل کا ذخیرہ نہیں تھا۔ لیکن تو ہم سے مانگتا تھا، ہم نے اسی کو تیرے لئے ذخیرہ بنایا۔ عمر بھر کی دعائیں جمع کر کے آج

اتنی بڑی نعمت جمع کی کہ اب تو ابدالآباد تک جنت میں چین اڑا اور آرام کر۔ اس وقت بندہ خوش ہوگا کہ اے اللہ! تیرا شکر اور احسان ہے کہ اس وقت تو نے دعا قبول نہ کی اور اب وہ قبولیت کا ذخیرہ مجھے عطا کیا۔

دعا میں تفویض...... تو میرے عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ بندہ دعا تو مانگے مگر اپنی طرف سے تجویز نہ کرے کہ اگر میں مانگ رہا ہوں تو یوں ہونا چاہئے۔ یہ مالک کے اوپر چھوڑ دے۔ کبھی ہاتھوں ہاتھ ملے گا۔ کبھی دیر سے ملے گا۔ کبھی مرنے کے قریب ملے گا، کبھی مرنے کے بعد ملے گا مگر مضطرب ہو کر جو دعا مانگی ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ وہ رائیگاں چلی جائے۔ ضرور قبول ہوگی۔

دعا کا مقام عبادت...... اور میں کہتا ہوں کہ تھوڑی دیر کے لئے مان لیجئے کہ دعا قبول نہ ہوئی۔ نہ دنیا میں ملا نہ آخرت میں ملا۔ کچھ نہیں ملا۔ مگر دعا مانگنا خود عبادت تو ہے تو عبادت کی توفیق ہوئی، یہ آپ کو تھوڑا نفع ہے؟ حدیث میں ہے کہ "اَلدُّعَآءُ هُوَ الْعِبَادَةُ" ① دعا عبادت کا فرد ہے۔

اس لئے کہ عبادت کے معنی غایت تذلل کے ہیں۔ انتہائی ذلت اختیار کرنا، یہ عبادت کی حقیقت ہے۔ آدمی غایت درجہ ذلیل ہو جائے۔ اتنی ذلت آدمی اختیار کرے کہ اس ذلت کے بعد کوئی درجہ ذلت کا باقی نہ رہے۔ یہ حقیقت عبادت ہے۔ تو ہاتھ پھیلا کر مانگنے سے زیادہ کسی چیز میں ذلت نہیں ہے۔ یہ انتہائی طور پر ذلیل چیز ہے کہ آدمی بھیک مانگے۔ اللہ کے آگے جب بھیک مانگے گا تو بندے کا حق ہے کہ وہ انتہائی طور پر ذلیل بن جائے۔ اس لئے کہ انتہائی ذلت اس ذات کے سامنے اختیار کی جا سکتی ہے جس کی عزت انتہائی ہو جس کے بعد کوئی درجہ عزت کا باقی نہ ہو۔ تو اللہ کی ذات انتہائی عزت میں ہے۔ اس کے سامنے ذلت بھی انتہائی پیش کی جائے گی کہ جس کے بعد ذلت کا کوئی درجہ باقی نہ رہے۔ تو دعا مانگنے میں انتہائی ذلت ہے۔

مثلاً آپ نماز پڑھتے ہیں تو کانوں تک ہاتھ اٹھا کر ہاتھ باندھتے ہیں۔ یہ اظہار ذلت کا ابتدائی درجہ ہے کہ نوکروں چاکروں اور غلاموں کی طرح ہاتھ باندھ کر کھڑے ہیں۔ مگر یہ انتہائی ذلت نہیں بلکہ ابتدائی ذلت ہے۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ آپ رکوع میں سر جھکا دیتے ہیں تو رکوع میں بہ نسبت قیام اور ہاتھ باندھنے کے زیادہ ذلت ہے۔ رکوع میں گردن جھک گئی اور سر جھک گیا۔ لیکن یہ بھی انتہائی ذلت نہیں ایک درمیانی قسم کی ذلت ہے۔ جب آپ سجدے میں جاتے ہیں تو ناک اور پیشانی خاک پر رگڑتے ہیں۔ یہ انتہائی ذلت ہوگئی۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو یہ بھی انتہائی ذلت نہیں ہے۔ انتہائی ذلت اخیر میں رکھی گئی ہے کہ سلام پھیر کر ہاتھ اٹھا کر اللہ کے سامنے دعا مانگو۔ یہ سلام پھیرنے سے پیشتر وہ دعائیں پڑھو جو شریعت نے تلقین کی ہیں۔ تو دعا کا مانگنا اور بھیک مانگنا یہ انتہائی ذلت ہے۔

سوال ممانعت...... اسی واسطے سوال کرنے کی ممانعت کر دی گئی ہے کہ آدمی آدمی سے سوال کرے یعنی بھیک مانگے۔ سوائے اس کے کہ مضطر ہو جائے مخمصہ کی حالت ہو کہ اگر نہیں مانگوں گا تو جان جانے کا خطرہ ہے۔ اس وقت

---

① السنن لأبي داؤد، كتاب الصلوة، باب الدعاء في الصلوة، ج: ۱۳، ص: ۷۰، رقم: ۷۴۷.

اجازت دی گئی ہے کہ مانگ لو۔ عام حالات میں بھیک مانگنے کی اجازت نہیں۔

سوال محبت...... ایک ہے سوال محبت اور سوال تعلق۔ وہ اس سے خارج ہے۔ جیسے بیٹا باپ سے مانگنے لگے یا دوست احباب میں باہم گہرا تعلق ہے اور وہ مانگے کہ بھئی! ہمیں چند پیسے دے دو یا کھانا کھلا دو یہ سوال نہیں۔ یہ سوال تعلق ہے۔ یہ سوال ذلت کا نہیں بلکہ یہ سوال محبت کا ہے۔ اس سوال کی اجازت ہے۔

بلکہ بعض اوقات شریعت نے تلقین کی ہے کہ بعض مواقع میں جا کر خود مانگ کر کھاؤ تا کہ تعلق میں اضافہ ہو جیسے قرآن کریم میں فرمایا گیا: ﴿لَیْسَ عَلَی الْاَعْمٰی حَرَجٌ وَّلَا عَلَی الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَی الْمَرِیْضِ حَرَجٌ وَّلَا عَلٰٓی اَنْفُسِکُمْ اَنْ تَاْکُلُوْا مِنْ بُیُوْتِکُمْ اَوْ بُیُوْتِ اٰبَآئِکُمْ اَوْ بُیُوْتِ اُمَّهٰتِکُمْ اَوْ بُیُوْتِ اِخْوَانِکُمْ اَوْ بُیُوْتِ اَخَوٰتِکُمْ اَوْ بُیُوْتِ اَعْمَامِکُمْ اَوْ بُیُوْتِ عَمّٰتِکُمْ اَوْ بُیُوْتِ اَخْوَالِکُمْ اَوْ بُیُوْتِ خٰلٰتِکُمْ اَوْ مَا مَلَکْتُمْ مَّفَاتِحَهٗٓ اَوْ صَدِیْقِکُمْ﴾ ①

تمہارے اوپر کوئی نہیں گناہ اگر تم اپنے گھر میں مانگ کر کھالو۔ اگر آدمی اپنی بیوی سے کہے کہ فلاں چیز مجھے دے۔ یہ سوال ذلت کا تھوڑا ہی ہے۔ یہ حق کا سوال ہے اور تعلق کا سوال ہے۔ تو آدمی اپنے گھر سے یا کسی دعوت کے کھانے، اسے یہ حق ہے بلکہ کھانا ہی چاہئے۔ اگر اپنے گھر میں بھی یہ انتظار کرے کہ مجھے دعوت دی جائے تو میں کھاؤں۔ تو بھوکا مرے گا، گھر میں بیٹھ کر روز کون اسے دعوت دے گا۔

اسی طرح فرمایا کہ: یا تمہارے باپ کا گھر ہو، بیٹے کو الگ کر دیا ہے۔ باپ کا گھر الگ ہے۔ فرماتے ہیں۔ یہاں بھی مانگ کر کھانے میں کوئی گناہ نہیں۔ یعنی اشارہ کیا جا رہا ہے کہ جانا چاہئے اور مانگ کر کھانا چاہئے تا کہ تعلق میں اضافہ ہو، باپ یہ نہ سمجھے کہ بیٹا مجھ سے اجنبی ہو گیا یا مستقل اپنی بارگاہ بنالی کہ اس میں بیٹے ہونے کی شان باقی نہیں رہی۔ کبھی کبھی باپ کے سامنے اپنے بیٹے ہونے کی اور اپنی محتاجگی کی شان ظاہر کرنی چاہئے تا کہ اس کی بڑائی واضح ہو، ہماری خوردی واضح ہو۔ اس لئے فرمایا کہ باپ کے گھر میں جا کے مانگ کر کھالو۔

یا ماں کا گھر جدا ہے۔ تو وہاں جاؤ اور مانگ کر کھالو یا پھوپھی اور خالہ، ان کے گھروں میں جاؤ اور مانگ کر کھالو، اس لئے کہ خالہ بھی ماں کے برابر ہے، پھوپھی بھی ماں کے برابر ہے۔ وہ باپ کی بہن ہے۔ یا فرماتے ہیں کہ: ﴿اَوْ مَا مَلَکْتُمْ مَّفَاتِحَهٗٓ﴾ ② یا تمہاری باندی کا گھر ہے یا تمہارے غلام کا گھر ہے جو تمہارا زرخرید ہے۔ وہ تمہارا مملوک ہے، تمہاری اولاد کی مثل ہے۔ اس سے اگر مانگو گے تو یہ مانگنا ذلت کا نہیں بلکہ ازدیادِ تعلق کا ہے۔

﴿اَوْ صَدِیْقِکُمْ﴾ یا دوست احباب ہوں یا تم میں میل جول ہے۔ اپنے کسی دوست کے گھر جا کے کہے کہ بھئی! آج تو تمہارے گھر سے کھانا کھائیں گے۔ تو یہ ذلت کی بات نہیں بلکہ اس سے تعلق بڑھتا ہے۔ اس کے

---

① پارہ: ۱۸، سورۃ النور، الآیۃ: ۶۱.

② پارہ: ۱۸، سورۃ النور، الآیۃ: ۶۱.

دل میں یہ گنجائش پیدا ہوگی کہ اس نے مجھے اپنا سمجھا تو آ کر مانگا۔ آدمی کسی اجنبی کے ہاں جا کر تھوڑا مانگ لیتا ہے۔

خود فرمائش …… حدیث میں ہے کہ ایک دفعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کے گھر تشریف لے گئے۔ تو بریرہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی باندی اور مملوکہ ہیں۔ بے چاری غریب تھیں۔ آپ نے جا کے خود فرمائش کی کہ بریرہ کوئی چیز کھانے کی رکھی ہے؟

انہوں نے عرض کیا: ہے تو مگر آپ کے کھانے کی نہیں۔ فرمایا: کیا ہے؟ عرض کیا: کچھ گوشت رکھا ہوا ہے مگر وہ آپ کے لئے نہیں۔

فرمایا: کیوں؟ عرض کیا: وہ صدقے کا میرے پاس آیا ہے۔ فرمایا: "لَکِ صَدَقَةٌ وَلَنَا هَدِيَةٌ" ① فرمایا: صدقہ تیرے لئے ہے۔ جب تو ہمیں دے گی تو ہمارے لئے ہدیہ بن جائے گا۔ آپؐ نے تناول فرمایا تو معاذ اللہ یہ ذلت کا سوال نہیں تھا، یہ محبت بڑھانے کا سوال تھا۔ تعلق بڑھانے کے لئے آپ نے مانگا تھا، تو تعلق میں اضافہ کرنا ہوتا ہے تو اس وقت آدمی مانگتا ہے۔ دوسرا سمجھتا ہے کہ ہمیں اپنا سمجھا ہے۔

ترکِ تکلف …… میرا جب افغانستان جانا ہوا تو وہاں ترکستانیوں میں ایک رواج دیکھا جو ترکستان سے مہاجرین آئے ہوئے تھے، خود کابلی افغانیوں میں بھی ہے۔ شہر کابل میں گویا یہ ایک عام تمدن ہے کہ بیٹھے بیٹھے چند دوست احباب جمع ہوئے کہ آج فلاں دوست یا بھائی کے ہاں کھانا کھائیں گے، تو دس بیس آدمی اکٹھے پہنچ گئے۔ وہ بہت خیر مقدم کرے گا۔ دعائیں دے گا اور استقبال کرے گا کہ آیئے بیٹھئے اور کھانا پکنا شروع ہو جائے گا۔ دس بیس اور احباب جمع ہوئے۔ وہ ہمارے گھر آ گئے کہ ہم تو کھانا کھانے آئے ہیں۔ تو ہر شخص وہاں دس بیس آدمی کے کھانے کا بندوبست رکھتا ہے۔ ایک عام رواج ہے کہ بے بلائے دس دس، بیس بیس آدمی پہنچ جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جب دوستوں میں بھی یہ تکلف ہو کہ آدمی دعوت کا انتظار کرے تو وہ دوستی کیا ہوئی؟ وہ بے تکلفی کیا ہوئی؟ وہاں یہ ایک عام رواج ہے جس سے وہاں تعلقات میں اضافہ ہوتا رہتا ہے اور تعلقات مضبوط ہیں۔

اسلامی بے تکلفی …… کسی بزرگ کا واقعہ ہے کہ وہ کھانا کھا رہے تھے۔ کوئی صاحب وہاں پہنچ گئے۔ ان کے ذہن میں یہ تھا کہ وہ تواضع کریں گے۔ انہوں نے کوئی تواضع نہیں کی کہ ان کے دل میں بڑی گرانی ہوئی کہ بزرگ آدمی ہیں، کھانا کھا رہے ہیں۔ یہ تو اخلاقی بات بھی ہے اور ایک مسلمان کا حق بھی ہے کہ یوں کہے کہ بھئی! کھانا کھا لو۔ بلکہ اگر کسی کو نہیں بھی کھلانا ہوتا تو ظاہرداری کے طور پر ہی کہہ دیا کرتا ہے کہ بھائی! کھانا کھایئے اور جب دوسرا کہتا ہے کہ میں تو کھا کے آیا ہوں۔ تو دل میں شکر کرتا ہے کہ اچھا ہوا کھا آیا۔ تو ظاہرداری تو کی۔ تو اس کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ کم از کم ظاہرداری کے طور پر ہی تواضع تو کر لیتے۔ یہ تو ایک اسلامی تعلق ہے۔ تو کچھ منقبض اور گھٹے گھٹے سے رہے۔

وہ بزرگ کھانا کھا کے فارغ ہو گئے۔ تو اس سے رہا نہ گیا۔ اس نے شکایت کی کہ میں تو یہ سمجھتا تھا کہ آپ

---

① السنن للنسائي، كتاب الطلاق، باب خيار الأمة، ج: ۱۱، ص: ۱۳۷.

بزرگ ہیں اور اسلامی تعلق کا مقتضی ہے اور اسلامی بے تکلفی کا تقاضا یہ ہے کہ آپ کہتے کہ کھانا کھاؤ۔ تو انہوں نے حیرت سے کہا کہ اچھا آپ مسلمان ہیں؟

کہا کہ الحمد للہ میں مسلمان ہوں جیسے کہ آپ مسلمان ہیں۔ فرمایا اسلامی بے تکلفی کے تو یہ معنی تھے کہ آپ نے اپنا گھر سمجھا تھا تو کھانا کھانے بیٹھ جاتے۔ یہ انتظار کرنا کہ کوئی تمہیں دعوت دے تو جمع کرے۔ معلوم ہوا تمہارے ذہن میں تکلف موجود ہے۔ بے تکلف تعلق نہیں رکھتے۔ تمہاری محبت کامل نہیں تھی۔

یہ انہوں نے جواب دیا۔ خیر یہ بات اب عام تو نہیں ہے مگر بعض جگہ واقعی یہ ہوتا ہے کہ اس کا انتظار کیا کہ ہماری تواضع کی جائے۔ تب بیٹھیں گے، یہ داخل تکلف ہوتا ہے۔ بے تکلف آ کے بیٹھ جائیے۔ اب باپ بھائی بیٹھے ہوئے کھانا کھا رہے ہیں، شیخ یا استاذ کھانا کھا رہے ہیں جن سے نہایت بے تکلفی کا اور نیازمندانہ تعلق ہے۔ اگر آدمی بے تکلف آ کے بیٹھ جائے کہ صاحب! مجھے تو کھانا کھانا ہے۔ تو وہ اور شکر گزار ہوں گے کہ نہایت بے تکلف آدمی ہے۔ تعلق مضبوط ہے۔ حاصل یہ نکلا کہ شریعت کے ہاں یہ مطلوب ہے کہ بعض جگہ تواضع اور دعوت کا انتظار مت کرو تا کہ تعلق واضح ہو۔ اس میں اپنا گھر ہے، ماں کا گھر ہے، باپ کا گھر ہے، پھوپھی اور خالہ کا گھر ہے۔ ان میں آدمی جا کے مانگے اور بے تکلف کھائے تا کہ تعلق بڑھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مطلقاً کھانے اور پینے کی چیز کا سوال کرنا ممنوع نہیں ہے۔

ذلت سوال..... بلکہ سوال ذلت ممنوع ہے جس میں بھکاری بن کے جائے اور ذلیل النفس بنا کے جائے۔ اور اگر عزیز النفس بن کے جائے، محبت کے بڑھانے کے لئے سوال کرے، یہ سوال اس سے مستثنیٰ ہے۔ تو میرے عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ سب سے زیادہ ذلت انسان کو سوال کرنے کے وقت پیش آتی ہے اور سوال کرنے والا جب سوال کرتا ہے تو واقعہ یہ ہے کہ اس کے منہ کی آب جاتی رہتی ہے۔ اس کے منہ پر جو ایک رونق ہوتی ہے۔ وہ ختم ہو جاتی ہے۔ خود اپنے ذہن میں اپنے کو ذلیل سمجھتا ہے کہ میں نے بہت برا کام کیا۔ تو سب سے زیادہ ذلت سوال کے وقت پیش آتی ہے۔

اور یہی وجہ ہے کہ احادیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ: قیامت کے دن وہ لوگ جو دنیا میں بے وجہ، محض طمع اور لالچ سے سوال کرتے تھے اور ذلیل النفس بنتے تھے۔ ان کا حشر اس حالت میں کیا جائے گا کہ ان کے چہرے کا گوشت اڑا ہوا ہوگا۔ کچھ ادھر لٹک رہا ہے، کچھ ادھر لٹک رہا ہے۔ ہڈیاں نمایاں ہیں۔ نہایت ذلیل صورت ہوگی، یہ گویا عمل کے مطابق جزا ہے۔ اس لئے کہ جب بھیک مانگتا ہے تو چہرے کی آب و تاب جاتی رہتی ہے۔ چہرے کی رونق اڑ جاتی ہے، اس بے رونقی کو اس شان سے ظاہر کیا جائے گا کہ گوشت کچھ ادھر لٹکا ہوا اور کچھ اُدھر لٹکا ہوا ہے اور ہڈیاں نمایاں ہیں۔ یعنی ایسا چہرہ لے کر آئے گا کہ دنیا اس چہرے کو دیکھ کر نفرت کرے گی۔ وہ جو ذلت نفس اس کے اندر تھی، اس ذلت کا مظاہرہ کیا جائے گا۔ وہ ذلت اس صورت میں چمکے گی کہ چہرے پر عزت کے کوئی آثار

باقی نہیں رہیں گے اور چہرے کی رونق اڑ جائے گی۔

تو قیام میں انسان اللہ کے سامنے ذلت اختیار کرتا ہے مگر یہ ابتدائی مرتبہ ہے، رکوع میں اس سے زیادہ ذلت ہے، سجدے میں اس سے زیادہ ذلت ہے اور مانگنے میں اس سے زیادہ ذلت ہے۔

بندہ کے سوال سے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی...... یہی وجہ ہے کہ حق تعالیٰ سوال کرنے سے جتنے خوش ہوتے ہیں اتنے کسی چیز سے خوش نہیں ہوتے۔ فرماتے ہیں اگر کوئی بندہ سوال کرتا ہے تو ہم اس سے خوش ہیں کہ اگر سوال نہیں کرے گا تو ہم اس سے ناراض اور ناخوش ہیں۔ دنیا میں اس کے برعکس قصہ ہے، اگر آپ کسی کے آگے سوال کرنے لگیں تو وہ خوش نہیں ہوگا بلکہ ناخوش ہوگا۔ محبت بھی ہوگی تو ختم ہو جائے گی اور حق تعالیٰ کے ہاں اگر نہ مانگے تب ناخوش ہوتے ہیں، مانگنے پر خوش ہوتے ہیں۔

اس کی بناء یہ ہے کہ دنیا میں آپ جس سے بھی مانگیں گے، چاہے وہ ارب پتی ہو۔ مگر اس کا خزانہ پھر بھی محدود ہے، جتنا دے گا اتنی خزانے میں کمی پڑ جائے گی۔ اللہ کے خزانے لامحدود ہیں، اگر عالم بھی بخش دیں تب بھی کمی نہیں پڑے گی۔ اس لئے ناخوش ہونے کی کوئی وجہ نہیں، البتہ یہ امتحان ہے کہ کون بندگی اختیار کر کے آتا ہے۔ کون بندہ کی صورت سے آتا ہے۔ تو بندہ وہی ہے جو پوری بندگی نمایاں کرے اور بندگی کے معنی اظہارِ ذلت کے ہیں۔ اس واسطے مانگنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑنی چاہئے۔ خوب مانگا جائے۔

مگر اپنی طرف سے تجویز نہ کی جائے۔ مراد مانگ لی جائے اس میں قیدیں اور شرطیں لگانا یا جس سے آپ مانگ رہے ہیں، اسے آپ کہیں کہ آپ کو یوں کرنا ہوگا تو یہ حق تعالیٰ کے ہاں بے ادبی اور خلافِ تہذیب ہے۔ تو مانگنے میں کسر نہ چھوڑے مگر اپنی طرف سے تجویز نہ کرے۔ جتنا مانگے گا اتنی ہی ادھر خوشی بڑھے گی اور رضا کا تعلق بھی اتنا ہی ہوگا۔

تعلیمِ دُعا...... مجھے مکہ معظمہ کا ایک واقعہ یاد آیا، جن لوگوں کو حج کرنے کا موقع ملا ہے وہ جانتے ہیں، حجاز اور مکہ میں غرباء بہت زیادہ ہیں۔ بے چارے مانگتے ہیں اور لیچڑ بن کر مانگتے ہیں۔ حرم شریف میں باوجود یہ کہ حکومت انتظام کرتی ہے کہ سائل نہ آئیں، مگر پھر بھی ہزاروں کی تعداد میں پہنچ جاتے ہیں اور وہ ہر ایک کے آگے ایک قرش دو قرش مانگتے پھرتے ہیں۔ اور اس طرح سے مانگتے ہیں کہ دینے والا اگر دے دے تو تھوڑی دیر میں پھر لوٹ کے آجائیں گے۔ پھر لوٹ کے آجائیں گے۔ نہ دے تو وہ کھڑے رہیں گے، یا وہ انکار کرے یا وہ منہ پھیرے۔ غرض لوگ مانگنے والوں سے زچ آجاتے ہیں اور تنگ آجاتے ہیں۔ تو بعض لوگ جھنجلائے ہوئے میرے پاس آئے کہ صاحب! یہ عجیب بے وقوف قسم کے سائل ہیں۔ انہوں نے ہماری تلاوت بھی ختم کر دی، نوافل بھی ختم کر دیئے، جہاں تلاوت کرنے بیٹھے وہ آ کے کھڑے ہو گئے۔ اب یا تو دے یا جب تک زبان سے یوں نہ کہے "اللہ کریم" آگے جاؤ، اس وقت تک ٹلتے نہیں۔ اب تلاوت کے سینکڑوں ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔ چند آیتیں پڑھیں پھر کہا، اللہ کریم۔ چند آیتیں پڑھیں پھر دوسرا آگیا، پھر اس سے کہا، اللہ کریم آگے جاؤ۔ تو ہم عاجز آگئے اور پریشان ہیں اور

آپ یہ کہتے ہیں کہ سائل کو جھڑکو بھی نہ۔ آپ کیا کہتے ہیں قرآن پاک میں ہے ﴿وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ﴾ ① کہ سائل کو مت جھڑکو۔ اب نہ کہیں یا نہ جھڑکیں تو انہوں نے تو عاجز کردیا، کیا کریں؟ غرض بہت ہی غصے اور خفگی میں تھے اور کئی آدمی تھے۔ میں نے کہا آپ نے غور نہیں کیا۔ یہ سوال کرنے والے آپ کے معلّم ہیں۔ آپ کو تعلیم دینے آئے ہیں۔ کہنے لگے کہاں کی تعلیم؟

میں نے کہا یہ آپ کو مانگنا سکھانے آئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے اس طرح لیچڑ ہو کے مانگو کہ ہم تو لے ہی کے اٹھیں گے۔ خیر وہ اس پر ٹھنڈے ہو گئے اور بہت خوش ہو کے واپس ہوئے۔ پھر انہوں نے نہ کسی سائل کو برا بھلا کہا نہ جھڑکنے کی نوبت پیش آئی۔ وہ سمجھ گئے کہ واقعی یوں ہی مانگنا چاہئے۔ مانگنے کا ڈھنگ یہی ہے۔

فرق اتنا ہے کہ انہوں نے غلطی یہ کی کہ آدمی سے اس طرح مانگنا شروع کیا حالاں کہ اس طرح اللہ میاں سے مانگنا چاہئے کہ آدمی گھٹنے ٹیک دے کہ میں لئے بغیر نہیں اٹھوں گا۔ میں رب کریم کی بارگاہ میں حاضر ہوں اور محروم چلا جاؤں۔ ایسا نہیں ہوسکتا۔ تو اس عزم سے آدمی مانگے تو کبھی محروم نہیں ہوسکتا۔

علامتِ قبولیت...... اور بعض علامتیں بھی ایسی ہیں۔ چنانچہ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ جب کوئی بوڑھا آدمی جس کی داڑھی سفید ہو اور وہ اللہ کے آگے ہاتھ پھیلاتا ہے تو حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مجھے شرم آتی ہے کہ اس سفید ریش کو خالی ہاتھ واپس کردوں۔ یوں تو میں کریم ہوں ہی، لیکن میری کریمی اور بڑھ جاتی ہے جب کوئی سفید ریش، سفید بال والا مانگتا ہے کہ اس بوڑھے کو میں محروم واپس کروں۔ اس کے چہرے پر ایک ہیبت کا اثر ہے اور ایک وقار ہے تو میں اس کو ذلیل کر کے واپس کروں، تو حق تعالیٰ اس کی بات رکھتے ہیں۔ فرماتے ہیں، میں اس کو خالی ہاتھ واپس نہیں کرتا اور اس کی مراد پوری کرتا ہوں۔

اہلِ قبولیت سے مشابہت کا اثر...... اور اس میں بعض بزرگوں نے تو لطیفہ کیا۔ یحییٰ ابن اکثمؒ ایک بزرگ گزرے ہیں۔ اور صاحب فنون ہیں۔ نحو یا صرف کے غالباً امام ہیں۔ بہرحال بڑے لوگوں میں ہیں، جس وقت ان کے انتقال کا وقت آیا۔ تو انہوں نے ایک دوست کو وصیت کی کہ جب مجھے قبر میں اتاریں تو میری داڑھی کے اوپر سفید میدہ یا چونا کوٹ کر رکھ دینا کہ میری داڑھی سفید ہو جائے۔ کس لئے رکھنا؟ تجھے اس سے بحث نہیں۔ اس نے تعمیل حکم کی، کفن دیتے ہوئے کوئی میدہ اور چونا ایسا مل دیا کہ داڑھی کے بال بالکل سفید ہوگئے اور ڈھانپ دیا اور نماز پڑھ کے دفن کردیئے۔ حق تعالیٰ کے سامنے پیش ہوئے اور عرض کیا کہ میری مغفرت فرما دیجئے۔

فرمایا: او بوڑھے! تو نے فلاں حرکت نہیں کی؟ فلاں حرکت نہیں کی؟ فلاں گناہ نہیں کیا؟ عرض کیا جی ہاں! سب کچھ کیا، کہ پھر تو اس قابل ہے کہ تیری مغفرت کی جائے۔ مانگنے کو تو آیا ہے؟ کیا تیری مراد پوری کی جائے؟ عرض کیا کہ یا اللہ! میری داڑھی سفید ہے۔ اسے تو دیکھ لیجئے، آپ ہی نے تو فرمایا ہے کہ ہم سفید داڑھی

---

① پارہ: ۳۰، سورۃ الضحیٰ، الآیۃ: ۱۰.

رکھنے والے کو واپس نہیں کرتے۔ تو میں سفید داڑھی نہیں رکھتا تھا تو میں نے سفید داڑھی رکھنے والوں سے کم از کم مشابہت پیدا کرنے کے لئے چونا لگایا اور داڑھی کو سفید کر لیا۔ تو رنگ تو سفید ہو گیا۔ چاہے عارضی طور پر ہو چاہے اصلی طور پر ہو، اور آپ نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ سفید وہ ہو جو اصلیت سے سفید ہو۔ سفید داڑھی کے معنی سفید بالوں کے ہیں اور میں سفید بال لے کر حاضر ہوا ہوں۔ آپ وعدہ کے مطابق بخش دیجئے۔ فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ شانہٗ نے فرمایا او بڈھے جا ہم نے تجھے بخشا اور معاف کر دیا۔

تو بعض بزرگ وہاں بھی جا کر مذاق کرتے ہیں، مگر اس قسم کا مذاق جو اصولِ شرعیہ سے ماخوذ ہو۔ حق تعالیٰ اس کی رعایت فرماتے ہیں۔ چناں چہ یحیٰ ابن اکثمؒ کو بخش دیا۔ جس شخص نے انہیں خواب میں دیکھا تو اس کو انہوں نے یہ واقعہ سنایا کہ میں نے تو اپنی سفید داڑھی سامنے کر دی تھی اور عرض کیا کہ آپ ہی کا وعدہ ہے کہ ہم سفید ریش کو واپس نہیں کرتے۔ میں تو مغفرت مانگتا ہوں۔

بہر حال اس سے معلوم ہوا کہ سفید داڑھی تو وقار ہے ہی اور نیکی اور تقویٰ کی علامت ہے، اس کے ساتھ اگر مشابہت ہی پیدا کر لی جائے، وہ آدمی بھی محروم نہیں رہتا، تو کم سے کم اس لئے ہی مشابہت پیدا کر لیجئے، اگر ہماری داڑھی نہیں ہے تو ہم اس لئے رکھ رہے ہیں کہ ہمارے ساتھ وہ معاملہ ہو جائے جو داڑھی والوں کے ساتھ ہوتا ہے۔

اسلامی صورت...... نیز یہ کہا گیا کہ قیامت کے دن داڑھی کو نور بنایا جائے گا۔ داڑھیاں نور کی صورت اختیار کریں گی۔ یعنی اس روشنی میں آدمی راستہ طے کرے گا۔ تو اس لئے رکھ لے کہ بھائی! میرا راستہ ہی طے ہو گا۔ ایسا نہ ہو کہ میرا نور بجھ جائے، اس اندھیرے میں کس طرح قدم اٹھاؤں گا تو کم سے کم یہ رعایت کرے۔

اور مسلمان کی صورت تو داڑھی ہی سے اچھی معلوم ہوتی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ یہ اچھا معلوم نہیں ہوتا کہ داڑھی نہ ہو۔ آپ خود غور کر لیں۔ یہ صحیح ہے کہ بعض لوگ ایسے بھی ہیں جن میں منفعل بھی ہیں کہ کچھ سوسائٹی اور ماحول کی مجبوری سے ایسا کر لیتے ہیں۔ یہ صحیح ہے مگر مجبوری تو وہ پیشِ نظر رکھنی چاہئے جس کا کوئی جواب نہیں ہو گا اور وہ قیامت کے دن کی مجبوری ہے، یہاں کی مجبوریاں تو سہی جا سکتی ہیں۔ لیکن اگر وہاں کوئی ایسی بات سامنے آئے تو کسی صورت میں وہاں تدارک ہی نہیں، وہاں تو پھر بھگتانے ہی کی صورت ہے۔ تو کم سے کم اسی نیت سے کرے۔

تشبہ باسمِ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ثمرہ...... اور کچھ نہیں تو یہی نیت کرے کہ میری جو محبوب ترین ذات ہے وہ میرے رسول نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ ان کی صورت پاک ایسی تھی، کم از کم میں ان سے ہی مشابہت کروں۔ تشبہ میں بڑی برکتیں ہیں، اگر نام بھی رکھ لے اس میں برکت ہے۔ حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ: قیامت کے دن جب میدانِ محشر میں لوگ جمع ہوں گے۔ حق تعالیٰ اپنے پیغمبر کو "یَا مُحَمَّدُ" کہہ کر پکاریں گے۔ تو حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: جتنے لوگوں کے نام محمد ہوں گے، ہر ایک یہی سمجھے گا کہ مجھے پکارا ہے تو لاکھوں آدمی کھڑے ہو جائیں گے۔ حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ ہم نے تو اپنے پیغمبر کو پکارا تھا۔ جنہیں ہم نے جنت میں بھیجا

تھا۔ لیکن جب تم کھڑے ہوگئے تو تم بھی ان کے ساتھ جاؤ۔ اب ہم تمہیں بٹھانا نہیں چاہتے۔ اس نام کی برکت سے نجات اور مغفرت ہو جائے گی، تو جن کے نام پاک کے نام کی نقل اتارنے کی یہ برکت ہے، اگر ان کی صورت کی نقل اتار لی تو کتنی برکات ظاہر ہوں گی۔ اگر ان کی سنتوں کی، ہم نقل اتارنے لگیں تو کتنی برکات ظاہر ہوں گی۔ بہرحال اتباعِ سنت میں خیر ہی خیر ہے، کوئی برائی نہیں اور ترکِ سنت میں برائی ہی برائی ہے۔ چاہے وہ آج واضح نہ ہو کل کو واضح ہو جائے گی یا قبر میں واضح ہوگی یا محشر میں واضح ہوگی۔

میں تو یہ عرض کیا کرتا ہوں کہ اگر مولویوں کی سی داڑھی نہ رکھیں تو کم سے کم اتنی رکھ لیں کہ دور سے نظر آئے کہ بھئی! داڑھی ہے مسلمان ہے۔ وہ بھی ان شاء اللہ نور کا کام دے گی، ان شاء اللہ ضائع نہیں جائے گی، یہ عمل بھی اکارت نہیں جائے گا۔ اتباعِ سنت کے لئے ایک قدم بڑھے گا، ایک ہی قدم کا اجر ملے گا۔ دو بڑھیں گے، دو کا اجر ملے گا، لپک کر چلیں گے، اس کا اجر ملے گا۔ جتنا بھی آپ بڑھیں گے۔ خیر کی طرف بڑھیں گے، خیر دنیا و آخرت دونوں اس میں ظاہر ہوں گی، ان شاء اللہ برکات نمایاں ہوں گی۔

مشابہت کا تمدنی فائدہ..... مصر میں میں نے ایک واقعہ سنا، جس سے واقعی مجھے عبرت ہوئی، وہاں عام طور سے لوگ داڑھی نہیں رکھتے بلکہ جو رکھ لیتا ہے اسے پکارتے ہیں کہ یہ تو یہودی ہو گیا۔ یہ اس کو طعن دیتے ہیں۔ مگر جن لوگوں کے داڑھی ہے، ان سے پوچھا تم نے کیا فائدہ سوچا؟۔ یعنی شرعی بات تو الگ ہے، اس سے قطع نظر کر کے تمدن کی حیثیت سے تم نے کیا بات سوچی جو تم داڑھی رکھتے ہو؟ یہ جواب تو صحیح ہے کہ اتباعِ سنت کرتے ہیں پیغمبر علیہ السلام کی صورت سے مشابہت بے شک برکت ہی برکت ہے۔ لیکن تم پر جو طعنے پڑتی ہیں۔ اس کے مقابلہ کے لئے تمدنی حیثیت سے داڑھی رکھنے میں تم نے کیا مصلحت سوچی؟

انہوں نے کہا کہ ایک بڑی مصلحت یہ ہے کہ یہاں پردہ بالکل نہیں۔ نوجوان لڑکیاں پھرتی ہیں اور بہت زیادہ بالکل آزاد ہیں داڑھی والا جو ان کے سامنے آتا ہے، منہ پھیر کے چلی جاتی ہیں۔ کبھی اس کی طرف رجوع نہیں کرتیں۔ تو ہم نے دیکھا کہ ہمارے لئے تقویٰ کا راستہ صاف ہو گیا۔ اگر ہم نہ بچنا چاہیں تو وہ ہم سے بچتی ہیں۔ ہم برائی میں مبتلا نہیں ہو سکتے۔ میں نے کہا: الحمدللہ، دنیا میں کم سے کم یہ مصلحت تو نمایاں ہوئی کہ داڑھی والے کی طرف آزاد اور اوباش قسم کی عورتیں متوجہ نہیں ہوتیں اگر متوجہ ہوگی تو اپنی ہی بیوی متوجہ ہوگی۔ یعنی حلال ہی کام اس سے سرزد ہوگا، حرام سرزد نہیں ہوگا۔ یہ کتنا بڑا فائدہ ہے۔

اور پھر یہ کہ اگر آپ نے مولویانہ صورت بنائی تو آپ کو کبھی جرأت نہیں ہوگی کہ سینما میں جا کے بیٹھیں، لوگ یوں کہیں گے کہ معقول مولویانہ صورت سے تم یہاں آئے؟ دنیا طعن دے گی۔ تو اس داڑھی کی وجہ سے آدمی بہت سے مصائب اور برائیوں سے بچ جاتا ہے۔ تو ایسی چیز تو محبت کرنے کے قابل ہے جو بہت سی برائیوں سے بچانے کا ذریعہ بن جائے۔ تو ایک تو اتباعِ سنت ہے، وہ تو عظیم چیز ہے۔ دنیا میں بہت سے منافع بھی ہیں اور فوائد و برکات بھی ہیں۔

سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے کمالِ عشق و محبت...... اور اصل یہ ہے کہ محبت کی کمی ہے۔ اگر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت تام اور پوری ہو جائے۔ پھر اس قسم کے معاذیر اور عذرات کچھ پیش نہیں چلتے۔ محبت ناقص اور عشق ناتمام میں اس قسم کی چیزیں ہوتی ہیں کہ ملامت کرنے والے یوں ملامت کریں گے تو ہم کیا کہیں گے اور فلاں عیب لگا دے گا تو ہم کیا کہیں گے۔ جب عشق قلب میں تام ہو جاتا ہے تو پھر کسی ملامت گر کی ملامت کی پرواہ باقی نہیں رہتی۔

حضرت حذیفہ ابن یمان رضی اللہ عنہ، جب ایران فتح ہو گیا، بغداد میں تشریف رکھتے تھے اور کھانا تناول فرما رہے تھے۔ ایک ذمی غلام کھڑا ہوا کھانا کھلا رہا تھا۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ سے لقمہ چھوٹ کر گر پڑا۔ انہوں نے فوراً جھک کر زمین پر سے لقمہ اٹھایا اور خاک وغیرہ اتار کر صاف کیا اور تناول کر لیا۔ وہ فارسی غلام جو کھڑا ہوا تھا، اس نے کہا کہ: یہ آپ نے کیا حرکت کی؟ یہاں بڑا تمدن ہے بڑے بڑے متمدنوں کا ملک ہے اور بڑے معزز لوگ ہیں زمین پر پڑی ہوئی چیز اٹھا کر کھا لینا، یہاں بڑی بدتہذیبی سمجھی جاتی ہے۔ لوگ آپ پر طعن کریں گے کہ یہ بڑے حریص ہیں کہ انہوں نے ایک گری ہوئی چیز اٹھا کر کھالی۔ تو اس کو عیب اور ذلت سمجھا جاتا ہے۔ آپ حضرات کو اپنا وقار تھامنے کے لئے ان باتوں کی رعایت رکھنی چاہئے۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کیا جواب دیتے ہیں؟ فرماتے ہیں "أَأَتْرُكُ سُنَّةَ حَبِيبِي لِهٰؤُلَاءِ الْحُمَقَاءِ" کیا میں اپنے حبیب پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو ان احمقوں کی وجہ سے ترک کر دوں؟ کہ یہ ملامت کریں گے۔ ان کی ملامت مجھ پر کیا اثر کر سکتی ہے؟ سنت کے فوائد میرے سامنے ہیں اور اس ملامت کا کوئی ضرر مجھ تک دنیا و آخرت میں نہیں پہنچ سکتا۔ تو جو چیز کہ کوئی ضرر نہ پہنچا سکے اس کی وجہ سے میں وہ فعل اختیار کر لوں جو دنیا میں بھی میرے لئے مضر ہو اور آخرت میں بھی مضر ہو؟ تو فرمایا کہ: میں ان ملامت گروں کی ملامت کی وجہ سے سنت حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کو ترک نہیں کر سکتا۔ اس میں گویا روٹی کا بھی ادب ہوا اور اتباعِ سنت بھی ہوا اور عظمتِ سنت بھی ہوئی اور سنت کے مقابلہ میں کسی ملامت اور لومۃ لائم کی پرواہ بھی نہ ہوئی۔ تو اس سے حضرت حذیفہ ابن یمان رضی اللہ عنہ کا کمالِ عشق اور کمالِ ایمان واضح ہو جاتا ہے۔

عطیۂ خداوندی کی قدر و منزلت...... اور روٹی کی عزت کرنا یہ خود شرعاً فی نفسہ واجب ہے۔ صریح حدیث میں فرمایا گیا: "أَكْرِمُوا الْخُبْزَ" "روٹی کا اکرام کرو"۔

اس لئے کہ روٹی اللہ کا تبرک ہے، اس کو عزت کے ساتھ بیٹھ کر کھاؤ۔ اس کو استعمالی سامان مت سمجھو کہ کھائی اور جو باقی بچی اٹھا کر پھینک دی۔ جیسے ہم بعض دفعہ ریلوں میں دیکھتے ہیں۔ یہاں تو الحمد للہ دیکھنے میں نہیں آیا مگر ادھر کہ روٹی کھائی اور جو بچی اس سے منہ صاف کیا اور اسے لپیٹ کر باہر پھینک دیا۔ یہ نہایت ذلیل حرکت ہے۔ میں نے تو بعض کو ملامت کی حالاں کہ وہ غیر مسلم تھے۔ میں نے کہا یہ کیا طریقہ ہے؟ کہنے لگے کہ: اب یہ کام کی

نہیں رہی۔ میں نے کہا کہ یہ کرتہ پائجامہ میلا ہو گیا ہے۔ اسے بھی اتار کر ذلت سے پھینک دو۔ کام کا نہیں رہا۔ اس لئے کہ میلا ہو گیا۔ اس وقت کھانا تمہارے کام کا نہیں رہا۔ شام کو تمہارے کام آ جائے گا۔ تمہارے کام کا نہ ہو کسی غریب کے کام آ جائے گا۔ یہ تو خدا کا دیا ہوا رزق ہے، اسے ذلیل کر کے پھینکنا، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ روٹی سے محروم کر دیئے جاؤ گے۔ روٹی کا ادب سکھلایا گیا ہے۔ اس کی بے ادبی جائز نہیں رکھی گئی، اس کا احترام واجب ہے۔ اسی طرح اگر دانے زمین پر گر جائیں۔ انہیں چگ لینا چاہئے، یہ نہیں کہ انہیں جوتیوں میں روند دیا جائے۔ وہ اللہ کا عطیہ ہے اور حق تعالیٰ شانہٗ کا تبرک ہے۔

احترامِ رزق...... ہمارے اساتذہ میں سے حضرت مولانا میاں اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم دیوبند کے محدث تھے۔ ان کی وفات ہوئی بلند پایہ بزرگوں میں سے تھے اور صاحبِ حال لوگوں میں سے تھے۔ ان کا عجیب طریقہ تھا۔ جب کوئی مہمان آتا اور کھانا باہر آیا تو جب مہمان کھانا کھا کر فارغ ہو جاتے۔ تو کچھ تو روٹیوں کے ٹکڑے بچ جاتے ہیں، کچھ چھوٹے موٹے کنے بچ جاتے ہیں اور کچھ ریزے ہوتے ہیں جو دسترخوان پر پڑے ہوتے ہیں۔ تو میاں صاحب مرحوم کا عجیب طریقہ تھا، روٹیوں کے جو بڑے ٹکڑے بچ جاتے، انہیں جمع کر کے احتیاط سے گھر میں بھیجتے کہ یہ مہمان کا تبرک ہے۔ یہ گھر والوں کو کھانا چاہئے، وہ جو کنارے اور چھوٹے چھوٹے کنے رہ جاتے، ان کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے فرماتے کہ انہیں چھت پر پھیلا دو، یہ چڑیوں اور کوؤں کا حق ہے۔ ہمارے رزق میں اللہ نے ان کا بھی حصہ رکھا ہے۔ اور وہ ریزے جو چھوٹے چھوٹے بھورے ہوتے، ان کو جمع کر کے جہاں چیونٹیوں کے سوراخ ہوتے وہاں ڈال دیتے کہ چیونٹیاں انہیں لے جائیں کہ ان کا بھی ہماری غذا کے اندر حق ہے۔ تو ادب بھی ہوا اور ٹھکانے بھی لگا۔ تو روزی اور رزق اسی قسم کی چیز ہے۔ پرانے بزرگوں میں اس کا بڑا احترام کیا جاتا اور کہا جاتا کہ: ”روزی کا مارا ہوا اور روٹی کا مارا کہیں نہیں پنپتا“۔

یعنی جو روٹی کے ساتھ بے ادبی کرے، رزق کے ساتھ گستاخی کرے۔ وہ محروم الرزق بن جاتا ہے، اس لئے شریعتِ اسلام نے روٹی کا ادب سکھلایا کہ اس کی توقیر کرو، اس کو کوڑے میں مت ڈالو، اس کو خاک پہ مت ڈالو، اسے منہ پونچھنے کا رومال مت بناؤ، بلکہ جتنا بچ جائے، ادب کے ساتھ احتیاط سے رکھو، خود تمہارے کام آئے گا۔ تمہارے کام نہیں آئے گا کسی فقیر کے کام آئے گا، کسی غریب کے کام آئے گا۔ دنیا میں ہزاروں لاکھوں آدمی ہیں جو نانِ شبینہ کے محتاج ہیں۔ انہیں کھانے کو ٹکڑا نہیں ملتا اور تم سینکڑوں ٹکڑے ضائع کر کے پھینک دیتے ہیں۔ یہ خود بے ادبی کا ثبوت دیا اور دنیا کو رزق سے محروم کیا۔ جو دنیا کو رزق سے محروم کرے کہیں اس پر یہ اثر نہ پڑے کہ اللہ اسے رزق سے محروم کر دے وہاں تو ادل بدل ہے۔ بہر حال روٹی کا اکرام بھی واجب قرار دیا گیا۔ رزق کا احترام بھی واجب قرار دیا گیا۔ ذرا ذرا سی چیزوں میں ادب سکھلایا گیا۔

احترامِ لباس...... یہی ادب کپڑے پہننے میں ہے۔ مثلاً رات کو آدمی سوتے وقت کپڑے اتارتا ہے۔ اچکن

اتارا، کرتا اتارا، لنگی باندھی۔ فرمایا گیا کہ ان کپڑوں کو زمین پر مت ڈالو۔ فرش پر بکھرا ہوا مت چھوڑو، یعنی بے ادبی اور بے توقیری سے پھیلا ہوا مت چھوڑو۔ اوّل تو یہ ادب کے خلاف ہے۔ جب یہ عطیۂ خداوندی ہے تو جس اللہ نے دیا ہے اس کی نعمت کا احترام کر کے تہہ کر کے سرہانے رکھ دو یا کسی کھونٹی پر ٹانگ دو۔ زمین پر پڑا ہوا مت چھوڑو، اور اس میں یہ بھی فرمایا گیا کہ اس میں دنیوی مضرت بھی ہے فرماتے ہیں کہ "اِطْوُوْا ثِیَابَکُمْ تَرُدُّ اِلَیْهَا اَرْوَاحُهَا" کپڑوں کو لپیٹ کر احتیاط سے رکھو۔ بکھرے ہوئے چھوڑو گے تو ممکن ہے اس کے اندر چیونٹیاں گھس جائیں اور جب پہننے لگو تو ایذا پہنچائیں۔ ممکن ہے کوئی بچھو گھس جائے اور تکلیف پہنچائے، کپڑے کو پڑا ہوا مت چھوڑو۔ بے ادبی بھی ہے اور دنیوی مضرت بھی ہے۔ بلکہ اس کو تہہ کر دو یا کھونٹی پر ڈالو، ہر چیز کے اندر شریعت نے آداب سکھلائے ہیں، کھانے کا ادب بتلایا، لباس پہننے کا ادب بتلایا، لباس پہننے کا ڈھنگ بتلایا کہ ڈھنگ بھی بے ادبی کا مت اختیار کرو کہ وہ اللہ کا عطیہ ہے۔

ہیئتِ احترام..... کوئی بادشاہ اگر کسی کو کوئی عطیہ دے، اور آدمی نے منہ ادھر کو پھیر کر بائیں ہاتھ سے لے لیا، وہ انعام سے محروم کر دیا جائے گا کہ شاہی عطیہ کی اس نے قدر نہیں کی۔ دونوں ہاتھوں سے لیتے ہیں یا دایاں ہاتھ بڑھاتے ہیں۔ ادب کے ساتھ لیتے ہیں کہ شاہی عطیہ ہے۔ اسی طرح فرمایا کہ جب کھانا کھانے بیٹھو، دائیں ہاتھ سے روٹی کھاؤ، دائیں ہاتھ سے پانی پیو۔ گویا حق تعالیٰ ایک ایک لقمہ تمہیں پہنچا رہے ہیں۔ ہر ہر منٹ پر انعام ہو رہا ہے اور تم لیتے جا رہے ہو، تو بائیں ہاتھ سے مت لو کہ یہ بے ادبی ہے۔ جھک کر کھاؤ، متکبر بن کر مت کھاؤ، چوکڑا مار کر مت کھاؤ کہ یہ متکبروں کی طرز ہے۔ سوائے اس کے کوئی معذور ہو۔ بعض دفعہ آدمی ضخیم اور موٹا تازہ ہے۔ اب اس غریب سے اکڑوں نہ بیٹھا جائے۔ نہ یہ کہ ایک پاؤں کھڑا کرے ایک بچھا کے بیٹھ جائے۔ چوکڑا ہی مار کر بیٹھ سکتا ہے۔ وہ معذور ہے۔ تو معذور کا باب الگ ہے۔ لیکن اصل حکم یہ ہے کہ تربع یعنی چوکڑا مار کر کھانا مکروہ ہے۔ لیٹ کر کھانا مکروہ ہے کہ یہ بے ادبی اور گستاخی ہے اور طبی اصول کے بھی خلاف ہے۔ تو یہ سارے آداب اس لئے سکھلائے گئے کہ دنیا کی بھی منفعت حاصل ہو اور اخروی نفع بھی حاصل ہو اور رضائے خداوندی بھی حاصل ہو۔

احکامِ شریعت میں فوائدِ اخروی و دنیوی..... شریعت کے ہر حکم میں جہاں آخرت کے منافع ہیں وہاں دنیا کے بھی منافع ہیں۔ حدیث میں ارشاد فرمایا گیا: "اَلسِّوَاکُ مَطْهَرَةٌ لِّلْفَمِ وَمَرْضَاةٌ لِّلرَّبِّ" ① مسواک کرنے میں منہ کی پاکیزگی اور خوشبو ہے اور آخرت کا ثواب ہے اور حق تعالیٰ کی رضا ہے۔

تو مسواک کرنے میں دو فائدے حاصل ہوئے۔ اللہ تعالیٰ کی رضا اور منہ کی صفائی، اور منہ کی صفائی کا صحت پر اچھا اثر پڑتا ہے۔ دانت صاف رہیں گے تو پائیوریا نہیں ہوگا تو معدہ نہیں بگڑے گا۔ معدہ نہیں بگڑے گا تو صحت اچھی رہے گی، گویا جسمانی صحت بھی اچھی ہوئی اور صحتِ روحانی بھی حاصل ہوئی کہ رضائے حق میسر آ گئی۔ تو چیز

---

① السنن للنسائي، كتاب الطهارة، باب الترغيب في السواك ج:١ ص:١١.

ایک ہے، ایک حکم ہے۔ اس سے دنیا کا فائدہ بھی اور آخرت کا فائدہ بھی۔

حدیث میں واقعہ فرمایا گیا کہ: حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب زخمی ہو چکے اور مرض الوفات میں تھے تو ایک نوجوان مزاج پرسی کے لئے حاضر ہوا۔ مزاج پوچھا اس سے بات چیت فرمائی۔ وہ واپس ہو گیا۔ جب تھوڑی دور گیا تو غلام سے کہا کہ اس نوجوان کو بلاؤ۔ وہ آیا۔ لنگی پہنے ہوئے تھا جو ٹخنوں سے نیچے زمین پر گھسٹتی ہوئی جا رہی تھی۔ تو آپ نے نہایت ہی محبت سے فرمایا: یَا فَتٰی! (اے نوجوان) "اِرْفَعْ اِزَارَکَ فَاِنَّـهٗ اَنْقٰی لِثَوْبِکَ وَاَتْقٰی لِرَبِّکَ." ① اس کپڑے کو اٹھا۔ اس میں تیرے لئے دو فائدے ہیں انقی لثوبک سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ تیرا کپڑا صاف ستھرا رہے گا۔ یہ جو زمین پر گھسٹتا ہوا آ رہا ہے، تو کہیں جگہ پاک ہے کہیں ناپاک ہے۔ پاکی لگی، ناپاکی لگی۔ کپڑا بے اعتبار بن گیا نہ عبادت کے قابل رہا، نہ نماز کے قابل رہا۔ تو انقی لثوبک دنیوی فائدہ تو یہ ہے کہ کپڑا پاک رہے گا۔ واتقی لربک اور پروردگار کے لحاظ سے دیکھیں تو تیرے اندر تقویٰ پیدا کرے گا۔ خوفِ خدا پیدا کرے گا۔ اس لئے کہ کپڑا زیادہ گھسٹتا ہوا ہوتا ہے تو دل میں رعونت پیدا ہوتی ہے اور کبر کا مضمون دل میں پیدا ہوتا ہے اور اگر کپڑا ٹخنے سے اونچا ہوتا ہے تو تواضع کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔

آثارِ لباس...... اسی واسطے سلاطین اور بادشاہوں کا لباس آپ نے دیکھا ہوگا کہ ان کے لباس تین تین گز ادھر ادھر پڑے ہوتے ہیں۔ کندھے پر قباء ہے اور دو دو گز ادھر ادھر بکھری ہوئی پڑی ہے۔ یہ انتہائی کبر و نخوت اور رعونت کی دلیل ہوتی ہے۔ شریعت نے اس کو ناجائز اور ممنوع قرار دیا کہ بندے کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ بندگی کو چھوڑ کر کوئی دوسرا کام جو منافیِ بندگی ہو کرے۔ لباس کا زمین پر پھیلا ہوا رہنا کبر کی علامت ہے اور لباس کا اونچا رہنا یہ تواضع کی علامت ہے، اس میں تزئین کم ہوتا ہے۔ اس میں زینت زیادہ ہوتی ہے۔ جتنی زینت بڑھ جائے گی تبختر اور اتراہٹ پیدا ہوگی، کبر و نخوت پیدا ہوگی، کبر و نخوت کے لئے راستہ صاف ہو گیا۔

اور اگر زینت میں کمی ہے، یعنی جمال تو ہے، تزئین نہیں ہے۔ جمال کے معنی صفائی ستھرائی، موٹا کپڑا، لیکن آدمی اگر بناؤ اور سنگھار میں لگ جائے، اسی سے کبرِ نفس کی طرف طبیعت جاتی ہے۔ عورت چوں کہ محلِ زینت ہے، اس واسطے عورتوں میں تکبر زیادہ ہوتا ہے۔ مرد چوں کہ زینت کم اختیار کرتے ہیں، اس لئے عورتوں کی نسبت متکبر کم ہوتے ہیں۔ متواضع زیادہ ہوتے ہیں۔ تو عورت میں ناز و نخرہ اور کبر و نخوت زیادہ ہوتی ہے۔ کیوں کہ وہ محلِ زینت ہوتی ہے۔ اور مرد محلِ شجاعت اور محلِ ہمت ہے۔ اگر مرد بھی محلِ زینت بننے لگے تو مرد اور عورت میں فرق نہیں رہے گا۔ اگر مرد اسی طرح بناؤ سنگھار کرنے لگے جس طرح عورتیں کرتی ہیں، تو ان میں کبرِ نفس پیدا ہوگا، جتنا زینت کو چھوڑ کر تجمل اختیار کریں گے، اتنی تواضع پیدا ہوگی۔ تزئین بناؤ سنگھار کو کہتے ہیں اور تجمل صفائی ستھرائی، ڈھنگ اور طریقے کو کہتے ہیں۔ تو شریعت نے تجمل کا حکم دیا ہے یعنی موٹا کپڑا پہنو مگر صاف ستھرا ہو اور جمال کی شان ہو، اور

---

① الصحیح للبخاری، کتاب المناقب، باب قصۃ البیعۃ و الاتفاق علی عثمان، ج: ۱۲، ص: ۵۳، رقم: ۳۴۲۴۔

ایک زینت ہے یعنی بناؤ سنگھار کرنا، یہ عورتوں کے لئے مخصوص کی گئی۔ تو عورتیں متکبر زیادہ ہوتی ہیں۔ اس کا علاج دوسرے ڈھنگ سے بتلایا گیا۔ عورت سے زینت ترک نہیں کرائی بلکہ زینت کا حکم دیا گیا۔ اس واسطے کہ زینت سے محبت کا تعلق ہے۔ اور یہ مطلوب ہے کہ عورت خاوند کی محبوب بنے۔ اس کو محبت اور تعلق رہے۔ اگر خاوند میں بیزاری پیدا ہوئی تو گھر اور معاشرتِ منزلی تباہ ہو جائے گی۔ اس لئے مرد کو عورت کا محب بنانا چاہا ہے اور عورت کو مرد کا محبوب بنانا چاہا ہے۔ اس لئے عورتوں کے لئے زینت کا حکم دیا ہے۔

اسی واسطے فقہاء لکھتے ہیں کہ اگر عورت سارے سفید کپڑے پہن لے تو یہ مکروہ ہے، کوئی نہ کوئی کپڑا رنگین ہونا چاہئے تاکہ زینت کی شان اس کے اندر پیدا ہو۔

حرفِ آخر...... بہرحال شروع میں میں نے یہ عرض کیا تھا کہ کوئی منضبط بات تو ہے نہیں، منتشر چیز ہے۔ مگر مختلف مسائل آ گئے۔ اب وقت بھی پورا ہو گیا۔ جمعہ پر بات چلی تھی کہ جمعہ یوم جامع ہے۔ معلوم نہیں ادھر کس طرح نکل آیا۔ بس اللہ کا حکم تھا ادھر نکل آیا۔ جمعہ کے متعلق جو بیان کرنا تھا، وہ رہ گیا۔ پھر کبھی آنا ہوا تو اس کی تقریر ہو جائے گی۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

الہامی ادارہ اور اس کے فضلاء کی تنظیم

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ۔ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا۔

اَمَّا بَعْدُ...... فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قیام دار العلوم، اسباب ومحرکات ...... بزرگان محترم! دار العلوم دیوبند جس کا نام آپ کل سے بار بار سن رہے ہیں اور یہ تمام اکابر جو اس وقت یہاں (دار العلوم حقانیہ کے سالانہ اجلاس میں) آپ حضرات کے سامنے جمع ہیں۔ اسی دار العلوم دیوبند کے اجزاء واعضاء ہیں۔ دار العلوم کے ارکان ہیں۔ ان ہی حضرات کے اجتماع کا نام دار العلوم دیوبند ہے، خواہ وہ دار العلوم دیوبند کے اندر ہوں یا باہر ہوں۔

دار العلوم دیوبند کا قیام رسمی طور سے عمل میں نہیں آیا کہ چند آدمی شہر کے ذمہ دار حضرات جمع ہوئے اور ایک ادارہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ صورت نہ تھی بلکہ صورت یہ تھی کہ انگریزوں کا تسلط واقتدار ہندوستان میں آیا۔ دین کی کسمپرسی کا حال سب کے سامنے ہوا۔ خدشہ یہ ہوا کہ اسلام شاید اب باقی رہے یا نہ رہے۔ تو اس وقت جتنے اولیاء اور اکابر تھے۔ یک دم ان کے قلوب میں وارد ہوا کہ ایسا کوئی ادارہ ہونا چاہئے جس کے ذریعے سے دین اور علم دین باقی رہے۔ دین کی حفاظت کی جا سکے۔ اگر یہ باقی رہے تو تمام چیزیں اسلام اور مسلمان کی باقی رہ سکتی ہیں اور اگر دین وعلم دین باقی نہ رہے تو خدانخواستہ مسلمان مسلمان نہ رہ سکیں گے۔

دین کی بقاء علم دین کی بقاء سے ہو سکتا ہے اور اگر یہ باقی نہ رہے اور مسلمانوں کی قوت وشوکت باقی بھی ہو تو قابل اعتناء نہیں۔ تو وقت کے تمام اہل اللہ کے قلوب میں وارد ہوا کہ ایسا ادارہ ضروری ہے۔ ایک مجلس میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ اکابر جمع ہوئے تھے۔ دین کے بارے میں فکر دامن گیر تھی۔ تو کسی نے کہا کہ میرے قلب پر وارد ہوا ہے کہ مدرسہ قائم ہو۔ کسی نے کہا کہ مجھے کشف ہوا ہے کہ مدرسہ قائم ہونا چاہئے۔ غرض تمام اولیاء اللہ کا اجماع منعقد ہوا کہ ادارہ قائم ہو۔ تو ایک رسمی صورت نہ تھی۔ بلکہ غیبی اور باطنی صورت تھی، الہامی اور کشفی صورت تھی۔ چناں چہ الہام خداوندی کے تحت اس مدرسے کا قیام عمل میں آیا۔

حضرت مولانا یٰسین صاحب دیوان جی حضرت قاسم العلومؒ کے خادم خاص اور معتمد علیہ تھے۔ جب حج کو گئے۔ مکہ معظمہ میں حضرت امداد اللہ صاحب قدس سرہ، کی خدمت میں جانا ہوا جو پورے مشائخ کے شیخ اور مرشدِ طریقت تھے۔ تو رخصت کے وقت عرض کیا کہ ہمارے مدرسہ کے لئے بھی دعا کریں۔ حضرت حاجی صاحب نے یہ سن کر تعجب سے جواب میں فرمایا، چہ خوب، پیشانیاں تو برسوں ہم نے رگڑیں راتوں بھر سجدے ہم نے کئے دعائیں ہم نے مانگیں، اب جب مدرسہ قائم ہوا تو مدرسہ آپ کا ہو گیا اور پھر فرمایا کہ ہمارا خیال مدرسے کا تھانہ بھون یا نانوتہ میں قائم کرنے کا تھا، ہمیں کیا خبر تھی کہ دیو بند والے یہ غنیمت لے اڑیں گے۔ تو مدرسہ دیو بند کا قیام ہنگامی حالات اور مشورہ سے نہیں ہوا۔ بلکہ اکابر کی گردنیں جھکی ہوئی تھیں۔ سجدے کئے جا رہے تھے۔ راتوں کو دعائیں مانگی جا رہی تھیں۔ حق تعالیٰ نے قبول فرمایا، معلوم ہوا کہ الہام غیبی سے مدرسہ قائم ہوا۔

خشتِ اوّل...... اس ادارہ کی عمارت کی سب سے پہلی اینٹ حضرت مولانا اصغر حسین صاحب دارالعلوم کے جلیل القدر استاد کے نانا میاں جی منے شاہ نے رکھی، ان کا نام محمد حسین رحمۃ اللہ علیہ تھا۔ میاں جی مرحوم کے بارے میں حضرت مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ: میں آج پہلی اینٹ ایک ایسے شخص سے رکھواؤں گا کہ جسے کبھی بھی عمر بھر صغیرہ کے درجہ میں بھی گناہ کا تصور نہیں ہوا۔ استغراق اور ربودگی کی یہ کیفیت طاری تھی کہ اپنی اولاد تک کو نہ پہچانتے۔ ان کے داماد تھے، اللہ بندہ نام تھا۔ جب ان کی خدمت میں آتے تو پوچھتے کون؟ تو جواب دیتے۔ اللہ بندہ، پھر پوچھتے کون؟ تو جواب دیتے آپ کا داماد ہوں، دس منٹ بعد پھر وہی استغراق۔ یہ کیفیت استغراق کی جاری رہتی، نہایت ہی پاک طینت بزرگ تھے۔ جب انتقال ہوا اور غسل کے لئے تختے پر لٹائے گئے۔ تو چشم دید واقعہ مولانا محمد یٰسین صاحب نے سنایا، جو میرے فارسی کے استاد تھے اور آپ کے پاکستان کے مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کے والد ماجد تھے۔ انہوں نے خود سنایا کہ تختے پر لٹاتے ہی میاں صاحب ایک دم کھل کھلا کر ہنسنے لگے۔ شور مچ گیا تو لوگ دوڑ پڑے۔ جب مجمع زیادہ ہوا تو ہنسنا بند ہوا تو اسی قماش کے لوگ تھے۔ جنہوں نے دارالعلوم کی پہلی اینٹ رکھی پھر حضرت گنگوہیؒ، حضرت نانوتویؒ، حضرت قاضی محمد اسماعیل صاحب منگلوریؒ اور دوسرے اکابر نے بعد میں اینٹ رکھی۔ ظاہر ہے کہ اینٹ رکھنے والے ایسے اولیاء اللہ اور روحانیت میں ڈوبے ہوئے ایسے لوگ ہوں تو اس مدرسہ کی بنیادیں کتنی مضبوط ہوں گی۔ آج بحمد اللہ اس پر سو برس کے قریب زمانہ گذر گیا ہے۔ ہزاروں مصائب آ آ کر ختم ہوئے اور وہ مدرسہ ترقی کرتا گیا۔ برابر بڑھتا جا رہا ہے اور آج تک اسی آب و تاب سے قائم ہے۔ یہ ایک رسمی بات ہے کہ فلاں شخص وہاں کا مہتمم ہے، عہدیدار ہے یا مدرس ہے اور اسے ترقی دیتا ہے، یہ غلط اور محض ایک تہمت ہے۔ ترقی دینے والی غیبی طاقت ہے، سب کچھ اللہ تبارک و تعالیٰ کرتا ہے۔

مرکزِ روحانیت...... میں نے حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی سے سنا، فرماتے تھے کہ دارالعلوم آدمیوں کو بناتا ہے۔ آدمیوں نے دارالعلوم کو نہیں بنایا۔ یہ ایک کسوٹی ہے، پرکھ ہے، یہاں دارالعلوم کے ہزاروں

فضلاء ہیں اور مدارس قائم کئے ہوئے ہیں، میں برما گیا تو دارالعلوم کے فیض یافتہ موجود۔ افغانستان گیا تو سینکڑوں علماء موجود اور قصبہ قصبہ آباد ہے۔ مدارس قائم کر چکے ہیں۔ یہاں کثرت سے فضلاء سرگرمی سے اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں، ان سب کا رجوع دارالعلوم کی طرف ہے۔ یہ اس ماحول کے آثار ہیں۔ وہاں کی غیبی طاقت ہے کہ سب کا تعلق اور رجوع اس مرکز کی طرف ہے۔ وہاں کے فضلاء کہتے ہیں کہ جب ہم دارالعلوم سے جدا ہوئے تو یوں محسوس ہوا کہ جیسے ماں کی گود سے جدا ہونے کی حالت ہے، گویا ایک جاذبیت ہے، روحانیت ہے اور دارالعلوم مرکزِ روحانیت بن گیا ہے۔

دارالعلوم کی شانِ تجدید..... حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ: یہ جو حدیث شریف میں آتا ہے ”اِنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ لِهٰذِهِ الْاُمَّةِ عَلٰى رَأْسِ كُلِّ مِائَةِ سَنَةٍ مَّنْ يُّجَدِّدُ لَهَا دِيْنَهَا.“ ①

ہر ایک صدی میں کوئی نہ کوئی مجدد آئے گا۔ جو دین کو نکھارے گا۔ عقائد و اعمال اور کلیاتِ دین میں لوگ جو فرق و خرابی ڈالیں گے مجدد ہر صدی میں آ کر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر دے گا، تو فرمایا کہ مجدد کے لئے فردِ واحد ہونا شرط نہیں۔ جماعت بھی مجدد بن سکتی ہے اور فرمایا کہ دارالعلوم کے بانی حضرت نانوتویؒ اور حضرت گنگوہیؒ اور حضرت حاجی صاحبؒ ان سب کی حیثیت مجدد کی سی ہے اور ان حضرات کا مظہرِ اتم دارالعلوم ہے۔ گویا دارالعلوم کی حیثیت مجدد کی سی ہے۔ جس نے بدعت و سنت کو الگ الگ کیا۔ دین کو غلط ملط، غل و غش سے پاک صاف کر دیا۔ مسائل میں جو غلط لوگوں نے کیا تھا، اسے نکھار نکھار کر پاک صاف کر دیا۔ یہ ایک کیفیت ہے دارالعلوم کی۔

مرکزِ اتحاد..... مادی چیزوں میں تغیر اور انتشار ہوتا ہے۔ روحانیت میں قدرتی طور پر اجتماع ہوتا ہے اور دارالعلوم کی بنیاد روحانیت پر ہے۔ مادہ کا خاصہ ہی تغیر ہوتا ہے اور روحانیت میں ایسا نہیں ہوتا، ایک شیخ کے مرید، ایک استاد کے شاگرد قدرتی طور پر مجتمع رہتے ہیں۔ آپس میں جڑے رہتے ہیں۔ اسی طرح دارالعلوم کے فضلاء کے قلوب ایک مرکز سے وابستہ ہیں اور حقیقی طور سے وابستہ ہیں۔

جو اتحاد کا مرکز ہے تو قدرتی طور پر ان کا آپس میں اتحاد قائم ہے۔ میں نے حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سنا کہ حضرت نانوتویؒ جب تک حیات تھے، ان کی سرپرستی دارالعلوم کو حاصل تھی۔ تو کیفیت یہ تھی اور ہماری حالت یہ تھی کہ لوگ اختلاف کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ہمارے دلوں میں افتراق کا خیال بھی نہیں آتا تھا اور جب ان کی وفات ہوئی اور حضرت گنگوہیؒ کی سرپرستی آئی تو اگر کچھ اختلافات اٹھتے بھی۔ مگر حضرت گنگوہیؒ کی روحانیت کی وجہ سے ختم ہو جاتے۔ ان کی روحانی طاقت انہیں دبا دیتی اور قوت مجتمع رہتی۔

تنظیم کی ضرورت..... پھر خلفاء کے زمانے میں مراکز الگ الگ ہوئے۔ مرکز خلفاء بن گئے۔ مگر قوت مجتمع تھی۔ مریدین آپس میں مجتمع تھے۔ اس وقت سوال پیدا ہوا کہ مراکز کے اختلافات کی وجہ سے رسمی طور سے تنظیم

---

① السنن لابی داؤد، کتاب الملاحم، باب ما یذکر فی قرن المائة، ج: ۱۱، ص: ۳۶۲، رقم: ۳۷۴۳.

ہونی چاہئے تاکہ رسمی طور پر بھی ایک اتفاق پیدا ہو جائے۔ ایک نظام اور تنظیم کی ضرورت محسوس ہوئی کہ مرکز پر سب متحد رہیں۔ ورنہ مشائخ کے الگ الگ ہونے کی وجہ سے صورتِ اختلاف تشتت وظاہری پراگندگی نمایاں ہو جاتی ہے۔ گو وہ درحقیقت مذموم نہ ہو۔

اس وقت بزرگوں کے دلوں میں وارد ہوا کہ تنظیم ابنائے دارالعلوم دیوبند ہونی چاہئے۔ یہ تنظیم ابنائے قدیم آج کی نہیں، ہاں زیادہ قوت اس تنظیم میں ابھی چند سال ہوئے کہ پیدا ہوئی، ورنہ مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ نے میرے والد ماجد مولانا حافظ محمد احمد صاحب مرحوم کے زمانے میں جب کہ دارالعلوم ان کے ہاتھ میں تھا۔ اس کی ضرورت محسوس کی۔ زیادہ قوت سے اس کی ضرورت اب محسوس کی گئی۔ یہ تنظیم کوئی سیاسی تنظیم نہیں، نہ سیاسی مقاصد اس کے ساتھ متعلق ہیں۔

مقصدِ تنظیم...... بلکہ اس تنظیم کا مقصد یہ ہے کہ جو کچھ فضلاء دینی علمی قابلیتوں سے عظیم کام انجام دے رہے تھے۔ ان کو منظم کیا جائے تاکہ زیادہ موثر ثابت ہو سکیں۔ آج ہزاروں کی تعداد میں دارالعلوم کے فضلاء ہیں، فیض یافتہ ہیں جو دین کو سنبھالے ہوئے ہیں۔ مختلف ممالک میں اس کے فضلاء پھیلے ہوئے ہیں۔

جہاں تک مدارس کا تعلق ہے تو کوئی قصبہ ایسا نہیں جو ان سے خالی ہو۔ ان سو برس میں جتنی خدمت اس ادارے نے کی، کوئی نظیر اس کی نہیں۔ جہاں تک تصانیف کا تعلق ہے۔ ہزار ہا ہزار تصانیف اس جماعت کی مختلف مسائل پر موجود ہیں۔ ایک حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھا جائے تو ایک ہزار تصانیف اپنے ترکے میں چھوڑ گئے۔ ہر زبان میں تصانیف، ہر علم میں، ہر فن میں تصنیفات موجود ہیں۔ نظم میں موجود ہیں، نثر میں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ ایک ہزار کے قریب مواعظ الگ چھوڑ گئے۔ کچھ چھپ گئے ہیں، کچھ باقی ہیں۔ گویا ایک ایک فرد نے ایک ایک امت کے برابر کام کیا ہے۔ حضرت شیخ الہند قدس سرہ کے مرید و متوسل ہزاروں کی تعداد میں ہیں۔ اسی طرح حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہ کے ہزار ہا شاگرد، مریدین اور متوسلین ملک کے اطراف واکناف میں پھیلے ہوئے ہیں۔ حضرت تھانویؒ کے مریدین ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں الگ پھیلے ہوئے ہیں۔ سب اپنے رنگ میں دین کا کام کر رہے ہیں۔ حدیث، فقہ، فتویٰ، تفسیر، عمل جہاد ہر میدان میں اس جماعت کے لوگ نمایاں نظر آئیں گے غرض یہ کہ ہزاروں لاکھوں افراد کے ایمان کو سنبھالے ہوئے ہیں۔ کام سب سے بڑھ کر، خدمت کے میدان میں تمام جماعتوں سے آگے اور زیادہ۔ ہر دیہات میں کوئی نہ کوئی فاضل موجود ہے۔ شہرت نہیں، اخباروں اور رسالوں میں نام نہیں۔ مگر ہزاروں کے ایمان کو سنبھالے اور خود بھی سنبھلے ہوئے ہیں۔ اب آپ کے اکوڑہ خٹک میں حضرت مولانا عبدالحق صاحب سلمہٗ اللہ تبارک وتعالیٰ ایک ہی شخصیت نے دارالعلوم قائم کیا۔ یہ ہزاروں لوگ علماء ومشائخ جو اس وقت یہاں (دارالعلوم حقانیہ میں) نظر آ رہے ہیں۔ یہ ان کی نہیں بلکہ دارالعلوم دیوبند کی خدمت ہے۔ ایک شخص کے ساتھ ہزاروں لوگوں کا دین وابستہ ہے۔ مگر رسمی طور پر اگر کسی

نے کہا کہ دارالعلوم دیوبند نے کیا خدمات انجام دی ہیں۔ اس کے فارغین کیا کیا کام کر رہے ہیں۔ تو چوں کہ انتشار ہے۔ منظم نہیں ہیں۔ تو صحیح خدمات آپ نہیں بتلا سکتے۔ اگر چہ خدمتیں بے شمار ہیں۔ آپ اجمالاً بیس ہزار کی تعداد کہہ سکیں گے۔ مگر یہ معلوم نہ ہوگا کہ ان بیس ہزار علماء وفضلاء نے کیا کام کر دکھایا۔ مورخ بھی اجمالاً ذکر کر دے گا۔ مگر تفصیلی طور سے اسے کچھ معلوم نہ ہوگا۔ دنیا کو اجمالاً بھی پتہ نہ چل سکے گا۔

تنظیمِ خدمات...... لہٰذا اسی مقصد کے لئے شعبۂ تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم کی بنیاد رکھی گئی تا کہ دارالعلوم کی روحانی ذریت کے کارنامے منضبط ہو سکیں۔ مقصد خدمات کی تنظیم ہے۔ افراد کی تنظیم نہیں۔ اس کے لئے ایک فارم تیار کیا گیا جس کی سرخیاں میں نے خود لکھیں کہ ہر فاضل اس کی خانہ پری کر کے بھیج دے، اس کی مدت فراغت اور کہاں اقامت ہے۔ تصنیف وتالیف کے کیا اور کون سے کام کئے۔ جائے سکونت اور بیعت وارشاد کے بارے میں سوالات لکھے گئے۔ الحمد للہ کہ ڈھائی تین ہزار فارم پُر ہو کر آ گئے اور یہ خدمات اور کارنامے اگر کتابی شکل میں شائع ہو گئے۔ تو معلوم ہو جائے گا کہ ان حضرات نے دنیا کو دین وایمان سے بھر دیا ہے اور پھر ان حضرات کے وعظ وارشاد، تعلیم وتبلیغ سے اور ہزاروں متکلم، خطیب، شیخ طریقت، واعظ، مبلغ تیار ہوئے۔ اب اسی مقصد کے لئے یہ ادارہ قائم کیا جا رہا ہے۔ کہ ماہنامہ دارالعلوم کے چار صفحات اسی غرض کے لئے مخصوص کر دیئے جائیں کہ ان میں دارالعلوم کے فضلاء کا ذکر ہو۔ سن وار ان کے حالات اور کارنامے بیان کر دیئے جائیں۔ یہ دین اور علمِ دین اور علماء کی ایک عظیم الشان تاریخ ہوگی۔

وسعتِ دارالعلوم...... دارالعلوم اس چار دیواری کا نام نہیں۔ اس تمام نظام مسلک، تحریک اور خدمات کا نام ہے۔ جو ہند و بیرونِ ہند میں قائم ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ میں نے مولانا حبیب الرحمٰن صاحب سے ذکر کیا کہ بریلی میں ایک مدرس ہیں۔ جو دارالعلوم کے نمایاں فاضل ہیں۔ انہیں دارالعلوم میں بلا لیں، مولانا خاموش رہے، چپ ہو گئے۔ تین دفعہ عرض کیا گیا، پھر عرض کیا کہ آپ کیوں رکاوٹ کرتے ہیں، فرمایا ان کو بلانا غلط ہے۔ اس لئے کہ جو فاضل جہاں بیٹھا ہے وہاں دارالعلوم دیوبند قائم ہے، اسی طرح گویا ہر شہر وقصبہ میں دارالعلوم قائم ہے۔ یہ دارالعلوم دیوبند کی وسعت ہے، آپ فاضل کو بلا کر دارالعلوم کے دائرے کو سمیٹ کر محدود کر رہے ہیں اور میں سمیٹنا نہیں چاہتا، یہ ساری روحانی اولاد اسی دارالعلوم کی ذریت ہے۔ کسی کا ایک بچہ رہ جاتا ہے کسی کے دو کسی کے تین۔ دارالعلوم کے لاکھوں بیٹے ہیں۔ لاتعداد اولاد ہے اور جائز اولاد ہے۔ ترکے اور میراث کے وارث ہیں۔ اور یہ ترکہ اخلاق ہیں، اعمال ہیں، علوم ہیں، معارف ہیں جو انبیاء علیہم السلام کا ترکہ ہوتا ہے۔ اور اس ترکہ میں ہر ایک کو بقدرِ ظرف حصہ ملا ہے۔

معیارِ اہتمام...... حضرت مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو دارالعلوم کے مہتمم اور امی محض تھے، منقطع عن الخلائق، صاحبِ کشف وکرامت بزرگ تھے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے بلا کر مجبور کیا۔ دارالعلوم کے

اہتمام کے لئے، فرمایا! میں تو محض اُمّی ہوں، نہ لکھنا جانتا ہوں نہ پڑھنا، فرمایا اس کا تعلق لکھنے پڑھنے سے نہیں بلکہ قلب سے اس چیز کا تعلق ہے۔ چنانچہ مولانا اہتمام کے لئے بیٹھ جاتے اور جو کچھ لکھواتے، لکھ دیا جاتا اور اس پر مولانا کی مہر لگائی جاتی تھی۔ بہر حال حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے فرمایا کہ ادارہ بڑا ہے، میں اس ذمہ داری کو کس طرح سنبھال سکوں گا اور اتنا تحمل کس طرح کر سکوں گا۔

معیارِ طلباء...... اس واقعہ سے پہلے ان کا ایک اور واقعہ سنئے۔ حضرت مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اہتمام کے زمانے میں دار العلوم میں پچاس ساٹھ طالب علم تھے۔ چوبیس پچیس طلبہ مطبخ سے کھانا لیتے تھے۔ یہ کل کائنات تھی۔ حضرت مولانا دار العلوم کے احاطہ مولسری میں کھڑے تھے۔ ایک طالب علم شوربہ کا پیالہ لایا، اور غصہ سے مولانا کے سامنے پٹخ دیا اور کہا یہ سالن ہے یا پانی ہے۔ یہ کھانا مطبخ سے کھلاتے ہو؟ بے ادبی کے الفاظ بھی استعمال کئے۔ کہا کہ یہ ہے آپ کا اہتمام؟ مولانا نے تین مرتبہ سر سے پاؤں تک اس طالب علم کو دیکھا اور فرمایا یہ مدرسہ کا طالب علم نہیں۔ لوگوں نے کہا مدرسہ کا طالب علم ہے، یہاں مقیم ہے، مطبخ سے کھانا لیتا ہے، فرمایا کچھ بھی ہو مدرسہ کا طالب علم نہیں۔ طلبہ چپ رہے، دو تین دن کے بعد تحقیق سے معلوم ہوا کہ واقعی مدرسہ کا طالب علم نہیں تھا۔ اس نام سے دھوکہ دے کر مدرسہ سے کھانا لینے کے لئے داخل ہوا تھا، اہل مدرسہ نے آپ سے پوچھا۔ حضرت آپ کو کس طرح معلوم ہوا کہ مدرسہ کا طالب علم نہیں۔ فرمایا کہ جب مدرسہ کا اہتمام میرے سپرد ہوا پریشانی ہوئی کہ کس طرح یہ کام سنبھالوں گا۔ اس عالم میں رات کو خواب دیکھا۔ صاحبِ دل اور عارفِ ربانی تھے اور صاحبِ دل کا خواب آدھا خواب اور آدھا کشف ہوتا ہے۔

تو فرمایا کہ میں نے مولسری کے کنویں کو دیکھا کہ کنواں دودھ سے بھرا ہوا ہے۔ اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کی من پر بیٹھ کر دودھ تقسیم فرما رہے ہیں۔ کسی کو لوٹا بھر کر دے رہے ہیں، کسی کو دیگ میں، کسی کو بالٹی میں مل رہا ہے اور کوئی پیالہ بھر رہا ہے اور جس کے ساتھ برتن نہیں تو چلو میں ہی پی کے چلا گیا۔ اپنے اپنے ظرف کے مطابق لوگ دودھ بھر کے لے جا رہے ہیں۔ ہزاروں کی تعداد ہے، آنکھ کھل گئی تو میں نے مراقبہ کیا۔ تعبیر کے لئے منکشف ہوا کہ یہ کنواں صورت مثالی ہے علم کی اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم صورت مثالی ہیں قاسم العلم کی جو تقسیم کر رہے ہیں علم کو اور یہ لے جانے والے طلبہ ہیں جو بقدرِ ظرف لیتے جا رہے ہیں۔ اب اس سے زیادہ عجیب بات یہ کہ حضرت مولانا نے فرمایا کہ: جب شوال کا داخلہ ہوتا ہے تو میں فوراً طلبہ کو پہچان لیتا ہوں کہ یہ طلبہ کے اس مجمع میں موجود تھا۔ اب جب یہ طالب علم آیا تو میں نے اوپر سے نیچے تک اس پر نگاہ ڈالی، معلوم ہوا کہ یہ اس مجمع میں نہیں تھا۔

الہامی طریقے سے اس کا علم ہوا۔ معلوم ہوا کہ دار العلوم کے طلبہ کا انتخاب بھی خدا کی طرف سے ہوتا ہے، جہاں بھی کام کرتے ہیں غالب آتے ہیں۔ غلبہ پر ایک واقعہ یاد آیا۔ مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا کہ ہمارے زمانہ میں چودہ طالب علم دورہ حدیث میں تھے دستار بندی کی تجویز ہوئی، یہ دار العلوم کا دوسرا جلسہ تھا۔ ہمیں

بھی پگڑی باندھنے کا ارادہ کیا گیا تو ان چودہ طالب علموں نے آپس میں مشورہ کیا کہ جلسہ کو رکوانے کی کوشش کرنی چاہئے۔ کیوں کہ ہم اُنہیں کو پگڑی بندھوائی جائے گی اور ہم اہل نہیں، جس سے مدرسہ کی بدنامی ہوگی۔ غرض ان چودہ طالب علموں نے مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا کہ جا کر حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ سے جلسہ رکوانے کی درخواست پیش کریں، حضرت مولانا یعقوب صاحب دارالعلوم کے اول صدر مدرس تھے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ جب ان کی خدمت میں پہنچے تو مولانا محمد یعقوب صاحب مطالعہ فرما رہے تھے کتابوں کا۔ حضرت تھانوی نے ہیئت بھی اس وقت کی بتلادی کہ میں جب حجرہ میں گیا تو ڈیسک پر کتاب رکھی ٹیک لگائے بیٹھے تھے اور بہت گہرے طریقے سے مطالعہ کر رہے تھے کتابوں سے نگاہ اٹھائی، ان کا رعب اتنا تھا کہ ہر ایک برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ پوچھا خیر تو ہے کیسے آنا ہوا؟ حضرت تھانوی نے فرمایا کہ میں نے درخواست پیش کی کہ دیوبند میں جلسہ دستار بندی ہو رہا ہے، اگر یہ حکم ہو تو تعمیل سے انکار نہیں اور اگر کہنے کا موقع ہو تو ہماری درخواست ہے کہ ہم اس کے اہل نہیں، نالائق ہیں، پورا مدرسہ اور ہمارے اکابر و اساتذہ بدنام ہو جائیں گے۔ جلسہ روک دیا جائے اور ہماری نالائقیوں سے پردہ نہ ہٹایا جائے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے عیوب پر پردہ ڈالا جائے، یہ سن کر حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کو جوش رحمت آیا، فرمایا یہ تمہاری نالائقی کا احساس تمہاری سعادت مندی کی علامت ہے۔

جب آدمی میں اپنی نالائقی کا احساس آ جائے تو یہ اس کے کمال و فضیلت اور سعادت مندی کی دلیل ہے اور ہم جو یہ جلسہ کریں گے تو وہاں اعلان کریں گے کہ فیما بیننا و بین اللہ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ یہ لوگ ہمارے نزدیک اہل ہیں قابل ہیں، اور جس کی مرضی ہو ان کا کسی فن میں بھی امتحان لے لے۔ حضرت تھانوی نے فرمایا کہ: ہم لوگ اور بھی ڈر گئے کہ آئے تھے جلسہ رکوانے کے لئے اور یہاں امتحان دینے کا الگ کہا گیا۔ بہرحال ہم وہاں سے چلے گئے۔ جاتے وقت حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک جملہ فرمایا کہ دنیا گدھوں سے بھری پڑی ہے۔ جہاں بھی تم جاؤ گے وہاں تم ہی تم ہو گے تمہارا ہی غلبہ ہوگا۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ہم نے تجربہ کیا کہ جہاں گئے، ہم ہی ہم نظر آئے جہاں گئے غالب ہی غالب رہے کیوں کہ حق ہی کو غلبہ ہے۔ "اَلْـحَـقُّ یَعْـلُوْا وَلَا یُعْلٰی" غالبیت کے لئے حق ہے اور مغلوبیت کے لئے باطل ہے۔ بہرحال یہ ہے فضلاء دیوبند کی تنظیم جو در اصل خدمات کی تنظیم ہے۔

تنظیم کے فوائد...... دوسرا فائدہ اس میں یہ ہے کہ کچھ خدمات مرکز کی ہیں، کچھ فضلاء کی۔ دونوں کے سامنے خدمات ہیں۔ اس واسطے بھی تنظیم ہونی چاہئے کہ مرکز کو فضلاء کی خدمات کا پتہ لگے اور فضلاء کے سامنے مرکز کی خدمات آتی رہیں۔ اگر فضلاء کو کسی مدد کی ضرورت و حاجت ہو تو ادھر مرکز کو پتہ لگے اور اس کے لئے سوچے اور مرکز کی ضرورتوں کا علم فضلاء کو ہو۔ غرض جانبین سے ایک رابطہ قائم رہے گا۔ ہندوستان میں دیکھا گیا کہ فتنے اٹھتے ہیں، علمی فتنے، عملی فتنے، اور ہر قسم فتنے کے اٹھتے ہیں۔ فضلاء دیوبند نے مقامی طور پر ان فتنوں کا مقابلہ کیا اور ان

فتنوں کو مغلوب کیا۔ مرکز کو پتہ نہیں کہ فضلاء نے کیا خدمات انجام دیں اور فضلاء کو یہ شکایت رہتی ہے کہ ہم بڑے بڑے کام کر رہے ہیں۔ لیکن مرکز ہماری خبر نہیں لیتا، ہماری تحسین نہیں کرتا۔ تو اس غرض سے تنظیم کا سلسلہ قائم کیا گیا کہ اگر ضرورت پڑے گی تو آپس میں اجتماعی آواز ہوگی، ان کی حمایت میں آواز اٹھے گی یا مرکز کوئی شخص ان کی امداد کے لئے بھیج سکے گا۔ جماعتی آواز کا اثر اور طاقت ہوگی، دین کا فائدہ ہوگا، قوم کو فائدہ ہوگا، تو یہ تنظیم خدمات کی ہے افرادی نہیں۔ اس صورت میں خدمات زندہ جاوید رہیں گی۔ منظم ہونا قوم کو ہر حیثیت سے مفید رہے گا۔ باہمی تعاون جاری رہے گا۔ خدمات کا انضباط کیا جا سکے گا کہ کہاں کہاں اور کیا کیا خدمات انجام دی جا رہی ہیں۔ اس کی ضرورت اس وجہ سے بھی پیش آئی کہ مختلف چھوٹی چھوٹی جماعتوں نے دعوے بہت کئے اور کام بہت تھوڑا کیا یا بالکل نہیں کیا، معمولی خدمات مگر نمائش زیادہ۔ ہمارے ہاں کام ہوتا ہے۔ مگر نہ اخبارات نہ اشتہارات اور دعویٰ یہ لوگ کرتے ہیں کہ ہندوستان کو ہم نے سنبھالا ہے، ہمارے اکابر کے ہاں کام ہے تو ہم نہیں، پروپیگنڈہ نہیں، لوگ چھوٹی چھوٹی خدمات اخبارات میں دیتے ہیں، میں سوچا کرتا ہوں کہ دارالعلوم میں روزانہ جلسے ہوتے ہیں لیکن کسی کو خبر نہیں ہوتی۔ جتنے لوگ اشتہارات منصوبوں اور پروگرام کے بعد کسی جلسے میں جمع ہوتے ہیں۔ وہاں بلا کسی منصوبہ، آئے دن اتنے لوگ جمع ہو جاتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی جماعتیں ہیں مگر پروپیگنڈہ بہت ہے، کام کے درجہ میں صفر ہوتے ہیں۔ کئی لوگ دارالعلوم کو جاننے والے نہیں کہ کیا خدمات انجام دیں۔ اس تنظیم میں ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ مرکز میں بھی انبساط ہوگا اور فضلاء کا دل الگ بڑھے گا۔ خدمتیں نمایاں ہو کر سامنے آئیں گی اور بھی کئی قسم کے فوائد ہیں۔ یہ صورت پیش آئی کہ تنظیم ہونی چاہئے اس کے لئے کئی قواعد وضوابط منضبط کئے گئے۔ تنظیم کو صوبہ وار پھر ضلع وار رکھا گیا کہ فضلاء دارالعلوم علاقہ وار جمع ہو کر ایک ذمہ دار مقرر کریں، صدر بنائیں۔ سیکرٹری منتخب کریں۔ یہ خیال زیادہ اس وجہ سے بھی پیدا ہوا کہ اکابر نے ارادہ کیا۔

اجلاسِ صد سالہ...... ایک جلسہ دستار بندی کا بھی ہو جائے بتقریباً پچاس برس سے جلسۂ دستار بندی نہیں ہوا۔ ۱۲۸۳ھ سے لے کر اب تک درج رجسٹر فضلاء کی تعداد چھ ہزار تک ہے۔ ان چھ ہزار علماء کی دستار بندی کرائی جائے۔ اس واسطے اشتہارات جاری کئے گئے۔ ایک مستقل دفتر قائم کیا گیا کہ اس تنظیم کے نظم ونسق کو سوچیں۔ ترتیب دیں۔ اس کے اعلانات جاری کئے گئے تو ملک میں اس کا شہرہ ہوا۔ ملک میں اس کا شدید انتظار ہے۔ بیرونِ ملک کے لوگ بھی منتظر ہیں۔ کیوں کہ ان میں حجازی بھی ہیں، ایشیا، سماٹرا، ملایا، چینی، ترکستانی، ایسٹ افریقہ، افغانستان کے فضلاء ہزاروں کی تعداد میں ہیں۔ تو ہزاروں کی تعداد میں جب جلسہ ہوگا۔ تو ایسی صورت میں گورنمنٹ کے سامنے ویزوں کے لئے درخواست دینی ہوگی۔ متعلقہ حکومتوں سے اجازت لینی ہوگی، اس کے ساتھ مصارف کا تخمینہ اور ساتھ ہی ساتھ آمدنی کا اندازہ وغیرہ اہم امور ہیں۔ کیوں کہ حاضرین کا اندازہ ڈیڑھ دو لاکھ سے کم نہ ہوگا، پورے ملک میں انتظار ہوگا۔ ہم لوگ اس پریشانی میں مبتلا ہیں کہ دیوبند کی آبادی تیس ہزار ہے،

اور اگر دو لاکھ آدمی آ جائیں تو اس مختصر آبادی میں کس طرح سما سکیں گے۔ کہاں بسیں گے۔ ہر ایک فاضل کو پگڑی باندھنی ہوگی اور اگر دس روپے فی پگڑی ہو تب بھی پچاس ساٹھ ہزار روپے صرف پگڑیوں کے مصارف ہوں گے اور اگر یہ بھی آسان ہو جائے تو اس کے باندھنے کا مسئلہ ہے۔ کل یہاں (دارالعلوم حقانیہ میں) ۳۰، ۳۵ طلبہ کو پگڑی بندھوائی تھی۔ تو بڑے بزرگ تھک گئے، ہاتھ تھک گئے۔ مگر ختم نہیں ہو رہے تھے۔

تو یہ تقریباً پانچ ہزار پگڑیاں باندھنا آسان کام نہیں۔ کل دستار بندی کے وقت ہمارے مولانا عبدالحنان صاحب (ہزاروی) نے خوب جملہ چسپاں کیا کہ یہ پگڑیاں ہیں۔ یا سوٹہ بازی ہے۔ میں نے کہا کہ: پگڑیاں بھی کلف دار ہیں اور باندھنے والے بھی مکلّف ہیں اور پگڑیاں بھی ذرا مکلّف ہونی چاہئیں۔ کلف لگا ہوا ہو۔ یہ بھی صورت ہے کہ اس وقت پیچ وخم نہ ہو۔ بلکہ پہلے سے باندھ کر رکھ دی جائیں۔ (یہ جملے حضرت نے مزاحاً فرمائے) خیر ان حالات کی وجہ سے یہ جلسہ ذرا مؤخر کیا گیا۔ مجلس شوریٰ میں یہ بھی بحث میں آیا کہ دارالعلوم کے سو سال پورا کرنے میں ایک سال باقی ہے تو پورا ہونے پر سو سالہ جشن منایا جائے۔ بہر حال منصوبہ ہے، تجویز ہے۔ باقی اللہ تعالیٰ کی توفیق اور امداد پر منحصر ہے۔

وسائل جمع کرنے کے لئے سوچ رہے ہیں کہ ہندو بیرونِ ہند کے دو ڈھائی لاکھ افراد جمع ہو سکیں اور انعقاد کیا جا سکے۔ یہ تنظیم کی غرض وغایت ہے۔ یہ چند باتیں تنظیم کے بارے میں ذکر کی گئیں، یہاں آج اس مجلس میں اس صوبہ کے فضلاء اس غرض سے جمع ہوئے ہیں کہ ان مقاصد پر غور کیا جائے۔ میں تو دیکھ کر خوش ہونے والوں میں ہوں گا۔ اب کام کرنا ان حضرات کو ہوگا۔ کام آپ حضرات ہی کا ہے۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔

تقریظ

از: حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ

(صدر مہتمم، دارالعلوم دیوبند)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

برادر محترم مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند نے چند ماہ پیشتر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ایک معرکۃ الآراء تقریر کی تھی جسے بعد میں منضبط کر کے ایک کتاب کی صورت میں مرتب کر دیا گیا اور اس کا نام ''سائنس اور اسلام'' رکھا گیا۔

چھپنے سے پہلے برادر ممدوح نے مجھے بھی اس کے مطالعہ کا موقع دیا۔ میں اس مضمون کے مطالعہ سے بے حد محظوظ و مسرور ہوا اور دل سے مولف کے حق میں دعا نکلی۔

یوں تو اس موضوع پر مختلف مذاق کے لوگ سینکڑوں مضامین لکھ چکے ہیں اور لکھتے رہیں گے ہیں گے لیکن یہ مضمون اپنی نوعیت میں نرالا ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ صاحب مضمون، حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کی صرف نسبی اولاد ہی نہیں ان کے علمی وارث بھی ہیں۔ جدید تعلیم کے اس بڑے مرکز (علی گڑھ) میں صحیح اور موزوں تبلیغی خدمت کا جو گہرا اور خوشنما نقش آپ کی اس تقریر نے چھوڑا، وہ مسلمانوں کی اصلاح کی ایک خوش آئند اور درخشاں علامت ہے۔ حق تعالیٰ ہمارے نو تعلیم یافتہ بھائیوں کو بار بار اس طرح کے افادات سے استفادہ کی توفیق بخشے۔

شبیر احمد عثمانی

۳ ربیع الاول ۱۳۶۰ھ

تقریظ

از: حضرت مولانا محمد اعزاز علی صاحب

(سابق شیخ الادب والفقہ، دارالعلوم دیوبند)

حَامِدًا وَّ مُصَلِّیًا وَّ مُسَلِّمًا. اَمَّا بَعْدُ!

اس رسالہ کے اوراق اس مقبول عام تقریر کے حامل ہیں جو عالی جناب مولانا الحاج المولوی محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم نے "اسلام اور سائنس" کے خشک مگر ضروری عنوان پر بمقام علی گڑھ کالج اسٹریچی ہال میں فرمائی تھی۔

خالص علمی اور خشک عنوان پر تقریر اور ایسے شخص کی تقریر جس کو کتب عربیہ کے مطالعہ، عربی طلبہ کے ہجوم میں عربی الفاظ و مصطلحات کی مزاولت سے فرصت ہی نہ ملتی تھی اور وہ بھی ایسے مجمع میں جہاں اس کے برعکس انگریزی زبان اور اس کے محاورات مادری زبان کے حکم میں آ گئے ہوں۔ یقیناً اضداد کے اجتماع کے حکم میں تھی اور اگر ضب (گوہ) اور نون (ماہی) کی ضدیت اور بعد مکانی کا صحیح مشاہدہ ہو سکتا تھا تو یہاں ہونا چاہیے تھا، لیکن بیان کی سلاست، مضامین کے ارتباط اور دقائق علمیہ ظاہرانہ انداز سے روز مرہ کے محاورہ میں ادا کرنے نے ایسا سہل الحصول بنا دیا ہے کہ اس کے شروع ہو جانے کے بعد ختم کلام سے پہلے سیری ہی نہیں ہوتی تھی۔

پھر یہی نہیں کہ صرف سائنس اور اسلام کے ہر ہر گوشہ پر مقرر ممدوح نے روشنی ڈال کر اس پتھریلی اور سنگلاخ زمین کو طریقۂ بیضاء بنا دیا بلکہ اس کے ساتھ بہت سے دوسرے معارف و دقائق علمی و اسلامی بھی نہایت سہولت کے ساتھ اہل بصیرت اور ارباب نظر کے پیش نظر کر دیئے اور قابل تحسین یہ امر ہے کہ جس جگہ کوئی ایسا دقیقہ علمیہ سمجھانا ہو جس کو سمجھنے کے لئے علوم قدیمہ سے واقفیت، مصطلحات فنونیہ کا تداول شرط تھا یا فی الحقیقت اس میں مقرر کے لئے دلچسپی پیدا کر لینا ضروری تھا تاکہ اذہان میں نشاط پیدا ہو۔ اس کو اگر ایک جگہ معمولی معمولی مثالیں دے کر کالشمس فی نصف النہار کر دیا تو دوسری جگہ ادیبانہ تشبیہات و استعارات، لطائف و ظرائف سے مزین بنا کر ذہن نشین کر دیا۔

پس یقیناً یہ تقریر اگر ایک جانب حقائق اسلامیہ، معارف شرعیہ کا آئینہ ہے تو دوسری طرف ادبی دلچسپیوں کا ذخیرہ بھی ہے۔

درکفے جام شریعت درکفِ سندانِ عشق
ہر ہوسناکے نداند جام و سندان باختن

پس اگر یہ امر قابل تعجب نہیں کہ مشک ان دماغوں کو معطر کر دیتا ہے جو ماؤف نہ ہوں تو یہ بھی شایان تعجب نہیں کہ نزدیکان بے بصر کے علاوہ تمام قلوب اس تقریر سے مستفید ہوئے اور اگر یہ لائق حیرت نہیں کہ آفتاب افق مشرق سے طلوع کرنے کے بعد اپنے مقابل زمین کے ہر ہر گوشہ کو منور کر دیتا ہے تو یہ بھی موجب حیرت نہیں کہ اس تقریر نے مسئلہ مبحوث عنہا کے کسی گوشہ کو روشن کئے بغیر نہ چھوڑا اور اگر یہ صحیح ہے کہ ٹھنڈا اور شیریں غیر مکدر پانی پیاسوں کی پیاس کا ازالہ اس طرح کر دیتا ہے کہ ان کے رونگٹے رونگٹے سے تشنگی کی اذیت، یبوست کی تکلیف زائل ہو جاتی ہے تو پھر یہ بھی صحیح ہے کہ اس تقریر نے عنوان بالا سے متعلق تشنگان کمال کی تشنگی اسی دلچسپی کے ساتھ زائل کر دی جو پیاسے کو پانی سے ہوتی ہے۔ قاسمی فیضان کی وجہ سے میرے نزدیک تو نہ یہ تقریر قابل تعجب ہے اور نہ مقرر ممدوح کی دوسری تقریریں یا تالیفات، اگر کسی ناواقف کو تعجب ہو تو وہ جانے اس کا کام۔

عَجِبْتُ فِي الزَّمَانِ مَا عَجِبْتُ   أَتَى مِنَ الْ سَيَّارِ عَجِيْبًا

محمد اعزاز علی غفرلہ

تقریظ

از: جناب ڈاکٹر محمد ذکی الدین صاحب

(شیخ الطبعیات، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

حضرت الحاج مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کا نام مسلمانانِ ہند کے لئے محتاجِ تعارف نہیں۔ آپ نے سائنس اور اسلام کے اہم موضوع پر ایک نہایت عالمانہ خطبہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی انجمن اسلامی تاریخ وتمدن کے سامنے فرمایا، اب وہی خطبہ شائع کیا جارہا ہے تاکہ لوگ اس سے استفادہ حاصل کریں۔

سائنس اور مذہب کی بحث اور فلسفہ اور مذہب کی بحث مدت سے چلی آتی ہے، سائنس اور مادیات کی وجہ سے مذہب کو (اسلام اور عیسائیت کو خاص طور پر) سخت نقصان پہنچا۔ ساتھ ساتھ علماء کی یہ کوشش رہی کہ ان نقصانات کی تلافی کی جائے۔

ڈریپر نے ایک کتاب سائنس اور مذہب کے عنوان سے لکھی ہے۔ اس کتاب میں اسلام اور سائنس کے متعلق مختلف سلسلہ میں ذکر کیا گیا ہے، علامہ جمال الدین افغانی رحمۃ اللہ علیہ نے پیرس جاکر مشہور ومعروف فلسفی رینان سے بحث کی اور یہ ثابت کردیا کہ اسلام سائنس کی مخالفت نہیں کرتا، اس کے بعد وہ اس موضوع پر کئی مضامین بھی شائع کرچکے ہیں۔ ان کے بعد ان کے شاگرد علامہ محمد عبدہ اور علامہ رشید رضا نے مسلسل اس موضوع پر قلم اٹھایا۔

ہندوستان میں سرسید نے اسلام اور سائنس کے متعلق بہت کچھ لکھا۔ اسلام ریویو میں خواجہ کمال الدین نے بہت سے مضامین شائع کئے۔ مولانا عبدالعلیم صدیقی اور دیگر علماء نے متعدد خطبات اور مضامین اس سلسلہ میں دیئے۔ علماء کی کوشش یہ تھی کہ یہ ثابت کیا جائے کہ

1 ..... سائنس اسلام کے مخالف نہیں۔

2 ..... جب مسلمان عروج پر تھے تو انہوں نے بہت سی سائنس کی ایجادات کیں، جس سے یہ ثابت کیا گیا کہ سائنس اسلام کی مخالفت نہیں کرتا۔

مصر میں علامہ طنطاوی نے "تفسیر جواہر" ۲۲ جلدوں میں شائع کی ہے، اس میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ قرآن شریف کی آیتوں کا تعلق سائنس سے دکھایا جائے اور ایک حد تک اس میں علامہ موصوف کو کامیابی بھی ہوئی۔

پچھلی صدی میں یہ ایک شوق پیدا ہو گیا تھا کہ سائنس کے اصولوں اور نظریوں کو قرآن مجید کی آیتوں سے ثابت کیا جائے۔ اس سلسلہ میں ایک نہایت ہی فاش غلطی علماء سے سرزد ہوئی، وہ یہ کہ انہوں نے سائنس کے اصولوں اور نظریوں کو ابدی سمجھ لیا اور وہ بالکل بھول گئے کہ جوں جوں زمانہ ترقی کرتا جاتا ہے، سائنس کے نظریوں اور اصولوں کی خامیاں ظاہر ہوتی جاتی ہیں اور اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ ان میں وقتاً فوقتاً زمانہ کی رفتار کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں کی جائیں۔ ساتھ ساتھ ہمارا یہ دعویٰ بھی ہے کہ قرآن شریف خدا کا پیغام ہے جو ہمیشہ کے لئے آیا ہے، جو دو متضاد چیزیں ہیں۔

حضرت مولانا کا یہ فاضلانہ خطبہ آپ کے سامنے ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ اس سے پورے طور پر مستفید ہوں گے اور یہ خطبہ ہمارے ان نوجوان کے لئے جن کے دماغ میں سائنس اور الحاد مترادف ہے، مشعلِ ہدایت ہوگا۔

(ذکی الدین)

سائنس اور اسلام

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةٍ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

اَمَّا بَعْدُ! فَقَدْ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَمَّا خَلَقَ اللّٰهُ الْاَرْضَ جَعَلَتْ تَمِيْدُ فَخَلَقَ الْجِبَالَ فَقَالَ بِهَا عَلَيْهَا فَعَجِبَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ شِدَّةِ الْجِبَالِ، فَقَالُوْا يَارَبِّ! هَلْ مِنْ خَلْقِكَ شَيْءٌ اَشَدُّ مِنَ الْجِبَالِ؟ قَالَ نَعَمْ: اَلْحَدِيْدُ فَقَالُوْا يَارَبِّ! هَلْ مِنْ خَلْقِكَ شَيْءٌ اَشَدُّ مِنَ الْحَدِيْدِ؟ قَالَ نَعَمْ. اَلنَّارُ...... هَلْ مِنْ خَلْقِكَ شَيْءٌ اَشَدُّ مِنَ النَّارِ قَالَ نَعَمْ! اَلْمَآءُ ...... هَلْ مِنْ خَلْقِكَ شَيْءٌ اَشَدُّ مِنَ الْمَآءِ؟ قَالَ نَعَمْ: اَلرِّيْحُ فَقَالُوْا يَارَبِّ هَلْ مِنْ خَلْقِكَ شَيْءٌ اَشَدُّ مِنَ الرِّيْحِ؟ قَالَ نَعَمْ: اِبْنُ اٰدَمَ تَصَدَّقَ صَدَقَةً بِيَمِيْنِهٖ يُخْفِيْهَا مِنْ شِمَالِهٖ①

ترجمہ: ”نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: جب اللہ تعالیٰ نے زمین کو پیدا کیا تو کانپنے اور ڈولنے لگی، تب اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں کو پیدا کیا اور ان سے زمین پر جم جانے کے لئے فرمایا۔ ملائکہ نے پہاڑوں کی شدت وصلابت پر تعجب کیا اور کہنے لگے کہ اے پروردگار! تیری مخلوق میں کوئی چیز پہاڑوں سے بھی زیادہ سخت ہے؟ فرمایا: ہاں لوہا ہے۔ اس پر ملائکہ نے عرض کیا اے پروردگار تیری مخلوق میں لوہے سے بھی زیادہ کوئی چیز سخت ہے؟ فرمایا ہاں آگ ہے، پھر عرض کرنے لگے کہ الٰہی آپ کی مخلوق میں آگ سے بھی زیادہ کوئی چیز سخت ہے؟ فرمایا ہاں پانی ہے۔ پھر انہوں نے عرض کیا کہ اے پروردگار تیری مخلوق میں پانی سے بھی زیادہ کوئی چیز سخت ہے؟ فرمایا ہاں ہوا ہے۔ تو پھر ملائکہ نے عرض کیا کہ اے پروردگار تیری مخلوق میں ہوا سے بھی زیادہ کوئی چیز سخت ہے؟ فرمایا ہاں، آدم کی اولاد ہے جو دائیں ہاتھ سے اس طرح چھپا کر صدقہ کرے کہ بائیں ہاتھ کو بھی خبر نہ ہو“

تمہید...... صدر محترم بزرگان قوم و برادران عزیز طلبہ! مجھے اس وقت جس موضوع پر تقریر کرنے کی ہدایت کی گئی ہے اس کا عنوان ”سائنس اور اسلام“ ہے۔ مجھے جس طرح اس پر تعجب ہے کہ اس عظیم الشان اجتماع میں جس میں ایک

---

① السنن للترمذی، ابواب التفسیر، باب ومن سورة المعوذتین ج: ۱۱، ص: ۲۱۵، رقم: ۳۲۱.

مرکزی جگہ پر قوم کے منتخب افراد، مختلف علوم وفنون کے ماہر اور مخصوص ارباب کمال جمع ہیں، تقریر کے لئے مجھ جیسے بے بضاعت طالب علم اور ناکارۂ علم وعمل کا انتخاب کیا گیا، اسی طرح بلکہ اس سے بھی بدرجہا زائد اس پر تعجب ہے کہ تقریروں کے اہم موضوعات میں سے اس اہم تر بلکہ مشکل ترین موضوع کو مجھ ناچیز کے سر پر عائد کیا گیا ہے۔ عنوان مذکور حقیقتاً ایک غیر معمولی عنوان ہے جس کے لیے معمولی قابلیت کافی نہیں ہو سکتی۔ کیوں کہ یہ عنوان ”سائنس اور اسلام“ اپنی لفظی حیثیت میں جس قدر سہل اور مختصر ہے، اسی قدر اپنی معنوی وسعت اور وقت کے لحاظ سے طویل اور صعب ترین ہے۔ وجہ ظاہر ہے کہ یہ عنوان تین چیزوں پر مشتمل ہے۔ ایک سائنس، دوسرے اسلام، تیسرے ایک درمیانی عطف، اس لئے قدرتی طور پر اس کے۔ تحت تین امور کی تشریح مقرر کے ذمہ عائد ہو جاتی ہے۔ ایک سائنس کا مفہوم اور اس کی حقیقت، دوسرے اسلام کا مفہوم اور اس کی حقیقت تیسرے ان دونوں کی باہمی نسبت اور اس کا حاشیتین سے ارتباط اور پھر ایک چوتھی چیز ان تین سے خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔ اور وہ ان تین امور کا مقتضی ہے، یعنی اگر سائنس اور اسلام اور ان کی درمیانی نسبت واضح ہو جائے تو یہ ایک واقعہ کا اثبات ہوگا۔ مگر ہر واقعہ محض ایک واقعہ کی حیثیت سے ایک افسانہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ جب تک کہ اس سے کوئی عمل، کوئی حکم اور کوئی طلب نہ پیدا ہو۔ اس لئے چوتھا مقصد یہ ہوگا کہ ان تین ثابت شدہ حقائق کا ہم پر تقاضا کیا ہے اور یہ واقعات ہم سے کیا چاہتے ہیں۔ اس لئے اس تقریر کے موضوع سے تین مقصد پورے ہو جاتے ہیں جن پر اس مضمون کی بنیاد ہوگی اور سائنس اور اسلام کی حقیقت سائنس اور اسلام کی درمیانی نسبت اور اسلام اور سائنس سے پیدا شدہ موعظت۔ ظاہر ہے کہ یہ تینوں امور جس قدر اہم ہیں اسی قدر میری نسبت سے صعب اور مشکل ہیں، کیونکہ اول تو اسلامی حقائق ومقاصد ہی پر سیر حاصل روشنی ڈالنا ایک بے مایہ طالب علم کے لئے یقیناً دشوار گزار ہے۔ تاہم اگر اس حیثیت سے کہ مجھے علماء کی ایک مرکزی جماعت (علماء دار العلوم دیوبند) کی جوتیوں میں رہنے کا اتفاق ہوا ہے اور ”**ہم القوم لا یشقی جلیسہم**“ کے قاعدے کے مطابق میں کوئی ایک آدھ جملہ اسلام کے مقاصد کے متعلق کہہ بھی دوں تو بہر حال سائنس تو میرے لئے ہر صورت میں ایک نئی چیز اور اجنبی ہے، نہ میں اس کے اصول سے واقف ہوں نہ فروع سے باخبر اور نہ فنی حیثیت سے مجھے اس کے مبادی اور مقاصد سے کوئی تعارف حاصل ہے اور ظاہر ہے کہ جملہ کے اطراف میں سے اگر ایک طرف بھی گوشۂ چشم سے ایک طرف رہ جائے تو طرفین کی درمیانی نسبت پر روشنی ڈالنا کس قدر مشکل ہے؟ تاہم جب کہ ایک محترم جماعت کی طرف سے مجھے مامور کیا گیا تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ من اللہ ایک طلب ہے، اس لئے غیبی امداد کی توقع پر جرأت ہوتی ہے کہ عنوان زیر نظر پر اپنی بساط کے موافق کچھ کلام کروں اور سامعین سے اپنی اغلاط کے سلسلہ میں عفو و مسامحت کی درخواست کر کے امیدوار تسامح رہوں۔

حضرات! اس وقت جو حدیث میں نے تلاوت کی ہے وہ عنوان مذکورہ کی تینوں جہات پر انتہائی جامعیت کے ساتھ حاوی ہے اور اس میں میرے علم وفہم کے مطابق پہلے سائنس کی جوہری حقیقت پر اس طرح روشنی ڈالی گئی

ہے کہ گویا اس کا مغز اور لبِ لباب کھول کر سامنے رکھ دیا گیا ہے۔ اس کے بعد اسلام کی اصلیت واشگاف فرمائی گئی اور پھر ان دونوں چیزوں کی باہمی نسبت اس انداز سے آشکارا کی گئی ہے۔ جس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ ان میں سے مقصودیت کی شان کس کو حاصل ہے اور وسیلہ محض ہونے کی کس کو؟ اور پھر یہ کہ اس وسیلہ سے اس کے مقصود کو حاصل کرنے کا طریقہ کیا ہے؟ اور پھر حصولِ مقصد کے بعد اس پر کیا ثمرات مرتب ہوتے ہیں جن کی توقع پر تحصیلِ مطلوب کی سعی کی جائے۔

ہاں مگر حدیثی حقائق کھولنے سے پیشتر مناسب ہے کہ میں سائنس کا موضوع متعین کر دوں تا کہ اس پر انضباط کے ساتھ بحث کی جا سکے مگر ساتھ ہی یہ بھی عرض کیے دیتا ہوں کہ فن سائنس کے موضوع کی تعیین فن کی حیثیت سے میری قدرت میں اس لئے نہیں کہ میں نے اس فن کی تعلیم نہیں پائی۔ البتہ اس کے مشہور اور زبان زد آثار کو سامنے رکھ کر اپنی ذہنی سعی سے سائنس کا جو کچھ موضوع متعین کر سکتا ہوں، اسی کو عرض کروں گا، مجھے امید ہے کہ اگر میں اس میں غلطی کروں گا تو اس مرکز کے اہلِ فن اور سائنس دان استاذ مجھے اس غلطی پر قائم نہ رہنے دیں گے۔

فنِ سائنس کا موضوع...... حضرات! اس دورِ ترقی میں جب تمدنی ایجادات اور مادیات کے نئے نئے انکشافات کا چرچا ہوتا ہے تو بطور تکملہ سائنس کا ذکر بھی ساتھ ہی ساتھ ہوتا ہے۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ دورِ حاضر نے اپنی اعجازی کروٹ سے دنیا کو دیوانہ بنا دیا۔ مثلاً وسائل خبر رسانی کے سلسلہ میں ٹیلی فون اور ٹیلی گراف سے دنیا کو حیرت میں ڈال دیا، ریڈیو اور لاسلکی اور دوسرے ایسے ہی برقی آلات سے عالم کو مبہوت کر دیا تو ساتھ ساتھ سائنس کا ذکر بھی ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ اسی کے سنہری آثار ہیں، یا مثلاً وسائل نقل و حرکت کے سلسلہ میں جب ریل، موٹر، ہوائی جہاز اور دوسری بادپا سواریوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے تو ساتھ ہی سائنس کا نام بھی لیا جاتا ہے کہ یہ سب کچھ اسی کا طفیل ہے یا مثلاً صنائع و حرفت کے سلسلہ میں لوہے لکڑی کے خوشنما اور عجیب و غریب سامان تعمیرات کے نئے نئے ڈیزائن اور نمونے، سیمنٹ اور اس کے ڈھلاؤ کی نئی نئی ترکیبیں اور انجینئری کی نئی سے نئی اختراعات جب سامنے آتے ہیں تو سائنس کا نظر فریب چہرہ بھی سامنے کر دیا جاتا ہے کہ یہ سب اسی کے خم ابرو کی کارگزاریاں ہیں، اس طرح نباتاتی لائن میں زراعتی ترقیات، پھل اور پھول کی افزائش کے جدید طریقے اور نباتات کے نئے نئے آثار و خواص کے متعلق انکشافات کا نام جب لیا جاتا ہے تو وہیں سائنس کا نام بھی پورے احترام کے ساتھ زبانوں پر آ جاتا ہے۔

اسی طرح حیوانی نفوس میں مختلف تاثیرات پہنچانے کے ترقی یافتہ وسائل اور آپریشنوں کی عجیب و غریب پھرتیلی صورتیں، کیمیاوی طریق پر فن دوا سازی کی حیرتناک ترقی، تحلیل و ترکیب کی محیر العقول تدبیریں بجلی کے ذریعے معالجات کی صورتیں جب زبانوں پر آتی ہیں تو ساتھ ہی انتہائی وقعت کے ساتھ سائنس کا نام بھی زبان زد ہوتا ہے کہ یہ سب اسی کے درخشندہ آثار ہیں۔ اس سے میری ناقص عقل نے مجھے اس نتیجہ پر پہنچایا ہے کہ موضوعِ عمل موالید ثلاثہ جمادات، نباتات اور حیوانات کے دائرے سے باہر نہیں ہے۔

پھر چونکہ ان ہر سہ موالید کی ترکیب عناصر اربعہ آگ، پانی، ہوا، مٹی سے ہوتی ہے جو تقریباً ایک مسلمہ چیز ہے اور اس کے لئے اس پر کسی استدلال کے قائم کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس لئے گویا سائنس کا موضوع بلحاظ حقیقت عناصرِ اربعہ ٹھہر جاتے ہیں۔ جن کی خاصیت اور آثار کا علماً سمجھنا اور پھر کیمیاوی طریق پر ان کی تحلیل و ترکیب کے تجربات سے عملاً نئی نئی اشیاء کو پردہ ظہور پر لاتے رہنا، سائنس کا مخصوص دائرۂ علم و عمل ہو جاتا ہے، پس سائنس کی یہ تمام رنگ برنگ تعبیریں درحقیقت انہیں چار ستونوں (عناصر اربعہ) پر کھڑی ہوئی ہیں۔

اس کے بعد اگر اس تفصیلی حقیقت کو مختصر عنوان میں خلاصہ کیا جائے تو یوں کہا جا سکتا ہے کہ سائنس کا موضوع "مادّہ اور اس کے عوارضِ ذاتیہ" سے بحث کرتا ہے اور بس، جو بھی مادّیات میں زیادہ سے زیادہ منہمک رہ کر ان کے خواص و آثار سے کام لینے والا ثابت ہوگا، وہی سب سے بڑا سائنس دان اور بہترین ماہرِ سائنس کہلائے جانے کا مستحق ہوگا۔

موضوع متعین ہو جانے کے بعد اب سائنس کے اس چو رنگ، وہ، آگ، پانی، ہوا، مٹی پر جس کا مرتب بیان حدیثِ زیبِ عنوان میں کیا گیا ہے ایک ذرا سا غور فرمایئے تو محسوس ہوگا کہ:

عناصر کی قوتوں کا باہمی تفاوت اور اس کا اصولی معیار...... ان چاروں عنصروں کے خواص و آثار اور ذاتی عوارض یکساں نہیں بلکہ کافی حد تک متفاوت ہیں اور نہ صرف عوارض و آثار ہی میں تفاوت ہے بلکہ خود ان کی جوہری طاقتیں بھی ایک درجہ کی نہیں ہیں۔ ان میں کوئی عنصر ضعیف ہے، کوئی قوی، کوئی قوی تر اور کوئی اقوی تر ہے۔ اور پھر یہ قوت و ضعف کا تفاوت بھی بے جوڑ یا اتفاقی نہیں، بلکہ معیاری ہے، وہ معیار یہ ہے کہ ان عناصر میں سے جس میں بھی لطافت بڑھتی گئی ہے، اسی قدر اس کی طاقت بھی بڑھتی ہے اور پھر طاقت ہی کے اندازہ سے اس میں غلبہ و تسلط اور اقتدار کی شان قائم ہوتی گئی ہے اور جس حد تک لطافت کم ہو کر کثافت کے لئے جگہ خالی کرتی گئی ہے، اسی قدر اس عنصر میں کمزوری آتی گئی ہے، پھر کمزوری کی قدر اس میں بے بسی، مغلوبیت اور ذلت و پستی بھی نمایاں ہوتی گئی ہے۔

راز اس کا یہ معلوم ہوتا ہے کہ لطافت ایک وصفِ کمال ہے جو کثافت کی ضد ہے اور ہر وجودی کمال کا مخزن حضرت واجب الوجود کی ذات بابرکات ہے۔ اس لئے لطافتوں کا منبع بھی وہی ہے اور اسی قاعدہ سے بوجہ لطافت طاقتوں کا منبع بھی وہی ہے۔ چنانچہ اس کی بے انتہا لطافت کا عالم تو یہ ہے کہ آنکھوں سے اوجھل، حواس و خیال کی حدود سے بالاتر اور ادراک و انکشاف کی حد بندیوں سے وراء الوراء ہے، پھر ان کی بے انتہائی طاقت کا کرشمہ یہ ہے کہ تمام جہانوں پر اپنی اور صرف اپنی شہنشاہی کا نظام محکم کئے ہوئے ہے۔ اس لئے جس چیز میں بھی لطافت کا کوئی کرشمہ ہے وہ درحقیقت اسی کی ذات و صفات کا کوئی پرتو ہے۔ جس کا اثر بقدر استعداد اس نے قبول کر لیا ہے اور جب کہ قبولِ اثر بغیر کسی مناسبت کے نہیں ہوتا، اس لئے یہ کہا جانا بعید از قیاس نہ ہوگا کہ ہر لطیف شی کو بقدر لطافت حق تعالیٰ سے مناسبت ہے اور ظاہر ہے کہ جس حد تک بھی کسی چیز کو ذات بابرکات کے ساتھ قرب و تناسب قائم ہوگا وہ اسی قدر قوی، غالب اور با اقتدار بنتی جائے گی، ادھر کثافت کو اس کی ذات سے بے انتہا بعد اور بیگانگی

ہے کہ وہاں کثافت کا نشان نہیں۔ اس لئے جو چیز بھی بقدر کثافت اس لطیف و خبیر سے دور پڑتی جائے گی، اسی وجہ سے پست و مغلوب اور ذلیل ہوتی جائے گی اور اس میں سے غلبہ و استیلاء کی شان نکلتی جائے گی۔ بلکہ اسی طرح جس طرح پانی سے کوئی چیز قریب۔ جائے تو اس میں پانی کے آثار برودت و رقت وغیرہ سرایت کرتے چلے جائیں گے۔ آگ سے قریب ہو جائے تو حرارت و سخونت وغیرہ آثار راسخ ہو جائیں۔ مٹی سے قریب ہو جائے تو یبوست اور خشکی کے آثار گھر کر جائیں۔

اسی طرح جو چیز کسی وصف کے ذریعہ بھی ذات بابرکات حق سے قرب و مناسبت پیدا کرے گی۔ وہ اسی حد تک بقدر استعداد شئون ربانی اور صفات کمالیہ کا مرکز و محور بنتی چلی جائے گی اور ضرور ہے کہ اس میں استیلاء و استغناء کا ظہور ہو اور وہ قوی تر، غالب تر اور رفیع المنزلت ہوتی جائے۔ فرق اگر ہے تو یہ کہ حسیات میں قرب بھی حسی ہوتا ہے اور آثار قرب بھی محسوس طریق پر نمایاں نظر آتے ہیں۔ مگر اس کی بارگاہ رفیع میں حس کی رسائی نہیں، اس لئے اس کا قرب بھی حسی ہونے کی بجائے وصفی ہوتا ہے، یعنی جو چیز اخلاق و اوصاف کے لحاظ سے قرب و مناسبت کا درجہ حاصل کرے گی وہی اس کے کمالات سے بقدر استعداد حصہ پانے لگے گی اور اسی حد تک غلبہ و تسلط اور استغناء و استیلاء اس کے حصہ میں آ جائے گا۔

عنصر خاک...... اس معیار کے ماتحت جب ہم عناصر اربعہ پر نظر ڈالتے ہیں تو سب سے زیادہ کثیف عنصر ''مٹی'' نظر آتا ہے، جس کا مخزن یہ زمین ہے، یہ خاک کا ڈھیر کثیف ہی نہیں بلکہ کثافت آور بھی ہے۔ ساری چیزوں میں اگر کثافت و غلاظت آتی ہے تو اس مٹی ہی کی بدولت آتی ہے، آگ نے آج تک کسی چیز کو گندہ اور غلیظ نہیں کیا۔ یہ الگ بات ہے کہ آگ پر پکانے کی وجہ سے کسی چیز میں غلظت آ جائے۔ سو یہ غلظت آگ میں سے نہیں آتی بلکہ آگ اس شے کا جوہر لطیف کھینچ لیتی ہے جس سے اس کا اصل مادہ غلیظ باقی رہ کر نمایاں ہو جاتا ہے اور شے غلیظ معلوم ہونے لگتی ہے، سو آگ اس میں کوئی چیز ڈالتی نہیں بلکہ اس سے کچھ نکال لیتی ہے، پس یہ غلظت آگ میں سے نکل کر نہیں آتی بلکہ خود اس شے کی ذات سے اٹھ کھڑی ہوتی ہے، جب کہ آگ اس کا جوہر لطیف کھینچ لیتی ہے، اسی طرح پانی کسی چیز کو مکدر اور غلیظ نہیں بناتا بلکہ اس کی بدولت تو غلاظتیں اور کدورتیں صاف کی جاتی ہیں کہ اس کی اصلیت پاکی اور پاکبازی ہے۔

اسی طرح ہوا بھی کسی چیز کو مکدر اور گندہ نہیں کرتی۔ یہ الگ بات ہے کہ ہوا میں غیر محسوس طریقہ پر اجزاء ارضیہ ملے ہوئے چلے آئیں اور کسی شے کو مکدر بنا دیں تو پھر یہ کدورت بھی زمین ہی کا فیض ہوگا نہ کہ ہوا کا۔ اس لئے انجام کار ساری کثافتوں کی جڑ یہ خاک دھول مٹی ہے۔ جس کو لطافت سے دور کی بھی کوئی مناسبت نہیں۔ اس لئے عام عناصر میں اس کی کوئی وقعت نہیں۔ آپ ساری ہی زمین کے اس طویل و عریض کرہ کو لے لیجئے، اس میں بجز پامالی اور ذلت و مسکنت کے اور کوئی جوہر دکھائی نہیں دے گا۔ یہ زمین رات دن روندی جاتی ہے۔ مگر ذلت و

پستی کا یہ عالم ہے کہ چوں تک نہیں کرسکتی، نہ اس میں ادراک ہے، نہ احساس، نہ غلبہ ہے، نہ اقتدار، اگر غلبہ ہے تو دوسرے تمام عناصر کا خود اسی پر ہے۔ گویا سارے ہی عناصر کا قدم اس کے سر پر ہے اور ہر ایک عنصر کا یہ کھلونا ہے، ہوا اسے اڑائے پھرتی ہے، پانی اسے بہائے پھرتا ہے، آگ اسے جھلستی رہتی ہے مگر یہ ذرا بھی زور نہیں دکھا سکتی کہ زور ہو تو دکھائے۔ طاقتیں تو اس کی کثافت مطلقہ نے سلب کر رکھی ہیں، زور آئے تو کہاں سے آئے؟ پھر فقدانِ لطافت کا یہ عالم ہے کہ اس کا مادہ بھی کثیف اور صورت بھی کثیف، اسے کتنا ہی صیقل کرو، مگر سطح پھر بھی کر کری ہی رہے گی۔ نہ چکناہٹ قبول کرے گی نہ چپکاہٹ۔ پھر نہ صرف کثیف المادہ اور کثیف الصورت ہی ہے، بلکہ کثیف الطبع بھی ہے، ایک ڈھیلے کو کتنا ہی زور سے اوپر پھینکو۔ جب تک پھینکنے والے کا عارضی زور اس کے ساتھ رہے گا، وہ اونچا ہوتا جائے گا۔ لیکن جب اس کی اصلی حالت اور عرضی طبیعت عود کرے گی تو پھر نیچے ہی آپڑے گا۔ بہر حال جب کہ زمین کے مادہ، صورت اور طبیعت میں کسی جہت سے بھی لطافت نہیں، گویا اسے ذاتِ اقدس سے اس وصف میں بُعدِ مطلق حاصل ہے تو ضعفِ مطلق اور ذلتِ مطلقہ بھی اسی عنصر کے حصہ میں آنی چاہیے تھی۔ اس لئے قرآن کریم نے زمین کو ذلیل ہی نہیں، بلکہ ذلول فرمایا ہے، جو ذلت کا مبالغہ ہے۔

ارشادِ ربانی ہے: ﴿هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِیْ مَنَاكِبِهَا﴾ ① ہاں اس زمین کا ایک جزء پہاڑ بھی ہیں جن کی مٹی یعنی ریت نے بہ نسبت غبار کے کچھ لطافت و ستھرائی قبول کر کے کدورت و کثافت سے قدرے بعد پیدا کر لیا، تو اس کی شان اسی حد تک مٹی سے فائق ہوگئی۔ چنانچہ خشک ریت کو اگر جھاڑ دو تو بکھر جاتی ہے۔ پانی ڈالو تو کیچڑ نہیں بنتا۔ اس کے ذرات کو دیکھو تو چمک بھی اٹھتے ہیں۔ اس پر نظر ڈالو، خاک کی بہ نسبت نظر فریب بھی ہے۔

حتیٰ کہ بعض اوقات اس کی صاف ستھری صورت اور اس کی آب و تاب دیکھ کر پانی اور دریا کا بھی شبہ ہو جاتا ہے، غرض جس حد تک اس میں لطافت و ستھرائی آئی تھی۔ اسی حد تک وہ بہ نسبت غبار کے عزیز الوجود بھی ہو گیا۔ اس کی قدر و قیمت بھی بڑھ گئی اور پھر اس کی ترکیب سے اگر پتھر اور پتھروں کی ترکیب سے پہاڑ بنے تو ان کی عظمت و شان اور قدر و قیمت زمین کی سطح سے کہیں رو بالا ہوگی۔ چناں چہ مٹی کی نسبت سے پتھروں کی طاقت کا یہ عالم ہے کہ مٹی کے بڑے بڑے ڈھیلوں بلکہ مٹی کی پختہ سے پختہ اینٹوں کو ایک پتھر سے چکنا چور کر دیا جا سکتا ہے لیکن مٹی کے تودے پتھروں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ اگر پہاڑ کی کوئی چٹان زمین پر آگرے تو زمین دہل جاتی ہے اور دب جاتی ہے اور اس میں گہرا غار قائم ہو جاتا ہے، لیکن اس کے برخلاف مٹی کا منوں ڈھیر بھی اگر کسی سنگین چٹان پر آپڑے تو اسے اپنی جگہ سے ہلا بھی نہیں سکتا چہ جائیکہ اسے شکستہ بنائے، نہ وہ ہلتی ہے نہ اس میں غار پڑتا ہے، پھر انہیں پتھروں میں بھی جوں جوں صفائی ستھرائی اور جلا بڑھتی جاتی ہے ان کی قیمت اور معنوی طاقت بھی ترقی کرتی جاتی ہے۔ سنگِ خارا عام

---

① پارہ: ۲۹ صورة الملک الآية: ۱۵.

پتھروں سے قیمتی، سنگِ مرمر اس سے زیادہ قیمتی، جواہرات اور لعل و یاقوت اس سے زیادہ قیمتی ہیرا اس سے قیمتی، فرق ہے تو وہی لطافت و کثافت اور غلاظت و صفائی کا ہے، زمین کی سطح تو اس حد تک کثیف تھی کہ اسے کتنا ہی صیقل کرو لیکن ہاتھ پھیرنے سے کامل چکناہٹ بھی محسوس نہیں ہو سکتی۔ لیکن پتھروں میں بوجہ لطافت مادہ یہ قابلیت ضرور ہے کہ اگر انہیں صیقل کرو تو مسکہ کی طرح املس اور چکنے ہو جاتے ہیں۔ پھر بعض میں چمک پیدا ہو جاتی ہے اور بعض دھندلا سا عکس بھی دکھلانے لگتے ہیں۔ پس پتھروں نے جس حد تک صفائی قبول کی، اسی حد تک ان میں شدت و قوت پیدا ہو گئی، بہر حال پہاڑ اور ان کا مادّہ بہ نسبت زمین اور اس کے غبار کے لطیف ہے اس لئے طاقتور بھی ہے اور زمین سے کہیں زیادہ شدت و صلابت اور قوت کا مالک ہے، پس وجہِ شدت و قوت وہی لطافت و ستھرائی نکل آئی ہے۔

لیکن پہاڑ اور ان کے شدید القویٰ پتھر جن کی شدت کے سامنے زمین تھرتھرا بھی نہیں سکتی تھی اور پامال محض تھی، اسی وقت تک شدید ہیں جب کہ زمین کی خاک دھول سے ان کا مقابلہ ہوتا رہے، لیکن اگر کہیں پہاڑوں کی ان شدید و مدید چٹانوں کا سامنا لوہے سے ہو جائے تو پھر ان کی یہ ساری سنگدلی ہوا ہو جاتی ہے۔ لوہے کی ایک بالشت بھر کدال بڑی بڑی چٹانوں کا منٹوں میں فیصلہ کر دیتی ہے۔ وزنی وزنی پتھروں کو چکنا چور ہوتے دیر نہیں لگتی۔ ریل کی پٹریوں پر یہ دو طرفہ لاکھوں من پتھروں کے ڈھیر انہی پہاڑی پتھروں کے جگر پارے ہوتے ہیں۔ جو چھوٹی چھوٹی کدالوں کی برکت سے مٹی اور لائن دبانے کی خدمت پر لگا دیئے گئے اور اپنی بے انتہا رفعت سے گر کر اس بے انتہا پستی پر آ گئے تھے۔ ان پتھروں پر لوہے کی کدالیں اس طرح پڑتی ہیں، جیسے ایک بے دست و پا قیدی کے سر پر کوڑے اور بید پڑتے ہیں کہ وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ اس سے صاف واضح ہے کہ لوہا پتھروں سے زیادہ شدید اور طاقتور ہے۔ کیوں؟ راز اس کا بھی وہی لطافت ہے لوہے کے اجزاء نے خلقی طور پر پتھروں کے ریت سے زیادہ صفائی اور ستھرائی قبول کی ہے اور اس میں مٹی تو کیا ریت جیسی بھی کثافت نہیں ہے۔

لوہے کا برادہ اڑتا نہیں پھرتا کہ چیزوں کو آلودہ کر دے، ریت اگر پانی میں بھی پڑ جاتا ہے تو بہر حال اسے کسی نہ کسی حد تک مکدر کر دیتا ہے کہ آخرکار خاک ہی ہے۔ مگر لوہے کے اجزاء اگر برادہ کر کے بھی پانی میں ڈال دیئے جائیں تب بھی اس کی جلا اور رقت و سیلان میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر لوہے پر پالش کر دی جائی تو چاندی کی طرح چمک اٹھتا ہے بلکہ اسے صیقل کر دو تو آئینہ بن جاتا ہے جو باریک سے باریک خدوخال تک کا عکس دکھلانے لگتا ہے، لیکن پتھر میں نہ ایسی پالش قبول کرنے کی استعداد ہے اور نہ وہ اس طرح کے صیقل ہونے کی صلاحیت ہی اپنے اندر رکھتا ہے۔ پس اگر پتھر مجلی ہو کر اشیاء کی ذات کا سراپا کسی حد تک نمایاں کر سکتا تھا تو لوہا اس سراپا کی تمام باریک سے باریک خوبیاں بھی عیاں کر سکتا ہے۔ اس لئے لوہے کی لطافت پتھروں سے کہیں زیادہ نکلی۔ بس اسی لطافت کی بنا پر لوہا تو پتھروں پر گراں اور طاقتور ہے اور پتھر اپنی کثافت کی بنا پر اس کے سامنے ذلیل و خوار ہے۔ بس بڑے سے بڑا پہاڑ بھی اپنی اس نمایاں عظمت و ہیبت کے باوجود ذرا سے لوہے کے سامنے اپنے عجز کو نہیں چھپا سکتا۔

عنصرِ آتش...... لیکن یہی طاقتور لوہا جس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کا بڑے بڑے پہاڑوں نے لوہا مان رکھا ہے۔ جب ہی تک طاقتور ہے جب تک کہ پتھروں کے سر پر ہے، لیکن اگر اسی لوہے کو کہیں آگ چھو جائے یا لوہے کا بڑے سے بڑا ٹکڑا کسی لوہار کی بھٹی میں پہنچ جائے تو اس کا رنگ روپ متغیر اور چہرہ فق ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی صورت نوعیہ اور ذاتی خاصیت تک کو برقرار نہیں رکھ سکتا۔ آگ اس کے جگر تک گھس کر اسے ہم رنگِ آتش بنا کر ڈالتی ہے، پھر اس غریب لوہے کو آگ کی بھٹی سے تھوڑی دیر اور نہ چھڑایا جائے تو آگ اسے گلا کر پانی کی طرح بہا دیتی ہے اور اس کی شدت وصلابت کی کچھ بھی پیش نہیں جاتی۔ کوئی اب اس لوہے سے کہے کہ پہاڑ کی ایک چھوٹی سے چھوٹی ٹکڑی کا ہی سر کچل دے۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آگ لوہے سے بھی زیادہ شدید اور طاقتور ہے۔ غور کرو تو اس کا راز بھی وہی عقلی اور طبعی اصول ہے کہ آگ میں لوہے سے بھی زیادہ لطافت موجود ہے اور لوہا اس کے مقابلے میں کثیف ہے، لوہے میں اگر اتنی لطافت تھی کہ وہ باوجود پتھروں کی طرح کثیف المادّہ ہونے کے عوارض کے سبب رقت وسیلان قبول کر لیتا تھا تو آگ اپنی ذات سے کوئی ٹھوس جسم نہیں رکھتی، جس میں کوئی چیز گھس نہ سکے۔ ادھر تو ہر چیز آگ کے جگر میں گھس سکتی ہے اور ادھر آگ بھی ہر چیز کے جگر تک میں سرایت کر جاتی ہے، جس کی صلاحیت لوہے میں نہیں پھر لوہا اگر کسی وقت چمک کر باہر سے نورانی شعاعیں قبول کر لیتا تھا تو آگ کی لطافت کا یہ عالم ہے کہ اس میں خود بخود شعاعیں پھوٹتی ہیں۔ یعنی لوہا دوسروں کی روشنی قبول کرتا ہے اور آگ اپنی روشنی خود دوسروں پر ڈالتی ہے۔ خود بھی روشن ہے اور دوسری تاریک چیزوں کو بھی روشن کر سکتی ہے، پھر صیقل شدہ لطیف لوہا جسے آئینہ کہتے ہیں اس لطافت صورت کے باوجود پھر بھی اتنا ثقیل الجسم اور کثیف المادّہ ہے کہ اگر اس پر ہاتھ مارو تو اس کے متکاثف جسم سے ہاتھ ٹکرا کر واپس آ جاتا ہے، لیکن آگ کی جسمانی لطافت کا عالم یہ ہے کہ اس کے جسم میں سے ہاتھ آر پار نکل جاتا ہے اور پھر اس کا جسم بھی نہیں ٹوٹتا، پھر صیقل شدہ لوہا تو صرف عکس ہی قبول کرتا ہے لیکن آگ اصلی جسم ہی کو قبول کر لیتی ہے اور پھر بھی اس کے جسم میں شکن نہیں پائی جاتی اور وہ کسی دوسرے جسم کے تداخل سے مانع نہیں ہوتی، اس لئے وہ لوہے سے زیادہ شدید اور زیادہ طاقتور ہے بلکہ اسی لطافت کی حد تک اس کا حلقۂ اثر بھی کثیف اشیاء کی نسبت وسیع ہوتا گیا ہے۔ پتھر اور لوہا جہاں رکھا ہوا ہے اتنی ہی جگہ اس سے پر ہو جاتی ہے اور اس حد سے باہر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ لیکن آگ جس مکان میں ہے اس سے باہر تک اس کے اثرات نورانیت وحرارت پہنچتے ہیں۔ اور اگر آگ اور اس کا مکان نگاہوں سے اوجھل بھی ہو تب بھی اس کے پھیلنے والے آثار اس کے وجود کی خبریں دور دور تک پھیلاتے رہتے ہیں۔ اس لئے آگ لوہے پر غالب ہے اور اسے فنا کے گھاٹ اتار ڈالتی ہے۔

عنصرِ آب...... لیکن یہی دہکتی ہوئی آگ اور اس کا یہ کر و فر جب ہی تک قائم ہے جب تک اس کے آس پاس کہیں پانی کا نشان نہ ہو۔ اگر پانی کے چند قطرات بھی اس پر آ گریں تو آگ کی چمک دمک اور یہ تعلّی وترفع سر نیچا ہی نہیں

کرتی بلکہ سب ختم ہو جاتی ہے۔ پانی اس کے وجود ہی کو باقی نہیں چھوڑتا کہ وہ کچھ ابھر سکے۔ بلکہ جس لکڑی کو کچھ دیر آگ سے اپنی جان بچانا ہے وہ پانی کی چادر اوڑھ لے یا نمناک ہی ہو جائے۔ آگ چمک مار کر رہ جائے گی، لیکن اس کا گیلی لکڑی پر کوئی بس نہ چلے گا۔

بہرحال جہاں پانی موجود ہو، آگ کے پر نہیں جم سکتے۔ خواہ پانی آگ پر چھڑک دو یا آگ پانی میں گرا دو، آگ کی خیر نہیں رہتی۔ بڑے سے بڑا انگارہ پانی پر گرا دو تو اس کے گرتے ہی پانی اِدھر اُدھر ہٹ جائے گا اور پھر اچانک چاروں طرف سے سمٹ کر اس انگارے کو دبوچ لے گا تو وہ غریب روسیاہ ہو کر رہ جائے گا۔

غرض یہ اس کے سامنے آئے یا وہ اس کا سامنا کرے، ہر صورت میں پانی کی طاقت کے سامنے آگ کی شعلہ زنی کچھ کارگر نہیں ہوتی۔ جس سے پانی کی شدت و طاقت آگ پر نمایاں ہو جاتی ہے۔ لیکن اس غلبہ و مغلوبیت کی روح یہاں بھی وہی اصول ہے جس کا ہم ابھی ذکر کر چکے ہیں، آگ اپنی لطافتِ جسم کے سبب کسی شے کی ذات کو اپنے اندر کھپا لیتی تھی، لیکن اس کا چہرہ اتنا صاف نہ تھا کہ اشیاء کا عکس قبول کر سکے۔ مگر پانی عکس اور اصل دونوں کو اپنے اندر کھپا لیتا ہے کہ وہ فقط لطیف المادہ ہی نہیں بلکہ لطیف الصورت بھی ہے۔

یعنی کچھ بھی اس میں ڈال دو، ہر چیز اس کے قعر اور جگر میں سما جائے گی۔ پھر اس رقت و سیلان کے باوجود اس کا چہرہ یا سطح اس قدر صاف اور شفاف ہے کہ آئینہ کی طرح صورت بھی دکھلا سکتا ہے۔ پانی کی یہ صفت کہ ہر چیز اس کے آر پار نکل جاتی ہے، گو آگ کو بھی میسر ہے۔ لیکن پانی کا کمالِ لطافت یہ ہے کہ نگاہ تک بھی اس سے پار ہو جاتی ہے۔ جو آگ میں ممکن نہیں۔ پس پانی لوہے کی تصویر کشی اور آگ کے عدم تکاثف دونوں لطافتوں کا جامع ہے، اس لئے اس کی قوت بھی آگ اور لوہے کی قوت سے زیادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تو آگ اور لوہے دونوں کو ختم کر سکتا ہے، لیکن یہ دونوں اس پر غالب نہیں آ سکتے اور اسی لئے پانی کا حلقۂ اثر بھی آگ سے زیادہ وسیع ہے۔ آگ کا اثر اگر اسے کسی بند اور محدود مکان میں روشن کیا جائے، اس مکان کی چہار دیواری تک محدود ہو گا۔ لیکن پانی جس مکان میں مسدود ہے، اس سے باہر بھی دور دور تک نمی اور رطوبت کے آثار پھیلے ہوئے ہوتے ہیں۔ شہر کے ارد گرد تالاب اور نہریں ہوتی ہیں، تو آب و ہوا ہی نہیں، لوگوں کے مزاج تک مرطوب ہو جاتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ یہ سب اس کی لطافت اور سرعتِ نفوذ کے کرشمے ہیں، لوہا اور آگ مسامات میں نہیں گھستے، لیکن پانی بوجہ لطافت خاص، باریک سے باریک منفذ میں گھر کر لیتا ہے اور جب کہ غلبہ و طاقت بقدرِ لطافت ہے تو پانی کی طاقت بھی بلاشبہ آگ سے کہیں بڑھ کر رہی۔

عنصر ہوا...... اب آگے چلو، یہی پانی جو آگ کو تہس نہس کر دیتا ہے، ہوا کے سامنے یہ مسکین بھی عاجز اور ناتواں ہے اور اس کی کچھ پیش بھی نہیں جاتی وہ چلتی ہوا میں اگر سکون سے رہنا چاہے تو نہیں رہ سکتا۔ ہوا کے جھکڑ جب چلتے ہیں تو تالاب اور جھیلیں ہی نہیں بڑے بڑے سمندر تہ و بالا ہو جاتے ہیں۔ پانی کی موجیں بلکہ موجوں کی موجیں

ایک دوسرے پر گرتی پھرتی پڑتی ہیں۔ سمندر کے عظیم الشان کرہ کو بایں عظمت و ہیبت قرار نہیں ہوتا۔ ٹھہرا ہوا پانی ہو تو ہوا اسے خشک کر ڈالتی ہے اور اڑا دیتی ہے۔ اگر پانی کا کوئی مخزن و منبع نہ ہو جو اس کی مدد کرے، تو پانی کا وجود ہی باقی نہ رہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہوا پانی پر بھی غالب اور حکمران ہے، وجہ وہی اصول ہے کہ ہوا سب عناصر سے بڑھ کر لطیف و شفاف ہے چنانچہ اس کی جسمانی لطافت کا تو یہ عالم ہے کہ نگاہ جیسی لطیف چیز بھی اس کی لطافت کے سامنے لطیف ہے، جو اس پر جم نہیں سکتی اور ہوا کو دیکھ نہیں سکتی۔ بدن کو لگ کر گو ہوا محسوس ہو جائے جس سے اس کے جسم ہونے کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اور کوئی لطیف سے لطیف حاسہ حتیٰ کہ تار نگاہ بھی جو الطف ترین اجسام ہے، نہ اس میں نفوذ کر سکتا ہے، نہ اس کا ادراک ہی کر سکتا ہے۔ اسی طرح ہوا اپنی شدت لطافت کے سبب رنگ و روپ کو بھی قبول نہیں کرتی کہ یہ چیزیں بہر حال نگاہ و بصر ہی سے متعلق ہیں اور وہ بصر ہی کو قبول نہیں کرتی، تو محسوسات بصر تک کیا نوبت پہنچ سکتی ہے۔ ہاں آواز اور خوشبو جیسی لطیف اشیاء جن کی نہ کوئی حسی شکل ہے نہ ہیئت، ہوا سے ساز کر لیتی ہے اور اپنی لطافت کی بدولت ہوا میں سما جاتی ہے۔ جنہیں ہوا قبول کر کے ادھر سے ادھر منتقل کر دیتی ہے۔

پھر اثر کا یہ عالم ہے کہ فوق و تحت کے گوشہ گوشہ اور ایک ایک منفذ میں موجود، جہاں آگ کی روشنی اور پانی کی نمی نہیں پہنچ سکتی، وہاں ہوا قائم اور دائم ہے، ذرا بھی کہیں خلا پیدا ہو جائے تو ہوا کو آتے دیر نہیں لگتی، پانی کو بھی لاؤ تو نالی بناؤ، نشیب پیدا کرو اور پھر بھی اس کی نقل و حرکت میں تدریج۔ لیکن ہوا کو نہ نشیب کی ضرورت نہ فراز کی، جگہ ہوئی اور وہ وہاں آئی۔ گویا پہلے سے موجود تھی۔ غرض ہوا لطیف تر تھی تو قوی تر اور غالب بھی ہوئی جو تمام عناصر پر حکمران، سب سے بالا و فوق اور پھر سب میں ساری و جاری ہے۔

جامع العناصر انسان اور اس کی طاقت ...... لیکن اگر ان سارے عناصر اور ان کے تینوں موالید، اور موالید کی بھی بے انتہا شاخوں کو ایک طرف رکھ کر تنہا انسان کو ایک طرف رکھو تو نظر آتا ہے کہ انسان ان سب ہی سے زیادہ اشد، اقویٰ اور ان پر غالب و متصرف ہے۔ یہ سب عناصر اپنی کارگزاری میں اس کے محتاج اور اس سے مغلوب ہیں۔ لیکن وہ ان میں سے کسی کے زیر تصرف اور کسی سے مغلوب نہیں کیونکہ اولاً تو عنصر کی باہمی اور نسبتی طاقت جو ایک دوسرے کے مقابل آنے سے کھلتی ہے، اپنے جزئیاتی ظہور میں انسان کی محتاج ہے۔ لوہا خود بخود پتھروں کو کچلتا نہیں پھرتا۔ آگ جگہ جگہ لوہے کو خود گرماتی اور پگھلاتی نہیں پھرتی۔ پانی خود بخود آگ بجھانے نہیں جاتا۔ ہوا کی یہ جزوی متصادم حرکات خود بخود نہیں ہو جاتیں بلکہ انسان کے نئے ذریعے ہوتی ہے۔ وہی کدالیں بناتا ہے اور پتھر توڑتا ہے، وہی بھٹیاں بناتا ہے اور لوہے کو تپاتا ہے، وہی مشکیزے اور ظروف میں پانی لاتا ہے اور چولہے ٹھنڈے کرتا ہے، وہی ہوا کو قید کرتا ہے اور سیارات کو اڑاتا ہے۔ پس عناصر کی یہ متغلبانہ کارفرمائی بہت حد تک انسانی افعال کی دست نگر ہے۔ اگر انسان ان میں دخل نہ دے تو عناصر اربعہ اپنے اپنے خزانوں میں پڑے ہوئے جیسے چاہیں اینٹھتے رہیں، لیکن میدان مقابلہ میں پہنچ کر ان جزوی افعال میں اپنا تغلب نہیں دکھلا سکتے۔ پس جس پر

کسی غالب کا غلبہ موقوف ہو اور جس پر کسی قوی کی فتح و نصرت معلق ہو، ظاہر ہے کہ وہ ان سب پر غالب ہوگا اور اس کی اشدیت کی یہی سب سے بڑی دلیل ہوگی۔

عناصر میں انسانی تصرفات...... پھر یہی نہیں کہ انسان ان کی باہمی نسبت کھول دینے ہی کا ایک ذریعہ ہے، نہیں بلکہ ان کی یہ تمام طاقتیں بھی اس کے پنجۂ تصرف و تسخیر میں قید ہیں، زمین کا قلب و جگر چاک کر دیا، کنوئیں بنائے، راستے بنائے، تہ خانے تیار کئے، ارضی معدنیات، سرمہ، ہڑتال، سونا چاندی اور پیتل وغیرہ کے خزانے اس سے چھین لئے، پہاڑوں کو تراش کر تہ بتہ مکانات بنائے، پہاڑوں اور برفانی چوٹیوں کو جہاں درندوں کو بھی پناہ نہ ملتی تھی، اپنی بستی بنا کر ان میں راستے نکالے، انہیں برما کر ان میں سرنگیں بنائیں، ان میں سواریاں دوڑائیں "وَتَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا"۔ زمین کے خزائن و دفائن کا راز فاش کر کے اثقالِ زمین کو عالم میں آشکار کر دیا اور زمین اور اس کے اجزاء سے برابر نوکروں چاکروں اور غلاموں کی سی خدمت لے رہا ہے۔

پانی کو لو تو زمین کی تہہ میں سے اسے کھوج نکالا، کنوئیں کھود کر ڈول رسی کے جال سے اسے پکڑا، بل لگا کر سینکڑوں فٹ نیچے سے اوپر کھینچ نکالا۔ دریاؤں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ نہروں اور نالیوں میں بہا کر کھیت سیراب کئے۔ مکانات ٹھنڈے کئے، پی کر کلیجے ٹھنڈے کئے۔ جمنا اور گنگا جگہ جگہ ماری پھرتی ہے، اسے واٹر ورکس کے ذریعہ گھر گھر رسوا کیا، وہ مائی تھی تو جگہ جگہ اس بچہ نے اس سے گوموت دھلوا کر چھوڑا۔ پانی جیسا آزاد عنصر ٹنکیوں میں قید، نلوں میں بند اور نکلنے میں برابر اس کاک کی حرکت کا محتاج۔ یہ سب انسان کی تسخیر کا نتیجہ ہے، وہ غریب اپنے طبعی میلان سے نیچے کو جاتا ہے، یہ اسے بیس بیس منزلہ مکانوں میں اوپر چڑھا لے جاتا ہے اور پھر وہاں سے پٹخ دیتا ہے۔ کبھی برف بنا کے اسے جما دیا، کبھی بھاپ بنا کر اڑا دیا، کبھی آگ دکھا کر گرما دیا، غرض وہی پانی جس سے آگ جیسا قوی عنصر بھی پناہ مانگتا تھا، انسان کے سامنے ایسا بے بس اور بے یار و مددگار ہے کہ اسے سنبھلنے کا بھی موقع نہیں ملتا۔ پانیوں کا سب سے بڑا گھر اور ابو المیاہ سمندر اعظم کہ جس کی بے پناہ عظمت سے ڈر کر دنیا کا ربع مسکون گویا ایک طرف پڑا ہوا ہے اور جس کی کوہ پیکر موجوں کا لگاتار سلسلہ خشکی کے کناروں پر اس طرح حملہ آور محسوس ہوتا ہے کہ گویا ابھی کرۂ زمین کو نگل جائے گا۔ بایں ہیبت و عظمت بھی انسانی دست برد سے نہ بچ سکا۔ انسان نے سمندروں کے جگر چیر ڈالے۔ اس میں جہاز چلائے، بجار دوڑائے۔ آبدوز کشتیوں سے اس کی گہرائیوں پر قبضہ کیا۔ اس کے مدفون موتیوں کے خزانے اگلوائے۔ اس کی تہہ کی چھپی ہوئی چیزیں بازاروں میں رسوا ہو رہی ہیں۔

خود سمندر کے نمکین پانی کو بھی تحلیل کر ڈالا۔ ان کا نمک الگ کر دیا، رطوبت الگ۔ گویا پانی کا خون تک پی گیا اور پھر اس کے سب نکے الگ کر لئے۔ غرض یہ قوی تر پانی زمین کی تہہ میں جا کر چھپتا ہے تو اسے پناہ نہیں، پہاڑوں کے دامن میں پناہ لیتا ہے تو اس کو رستگاری نہیں۔ مجبور بھی ہے، قید بھی۔ پھر ذلیل سے ذلیل خدمتیں اسے سے لی جا رہی ہیں۔ نجاستوں کا دھونا، ظروف صاف کرنا، میلے کپڑے پاک کرنا وغیرہ اس کے سر ہیں، جس

سے اندازہ کر لیا جائے کہ انسانی طاقت نے کس درجہ اس لطیف عنصر کو اپنا غلام اور پابند قیدی بنالیا ہے۔ آگ جیسے خونخوار عنصر کو دیکھو تو وہ انسان کے سامنے ایک خاکسار غلام کی طرح مجبور ہے۔ وہ لوہے اور پتھروں میں جا کر چھپتی ہے تو انسان لوہے اور پتھر کو ٹکرا کر آگ کی مخفی چنگاریاں کھینچ لیتا ہے۔ وہ آفتاب میں جا کر چھپتی ہے، انسان نے آتشی شیشوں کے ذریعہ ان کو گرفتار کیا اور پھر جب خود اسے چھپانے اور قید کرنے پر آیا تو ایک ذرا دیا سلائی کے سرے پر رتی برابر مسالہ میں قید کر دیا۔ جب چاہا دیا سلائی کا سرا رگڑا اور اس قیدی کو نکال باہر کیا۔ گویا وہ آگ جو سر نیچا ہی نہ کرتی تھی، انسان کے سامنے تنکے چننے لگی اور اس کی وہ رفعت و تعلّی خاک میں مل گئی، کہیں چولہوں میں انسان کی خدمت کر رہی ہے، کہیں انگیٹھیوں میں محبوس ہے، کہیں اس کا تزکیۂ نفس کیا تو آگ کا گیس بنا دیا جس کا دھواں اور دخان سب رخصت ہو گیا۔ غرض آگ کا عنصر بھی انسان کے ہاتھوں میں ایک کھلونا ہے، جب چاہا اور جس طرح چاہا الٹ پلٹ کر دیا۔ جسے کسی حالت میں بھی چین نہیں۔

ہوا بہت زیادہ لطیف اور مخفی تھی، جس پر انسان کی نگاہ تک فتح نہ پا سکی تھی، مگر اس کی یہ پردہ نشینی بھی انسان کی زد سے اسے نہ بچا سکی اور اس اڑتے ہوئے پرندے کو بھی انسان کے ہاتھ میں کھلونا ہی بننا پڑا۔ ہوائی فضا میں انسانوں کے جہاز اڑ رہے ہیں اور اپنے کندھوں پر انہیں سوار کئے پھر رہی ہے، ہوا کیا ہے انسان کا ایک ہوائی گھوڑا ہے جس پر بے لگام اس نے سواری کس رکھی ہے۔

انسان کی خبر رسانی کی خدمت پر جدا مجبور ہے۔ مشرق سے مغرب تک انسان کے افسانے دوڑ رہے ہیں اور ہوا اپنی مخفی طاقتوں سے انہیں لئے پھر رہی ہے۔ گویا انسان کی ایک چٹھی رسان ہے جو بلا اجرت غلامی کر رہی ہے۔

ادھر برقی پنکھوں کو حرکت میں لانے کے لئے جدا ناچ رہی ہے تاکہ انسان کا پسینہ خشک کرنے کی خدمت انجام دے۔ غرض خدمت گزاری کے فرائض میں چاکروں کی مانند مصروف ہے اور چوں و چرا نہیں کر سکتی، پھر انسان اسے قید کرنے میں اترا تو موٹروں کے پہیوں میں وہ بند، سائیکلوں کے ٹائروں میں وہ قید، برتنوں میں وہ گرفتار اور ربڑ کی گیندوں میں وہ محبوس۔

غرض یہ نادیدہ طاقت جس نے سمندروں کو تہ و بالا کر رکھا تھا، پھنسی تو ایسی پھنسی کہ انسان کے ہاتھ میں ایک قیدی محض بن کر رہ گئی جس کا کوئی پرسان حال نہیں۔

عناصر میں انسانی ایجادات …… پھر اس ظالم انسان کو اسی پر قناعت نہیں کہ عناصر کو باقی رکھ کر ہی ان سے کام لیتا رہے، نہیں اپنی ایجاد پسندی کے جذبہ میں انہیں فنا کر کے اور انہیں باہم لڑا لڑا کر بھی ان سے نئی نئی چیزیں عالم آشکارا کرتا رہتا ہے تاکہ کائنات کے دوسرے مدفون خزانوں سے بھی اپنی غلامی کرائے۔ آگ پانی کے درمیان لوہے کا پردہ حائل کر کے آگ کو دھونکا۔ آگ تو جوش میں پانی کو اڑا دینا چاہتی ہے اور پانی کھول کھول کر آگ کو ٹھنڈا کر دینا چاہتا ہے۔ دونوں اپنی جگہ غیظ و غیظ میں ہیں اور انسان ان کے جوش و خروش سے اسٹیم کی طاقت پیدا

کر کے انجن اور مشینیں چلا رہا ہے، لاکھوں ٹن لوہا اس بھاپ کی مخفی طاقت پر ناچ کر رہا ہے۔ مل چل رہے ہیں، مشینیں گھوم رہی ہیں، انجنوں میں کوئلہ کی کانیں پھنک رہی ہیں، مشینوں میں غلہ اور زمین کی پیداوار پس رہی ہے۔ گویا ساری کائنات پسی جا رہی ہے۔ مٹ رہی ہے مگر اف نہیں کر سکتی کہ ایک انسان کا بچہ مشین کی کل دبائے کھڑا ہے جس کی انگلی کی ہر حرکت سے عناصر اربعہ اور موالید ثلاثہ پر یہ طوفان بپا ہو رہے ہیں۔

پھر پانی کو پانی سے ٹکرایا اور برق پیدا کر لی، گویا پانی میں آگ لگا دی۔ پھر وہ بجلی جو سیکنڈوں میں اقلیموں کی خبر لیتی اور آسمان و زمین ایک کر ڈالتی ہے، اسے تانبے اور جست کے ایک پتلے سے تار میں اس طرح باندھ رکھا ہے کہ وہ اپنی زور و طاقت اس گرفت سے باہر نہیں جا سکتی۔ ایک ذرا سی پیتل کی گھنڈی جسے سوئچ کہتے ہیں، اس کا قفل ہے۔ اسے نیچے کو ہلا دو تو بجلی آ موجود اور اوپر کو اٹھا دو تو غائب، گویا برقی رو کی ایک عظیم الشان فوج ایک دبلے پتلے سپاہی کی قید میں گرفتار ہے، اور وہ پوری فوج اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتی۔ پھر یہ مصنوعی ہی بجلی نہیں، آسمانی بجلی کی گرفتاری کے لئے بھی انسان ہتھکڑیاں اور بیڑیاں لئے تیار ہے۔ بڑی بڑی بلڈنگوں پر چھوٹے تار چڑھائے ہوئے ہیں کہ اگر یہ جہاں سوز بجلی عمارت پر آ پڑتی ہے تو یہی معمولی سا تار اسے ابھا دیتا ہے۔ اور وہ عمارت کو ذرہ برابر آنکھ نہیں دکھا سکتی بلکہ اس تار میں غلطاں و پیچاں ہو کر رہ جاتی ہے۔

پٹرول جیسی سیال اور بہتی چیز میں آگ لگا دی۔ آگ اور تیل لڑ رہے ہیں جس سے گیس پیدا ہو رہا ہے اور حضرت انسان کی موٹر چل رہی ہے، ہوائی جہاز اڑ رہے ہیں۔

غرض ساری کائنات کے ناک میں دم ہے۔ ایک مشت استخواں سے کائنات کا ذرہ ذرہ عاجز ہے۔ عناصر نے باہم اپنی طاقتوں سے کیا جوہر کھانے تھے جو اس مجموعہ عناصر نے کر دکھایا۔ بحر و بر اور خشکی و تری کی ساری کی کائنات اس ظالم انسان کی بدولت ایک مصیبت میں گرفتار ہے کہ اسے کسی وقت چین نہیں، اور انسان ہے کہ رات دن ان عناصر کے الٹ پھیر میں انتھک طریق پر لگا ہوا ہے۔ جس سے ساری کائنات کا دم بند ہے اور سارے جماد و حیوان قید و غلامی میں مقید ہیں۔

مثل مشہور ہے کہ ایک شیر نے اپنے خورد سالہ بچہ کو نصیحت کی تھی کہ انسان سے بچتے رہنا۔ یہ بڑی چیز ہے۔ وہ انسان کے شوق دید میں تھا۔ کچھ شعور پا کر انسان کی تلاش میں نکلا کہ دیکھوں آخر یہ کیا بلا ہے جس سے سلاطین صحرا بھی اپنے دار السلطنت میں بیٹھ کر کپکپاتے ہیں، چلا تو پہلے اتفاق سے گھوڑے پر نظر پڑی۔ جس کی جسامت اور پھرتی و چالاکی کو دیکھ کر اسے شبہ ہوا کہ شاید یہی انسان ہے، پوچھا تو گھوڑے نے کہا کہ مجھ بچارے کی کیا مجال ہے کہ میں انسان کے سامنے ٹھہر سکوں، چوبیس گھنٹے گلے میں رسی، پیروں میں بیڑیاں اور اصطبل کا جیل ہے اور جب حضرت انسان کا جی چاہا تو میری پیٹھ پر سوار، منہ میں لگام اور اوپر سے تڑاتڑ کوڑوں کی مار۔ جیسی مجھ پر گزرتی ہے میں ہی جانتا ہوں۔

شیر کا بچہ سہم گیا کہ یا اللہ کیا بلا ہے انسان کہ عناصر ہی نہیں۔ سو الیہ بھی گرفتارِ بلا ہیں۔ آگے بڑھا تو اونٹ نظر پڑا جو گھوڑے سے دوگنا اور عجیب الخلقت تھا۔ اسے یقین آ گیا کہ ہو نہ ہو یہی انسان ہے، یہ گھوڑے سے بھی چار ہاتھ اونچا ہے، اس سے دریافت کیا تو اسے بھی انسان سے دہائی دیتے ہوئے سنا، وہ بولا کہ میرے اس قد وقامت پر نہ جاؤ۔ انسان نے بایں جسامت وقامت میرا ناطقہ بند کر رکھا ہے۔ میں کیا سینکڑوں مجھ جیسے میرے بھائی بند، صرف ایک نکیل میں گرفتار اور ایک خوردسال بچہ ہمیں جنگل در جنگل لئے پھرتا ہے۔ منوں بوجھ کمر پر ہے۔ ہم بلبلاتے ہیں مگر شنوائی نہیں۔ انسانوں کے لئے ہماری گردنیں سیڑھیاں ہیں۔ جب چاہتا ہے کمر پر دھرا جاتا ہے۔ پھر ایک نہیں دو نہیں تین تین آدمی لد جاتے ہیں اور نہ صرف خود لدتے ہیں، بلکہ بڑے بڑے پلنگ ہماری کمروں پر کس کر براجمان ہوتے ہیں۔ ہم چپ چاپ کان دبائے منزلیں قطع کرتے رہتے ہیں، راتوں چلتے ہیں اور دنوں بلبلاتے ہیں۔ مگر کوئی مخلص نہیں نکلتا۔

غرض ہماری یہ ساری مصیبت وغلامی صرف اسی انسان کی بدولت ہے۔ بھلا ہم انسان کو کیا ہوتے، ہم تو اس کا نام بھی بے خوف ہو کر نہیں لے سکتے۔

شیر کا بچہ اور بھی زیادہ ہراساں ہوا کہ خدا جانے انسان کیسے ڈیل ڈول کی چیز ہوگی جس سے ایسے عظیم الخلقت جانور پناہ مانگ رہے ہیں۔ آگے بڑھا تو اتفاق سے ہاتھی پر نظر پڑ گئی۔ جو ایک عظیم الشان بلڈنگ کی طرح سے سامنے سے آتا ہوا نظر پڑا۔ جس کی عمارت چار بڑے بڑے ستونوں پر کھڑی ہوئی تھی، اسے یقین محکم ہو گیا کہ یہ بالضرور انسان ہے اور یہی ایسی ہستی ہے جو اونٹوں اور گھوڑوں پر غالب آ سکتی ہے۔ اس نے ڈرتے ڈرتے ہاتھی سے کہا کہ غالباً آپ ہی کا نام نامی انسان ہے۔

ہاتھی نے نہایت حیرت سے بچہ شیر کو دیکھا اور کہا کہ بیٹا تم ناسمجھ ہو۔ کس بری بلا کا نام لے رہے ہو، مجھ ایسے لمبے ڈول کی جو گت اس ظالم انسان نے بنائی ہے، خدا دشمن کو بھی نہ دکھائے۔ گھوڑے کے منہ میں لگام تو دے دیتا ہے، اونٹ کی ناک میں نکیل تو پہنا دیتا ہے، لیکن مجھ پر تو بے ڈھائی سوار ہوتا ہے، لگام میرے نہیں، نکیل میرے نہیں، مگر پھر بھی ایسا گرفتار اور مجبور محض ہوں کہ اس ظالم کے آگے چوں تک نہیں کر سکتا۔ ہر وقت میری گردن پر سوار، لوہے کا آنکس ہاتھ میں، ذرا چوں کروں تو سر پر اتنے پڑتے ہیں کہ کھانا پینا بھول جاتا ہوں۔ میری کیا مجال ہے کہ انسان کے سامنے اف بھی کر سکوں۔ میں آپ کو نصیحت کرتا ہوں کہ اپنے باپ کی وصیت پر عمل پیرا رہیں اور اپنی جنگل کی بادشاہت کی حرمت قائم رکھیں، اس انسان کے قریب بھی نہ پھٹکیں۔ ورنہ یہ شاہزادگی ساری کرکری ہو جائے گی اور کوئی پھر فریاد کو بھی نہ پہنچے گا۔

شیر کا بچہ حیران تھا کہ انسان آخر کس تن وتوش کا ہوگا، جس کے غلبہ وتسلط کا چار دانگ عالم میں یہ شہرہ اور شور نشور برپا ہے۔ آخر کار اس نے بے نیل ومرام واپسی کا قصد کر لیا۔ لوٹ رہا تھا کہ ایک بن میں ایک بڑھئی کے بچہ کو

دیکھا کہ وہ ایک بڑے شہتیر کو آرے سے چیر رہا ہے اور جتنا چیر چکا ہے اس میں ایک کھونٹی گاڑ رکھی ہے، بچہ شیر کا التفات بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ یہی انسان ہے لیکن پتہ لینے کے لئے اس سے سوال کیا کہ جناب انسان سے واقف ہیں؟ اس نے کہا کہ آپ کو کیا کام ہے؟ کہا کہ میں اس کے درشن کرنا چاہتا ہوں۔ اس نے کہا بندہ ہی انسان کہلاتا ہے۔ شیر نے حقارت و تعجب سے دیکھ کر کہا، ارے کیا تو ہی وہ انسان ہے جس سے شیر، گھوڑا، اونٹ سب لرزتے ہیں؟ اس نے کہا جی ہاں واقعۃً یہی ہے، بچہ شیر نے کہا کہ او دشمن تو ہے کیا؟ تیرا کام تو میں ابھی اپنے طمانچے سے ختم کئے دیتا ہوں۔ بڑے ہی بیوقوف میرے آباؤ اجداد تھے جو تجھ سے کانپتے رہے اور بڑے احمق وہ تھے جنہوں نے راستے میں مجھے خوانخواہ سہا دیا۔ اس لاف زنی کے ساتھ بچہ شیر آگے بڑھا تا کہ قوت آزمائی کرے۔ بڑھئی کے بچے نے سمجھ لیا کہ وقت آ برہوا۔ اب تدبیر سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ کہا کہ واقعی آپ بڑے بہادر ہیں، میں بے چارہ کیا چیز ہوں، آپ جو چاہیں فرمائیں، اس وقت میرا ایک کام درپیش ہے جسے میں اپنے ضعف کی وجہ سے انجام نہیں دے سکتا۔ خدا نے آپ جیسا قوی اور بہادر بھیج دیا۔ پہلے وہ کام کر دیجئے پھر میرے ساتھ جو چاہے سلوک فرمائیے اور وہ یہ ہے کہ میں اس شہتیر میں سے یہ کھونٹی سرکانا چاہتا ہوں۔ ذرا اپنا ہاتھ اس شہتیر کے شگاف میں ڈال کر اسے تھام لیجئے تا کہ میں کھونٹی سرکا دوں۔

شیر صاحب اس مدح و ثناء سے مسحور ہو کر بے تکلف آگے بڑھے اور ایک نہیں دونوں ہاتھ شگاف میں ڈال دیئے۔ بڑھئی کے بچے نے کھونٹی نکال لی۔ کھونٹی کا نکلنا تھا کہ شہتیر کے دونوں پلیٹ مل گئے اور شیر صاحب کے دونوں ہاتھ اس میں پھنس کر رہ گئے، اب شیر صاحب نے چیں چیں کرنا شروع کیا اور بڑھئی کے بچے نے ہنسنا شروع کیا کہ فرمائیے، انسان کو دیکھ لیا؟ اس وقت شیر نادم ہوا کہ واقعی تجربہ کاروں اور بڑوں کی نصیحت سے روگردانی کا انجام برا ہوتا ہے۔ مگر پھر سوچنے لگا کہ ظاہر میں تو یہ انسان بڑا ہی کمزور اور حقیر ہے۔ اس کا جثہ تو قطعاً طاقتور نہیں معلوم ہوتا۔ ہاں کوئی اندرونی طاقت ہے جس سے اس نے مجھے اس وقت بے بس کر دیا اور ساری کائنات کو پچھاڑے رکھا ہے۔ یہ حکایت عبرت اور انسانی طاقت سامنے لانے کے لئے بس کرتی ہے۔ ان مشاہدات کی رُو سے ماننا پڑتا ہے کہ انسان میں ان عناصر سے کہیں زیادہ طاقت موجود ہے، جب ہی وہ ایک چھوٹے سے جثہ میں کم سے کم ہونے کے باوجود بھی عناصر کے مخزنوں اور موالید کے جثوں پر بھاری ہو رہا ہے اور ان کے غلبہ کے ساتھ ہر قسم کے تصرفات اور حاکمانہ کارروائیاں کرنے میں کسی سے مغلوب نہیں، اور جب یہ مان لیا جائے تو پھر یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس میں لطافت بھی عناصر سے کہیں زیادہ موجود ہے۔ کیوں کہ پہلے یہ اصول ثابت ہو چکا ہے کہ طاقت درحقیقت لطافت ہی میں ہے کہ کثافت میں بجز ضعف و درماندگی کے اور کچھ نہیں۔ پس انسان میں جب ہوا سے بھی زیادہ طاقت ہے جو الطف العناصر تھا، تو ناگزیر ہے کہ اس میں لطافت بھی ہوا اور اسے کہیں زیادہ ہو، تا کہ وہ اس پر اپنی یہ طاقتور حکمرانی برقرار رکھ سکے۔

انسانی طاقت و تسخیر کا راز اس کی روح میں مضمر ہے...... مگر یہ ظاہر ہے کہ انسان کے ظاہر میں تو کوئی

لطیف چیز محسوس نہیں ہوتی، نہ وہ صیقل شدہ آئینہ یا صاف پانی کی سی چمک رکھتا ہے کہ اس میں منہ نظر آنے لگے، نہ وہ خود ہی ایسا روشن ہے کہ فضا میں اس سے شعاعیں پھوٹتی ہوں اور روشنی نکلتی ہو، نہ وہ ہوا کی طرح غیر مرئی ہے۔ پھر اس میں یہ لطافتوں کو زیر کر دینے کی لطافت آخر کہاں مخفی ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ طاقت اور لطافت اس کے بدن کی نہیں ہوسکتی کہ بدن تو وہی آگ، پانی، مٹی، ہوا کا مجموعہ ہے۔ اگر اس بدن میں کوئی طاقت بھی ہو تو پھر بھی وہ بے چارہ اس تھوڑے سے آگ پانی سے سارے جہان کے اس آگ پانی پر کیا غلبہ حاصل کرسکتا تھا۔ یہ بدنی آگ پانی تو خود آفاقی آگ پانی سے لیا ہوا ایک قلیل سا جزء ہے اور جزءِ قلیل اپنے کل پر کیا غالب آسکتا ہے۔ ایک قطرہ دریا کو کیا مغلوب کرسکتا ہے؟ ایک چنگاری کرۂ نار پر کیا تسلط جما سکتی ہے؟ ایک ذرہ کرۂ ارض پر کیا حکومت کرسکتا ہے؟ بلکہ اس صورت میں تو قصہ برعکس ہونا چاہئے تھا کہ یہ مادی جہان خود اس انسان پر ہر حیثیت سے غالب رہتا اور اسے دم بخود رکھتا، چہ جائیکہ اس مشتِ خاک سے ساری کائنات، آب و گل مسخر ہو جائے اور خود اسی کا دم اس ضعیف البنیان کے سامنے بند ہو؟ بس یہ تسخیر یقیناً اس کے بدن اور بدنی آب و آتش یا ہوائی لطافتوں کا کام نہیں ہوسکتی، بلکہ انسان کی یہ غلبہ پانے والی قوت بلاشبہ ایسی ہونی چاہئے جو آگ پانی تو کیا ہوا سے بھی لطیف تر ہو کہ ہوا جیسی غیر مرئی چیز کی ٹکر تو انسان کو محسوس بھی ہوتی ہے، اس کی لطافت وہ ہو کہ باوجود انسان کے رگ و پے میں سمائے ہوئے ہونے کے کبھی اس کا دھکا تک انسان کو نہ لگا ہو۔ بلکہ کبھی اس کی لمس و مس تک کا بھی اسے احساس نہ ہوا ہو۔ وہ متصل تو اتنی ہو کہ انسان اس سے ملے بغیر اپنی ہستی کو باقی نہ رکھ سکے اور منفصل ایسی ہو کہ انسان کے کسی حاسہ کی رسائی اس تک نہ ہو۔ خود اس پر کوئی سرد و گرم نہ پہنچ سکے۔ اس لئے وہ فقط اپنے بدن پر ہی نہیں بلکہ جہان کے عناصر اربعہ پر غالب آ جائے، اور ظاہر ہے کہ بدن کو چھوڑ کر انسان میں روح کے سوا اور کون سی چیز ہوسکتی ہے، جس کی یہ صفات ہوں کہ ان دو ہی سے انسان مرکب ہے۔ یعنی انسان میں یہ طاقت نہیں۔

روحِ انسانی کی لطافت اور حسی نورانیت ...... یہ کرشمے ہیں تو دوسرے ہی جزو میں ہوسکتے ہیں۔ پس حاصل یہ نکلا کہ روح عناصر اربعہ ہی نہیں۔ تمام مادی عالموں سے بھی زیادہ لطیف چیز ہے۔ پھر روح کی یہ لطافتیں نہ صرف معنوی اور غیر مرئی ہی ہیں بلکہ حسی طور پر بھی اس کی لطافتیں عالم آشکارا ہیں۔ خود عناصر میں جتنی اقسام کی لطافتیں تھیں، اگر غور کرو تو وہ بھی سب کی سب روح میں جمع ہیں۔

اگر صیقل شدہ آئینہ یا شفاف پانی صورتوں کا عکس اتار لیتا تھا تو انسان کی آنکھوں کو روح نے ایک ایسی چمک دے رکھی ہے کہ جدھر اٹھ جاتی ہے، ادھر کے تمام نقشے فوٹو اور سینریاں اپنے اندر اتار لیتی ہے۔ آئینہ کا فوٹو تو بے اصل محض ہے کہ پشتِ آئینہ خالی ہے، لیکن آنکھ کا فوٹو بے اصل نہیں کہ اس کے پیچھے حس مشترک میں اس کا پورا معنوی علم قائم ہے۔

اگر آگ سے تار شعاع پھیلتے ہیں تو آنکھوں سے تار نگاہ منتشر ہوتے ہیں جو ان شعاعوں سے کسی طرح کم

نہیں، کیونکہ یہ تارِ شعاع سے تو چیز کی صورت محض آنکھ ہی کے سامنے روشن ہو جاتی ہے اور تارِ نگاہ سے یہ سب چیزیں دل کے سامنے روشن ہو جاتی ہیں جو ان کی حقیقت پر بھی غور کر سکتا ہے۔

اگر پانی غایتِ لطافت سے اجسام میں نفوذ کر جاتا ہے اور سخت سے سخت جسم بھی اس کے سریان سے نہیں بچ سکتا، جب کہ اس سے اتصال قائم ہو جائے، تو روح بھی جسم کی رگ رگ میں سمائی ہوئی ہوتی ہے، حتی کہ سخت سے سخت ہڈیاں بھی اس سے تازگی لئے ہوئے ہوتی ہیں، پھر پانی تو اپنے سریان سے اپنے محل کو محض ٹھنڈا ہی کئے ہوئے رہتا ہے اور روح اپنے دوران سے اپنے محل کو زندہ کئے ہوئے ہوتی ہے۔

اگر ہوا غایتِ لطافت سے دکھلائی نہیں دے سکتی تو روح بھی اپنی لطافتِ بے غایت سے آج تک نادیدہ ہے، اور جیسے ہوا کا رنگ و بو غیر محسوس چیز ہے یا ہے ہی نہیں۔ ایسے ہی روح بھی ان خواص سے بری ہے۔

غرض عناصر میں لطافت کے جو جو کمالات اور لطافت کے جس قدر مراتب و درجات تھے، وہ سب روح میں موجود ہیں۔ اس لئے اگر عناصر کو حق تعالیٰ سے جزوی مناسبتیں تھیں اور اس بناء پر وہ قوی تھے، تو روح کو بحیثیت مجموعی اس سے یہ ساری مناسبتیں قائم ہیں۔ اس سے وہ عناصر سے زیادہ قوی ہونی چاہئے اور جو کام عناصر کر سکتے ہیں وہ سب اس سے بے تکلف سرزد ہو جانے چاہئیں، پھر کوئی وجہ نہیں کہ عناصر کو تو ان کی طاقتوں کی بناء پر درجہ بدرجہ اشد کہا جائے اور روح کو اشد ترین نہ کہا جائے۔ اس لئے عنصری اور مادی طاقتوں پر روحانی طاقتوں کے فوقیت لے جانے کی ایک یہی وجہ کافی ہو سکتی ہے کہ عناصر جزوی لطافتیں رکھتے ہیں اور روح ان کی ساری لطافتوں کی جامع ہے اور انہیں ذاتِ بابرکات سے جزوی مناسبتیں ہیں، تو روح کو کلی مناسبت ہے۔

روحِ انسانی کی معنوی لطافت و طاقت...... لیکن اگر مزید غور کرو تو روح کو حق تعالیٰ سے محض عناصر کی سی مناسبت نہیں یا بالفاظِ دیگر محض مناسبت ہی نہیں بلکہ ایک جہت سے ایسی مماثلت بھی حاصل ہے کہ وہ اس کے مخصوص اوصاف و کمالات کے لئے بطورِ مثال پیش کی جا سکتی ہے اور عناصر اس کے لگ بھگ بھی نہیں رہ سکتے کہ وہ سرے ہی سے ان کمالات سے عاری اور کورے ہیں۔ مثلاً حق تعالیٰ اگر غیر مرئی طریق پر تمام عالم کا قیوم اور مدبر ہے تو اسی طرز پر روح کائناتِ بدن کی قیوم اور مربی ہے۔ وہ ذرا اپنی توجہ ہٹا لے تو کائناتِ بدن درہم برہم ہو جائے جیسا کہ موت کے وقت ہو جاتا ہے۔

پھر جس طرح حق تعالیٰ کے انوار ساری کائنات کے ذرہ ذرہ میں جلوہ افروز ہیں اور ہر ہر خطہ اور اس کے ہر ہر جزو سے اس کے مناسب کام لے رہے ہیں اور باوجود اس ظہورِ تام کے پھر بھی آج تک کسی آنکھ نے اسے نہیں دیکھا۔ اسی طرح روح کے انوار بدنی کائنات میں اس طرح پھیلے ہوئے ہیں کہ ہر ہر عضو سے اس مناسب کام لے رہے ہیں اور باوجودیکہ بدن کی رگ رگ میں روح کا ظہور ہے، آنکھ کی چمک میں، رخسار کی سرخی میں، بالوں کی سیاہی، دانتوں کی سفیدی میں، بدن کی تازگی میں اسی کا جلوہ ہے۔ وہ نہ ہو تو یہ سارے جلوے ایک آن میں ختم

ہو جائیں۔ مگر باوجود اس ظہورِ تام کے پھر بھی آج تک ایسی نادیدہ ہے کہ خود اپنا نفس بھی اس کے دیدار سے محروم ہے۔

بے حجابی یہ کہ ہر ذرّہ سے جلوہ آشکار
اس پہ گھونگھٹ یہ کہ صورت آج تک نادیدہ ہے

پس جیسے وہ ظاہر بھی ہے اور باطن بھی۔ ایسے ہی روح ظاہر بھی ہے اور باطن بھی، پھر جس طرح اس ساری کائنات کی زندگی اور زندگی کی ہر نقل و حرکت سے ذاتِ حق اول اور اقدم ہے کہ وہی تو معطی وجود ہے اور وجود سے پہلے کوئی بھی اقدام ممکن نہیں۔ آپ عالم کا کوئی اقدام ایسا نہیں پیش کر سکتے کہ وہ ہو جائے اور ذاتِ حق تعالیٰ اس کے بعد آئے۔ اس کے بغیر تو کائنات کی زندگی ہی نہیں اور بلا زندگی اس کی کوئی نقل و حرکت ہی ممکن نہیں، تو مخلوق خالق سے پہلے کیسے ہو سکتی ہے؟ ضرور ہے کہ ہر مخلوق اور مخلوق کے ہر فعل سے خالق کی ذات مقدم ہو۔ پھر اسی طرح کائنات کی ہر نقل و حرکت کا منتہیٰ بھی اس کی ذات ہے۔ آپ عالم کا کوئی اقدام بھی ایسا پیش نہیں کر سکتے کہ وہ ذاتِ حق سے گزرتا ہوا آگے پہنچ جائے اور ذاتِ حق کو ادھر ہی چھوڑ آئے۔ کیوں کہ جب ذاتِ حق ہی سے اس کائنات کی زندگی قائم ہے۔ تو یہ دعویٰ ایسا ہوگا کہ کائنات اپنے افعال کرتی ہوئی زندگی کی حد سے گزر جائے اور پھر بھی اس کے افعال جاری رہیں، جو عقلاً ناممکن ہے۔ پس عالم کے ہر حرکت و سکون کا منتہیٰ بھی اس کی ذات نکلتی ہے۔ اس کے آگے اور بعد کچھ نہیں۔ وہی ہر چیز کا اوّل بھی ہے اور وہی آخر بھی۔ جیسے کہ وہی ظاہر تھا اور وہی باطن بھی۔ ٹھیک اسی طرح بدنی کائنات کی ہر نقل و حرکت بلکہ اس کی نفسِ ہستی ہی سے روح اوّل بھی ہے اور آخر بھی، کیوں کہ جب روح ہی بدن کے لئے باعثِ ہستی و حیات ہے تو کسی زندہ کا کوئی اقدام زندگی سے قبل کیسے ہو سکے گا۔ پس ہر کام بلکہ بدن کے ہر کام کے اوّل روح آتی ہے۔ اور اسی طرح جب کہ روح ہی بدن کے لئے باعثِ حیات ہے تو کائناتِ بدن کا کوئی اقدام بھی حیات سے مؤخر نہیں ہو سکتا بلکہ آخر اور منتہائے حیات بھی یہی رہے گی۔ پس روح ہی اس بدنِ عالم کے لئے اوّل بھی ہوئی اور آخر بھی۔ جیسا کہ وہی ظاہر تھی اور وہی باطن بھی۔ پھر جیسا کہ ذاتِ حق عالم سے متصل تو اتنی ہی ہے کہ ﴿اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ﴾ اور ﴿وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ﴾ اور پھر منفصل بھی اتنی ہے کہ وراء الوراء ثم وراء الوراء، مخلوق ظلمتِ محض اور وہ نورِ مطلق۔

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم

ٹھیک اسی طرح روح بھی بدن سے متصل تو اتنی ہے کہ زندہ بدن کی کسی رگ کا کروڑواں حصہ بھی اس سے الگ نہیں، ورنہ زندہ نہ رہے۔ لیکن دور بھی اتنی ہے کہ اس کی پاکیزگیاں بدن سے کوئی لگاؤ ہی نہیں رکھتیں۔ لطیف و کثیف میں کیا تناسب اور کیا رشتہ؟ کجا یہ مشتِ خاک اور کجا وہ جوہرِ پاک، چراغِ مردہ کجا نورِ آفتاب کجا؟

صفاتِ روح سے الٰہیات پر استدلال ...... ان مماثلتوں کے سبب جس طرح ہم تشبیہ کے سلسلہ میں اُدھر سے اِدھر آئے اِدھر سے اُدھر بھی جا سکتے ہیں۔ یعنی اپنی ہی روحانی کائنات کے ذریعہ حق تعالیٰ کی ذات و صفات کی یکتائی اور بے چونی پر استدلال بھی کر سکتے ہیں اور کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح یہ ہماری بدنی کائنات بلا اس غیر مرئی

مدبر یعنی روح کے موجود اور باقی نہیں رہ سکتی اسی طرح یہ ساری کائنات عالم بھی بلا کسی مدبر حکیم کے موجود اور بقاء پذیر نہیں ہو سکتی۔ پس روح کی بدولت وجود صانع پر ہمارے ہی اندر سے دلیل نکل آئی۔

پھر جس طرح بدن میں ایک ہی روح تدبیر بدن کر سکتی ہے۔ اگر دو ہوں تو کائنات بدن فاسد ہو جائے کہ ایک میان میں دو تلواریں اور ایک اچکن میں دو انسان نہیں سا سکتے۔ اسی طرح کائنات عالم میں ایک ہی واحد قیوم اور حکیم و مدبر کی تدبیر کارگر ہو سکتی ہے۔

ورنہ ﴿لَوْ كَانَ فِيهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا﴾ ① کا ظہور ہو جائے گا۔ پس روح کے طفیل ہمارے ہی نفوس میں سے توحید صانع کی دلیل بھی پیدا ہو گئی۔ پھر جس طرح بدن کے قعر تک میں گھس جانے سے روح کا کوئی کم و کیف، کوئی لون و رنگ اور کوئی سمت و جہت نہیں دکھائی دے سکتی، اسی طرح وہ ذات بابرکات بھی بے چون و بے چگون اور سمت و سمات سے مبرا اور رنگ و لون سے منزہ ہے کہ رنگ برنگ کے جلوے تو اس سے ہیں مگر وہ ہر رنگ سے بری و بالا ہے۔ پس روح کی بدولت اس کی شان تنزیہ و تقدیس بھی ہمارے ہی اندر سے ہویدا ہو گئی۔

پھر جس طرح روح بدن کے ذرہ ذرہ میں موجود اور بدن کی رگ رگ سے اس کا تعلق وابستہ ہے۔ مگر تعلقات کی شدت و ضعف کا یہ تفاوت بھی ناقابل انکار ہے کہ جو تعلق قلب سے ہے وہ دماغ سے نہیں۔ جو دماغ سے ہے وہ کبد و معدہ سے نہیں اور جو ان سے ہے وہ عام جوارح بدن سے نہیں۔ اسی لئے قلب و دماغ کی ادنیٰ ایذاء یا توہین سے روح میں غصہ و جوش پیدا ہو جاتا ہے اور ان اعضاء رئیسہ پر ادنیٰ سی ضرب بھی پڑ جانے سے روح اپنی حیات کو سمیٹ لے جاتی ہے۔ بخلاف عام اعضاء کے کہ اگر ہاتھ پیر بھی کاٹ دیئے جائیں تو کمال زندگی خواہ چھن جائے مگر نفس زندگی مسلوب نہیں ہوتی۔

اس طرح ذات بابرکات کا جلوہ جہانوں کی رگ رگ میں سمایا ہوا ہے۔ مگر مواضع کے تفاوت سے تعلق کی شدت و ضعف میں بھی تفاوت ہے کہ جو تعلق اس کی ذات کو عرشِ عظیم سے ہے وہ اور مقامات سے نہیں کہ وہ مرکزِ استواء ہے، پھر جو تعلق بیت المعمور سے ہے اور وہ دوسری مواضع سے نہیں کہ وہ قبلۂ ملائکہ ہے، پھر جو تعلق بیت اللہ اور مسجد اقصیٰ یا حرم نبوی سے ہے وہ اور جگہوں سے نہیں ہے۔ اس لئے اگر ان کی کوئی توہین کا یا جارحانہ اقدام ہو تو روح اعظم کا غضب بھڑک اٹھتا ہے۔ عالم میں ہیجان شروع ہو جاتا ہے اور دنیا کی زندگی خطرہ میں پڑ جاتی ہے۔ حتیٰ کہ بیت اللہ کی اینٹیں اکھڑ جانے پر بھی اس عالم سے زندگی کھینچ لی جائے گی۔ پس روح کی بدولت ہم پر اللہ کے تعلقات کی نوعیت بھی منکشف ہو گئی۔

پھر جس طرح ہر شخص اپنی روح کی پکار اور حقائق دعوت کو دل کے کانوں سے بے تکلف سنتا ہے اور اس کی نصیحتوں کو قلب کے واسطے سے ادراک کرتا ہے۔ لیکن پھر بھی اس کے کلام میں نہ لفظ ہیں نہ آواز۔ یہی شان حق

---

① پارہ: ۱۷، سورۃ الانبیاء، الآیۃ: ۲۲۔

تعالیٰ کے کلام کی ہے کہ کلام بھی ہے، اس میں حقائق بھی ہیں، اس میں سماع بھی اور اسماع بھی ہے۔ اور مخصوص افرادِ بنی آدم (انبیاء علیہم السلام) جو بنی نوعِ انسانی میں مثل قلب کے ہیں، اسے سنتے بھی ہیں، پر نہ وہاں الفاظ کی حد بندیاں ہیں نہ الفاظ وتلفظ کی قیود کو ظہور کے بعد مخلوق میں پہنچتے پہنچتے یہ ساری تحدیدات نمایاں ہو جائیں۔ پس روح کی بدولت ہمیں ذات کے کلامِ نفسی اور کلامِ لفظی کا بھی فی الجملہ ادراک ہوا۔

پھر اگر تم آنکھ بند کر لو تو روح کا دیکھنا بند نہیں ہوتا اور کان بند کر لو تو اس کے سننے میں فرق نہیں پڑتا۔ بلکہ آنکھ کان بند کر کے تصور کے لامحدود عالم میں یہی روح دیکھنے کی چیزوں کو اور زیادہ بے تکلفی کے ساتھ دیکھتی ہے اور سننے کی چیزوں کو اور زیادہ بے غائلہ سنتی ہے۔ حالاں کہ نہ آواز روح سے ٹکراتی ہے اور نہ کسی صورت کا رنگ و روغن اور جسم اس کے آس پاس پھٹک سکتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح وہ ذات بے چون وچگون ہر چیز کو سنتی اور دیکھتی ہے۔ مگر نہ وہاں رنگ و روپ اور مادیت کو قرب نصیب ہوتا ہے اور نہ آوازوں کے نغمے ہی اس کی سمع سے ٹکر کھاتے ہیں۔ پس اپنی ہی روح کی بدولت ہمیں اللہ کی سمع و بصر کی بے کیفی اور بیچونی کا بھی ایک گونہ اندازہ ہوا۔

اسی طرح جب ہم اس پر نظر کریں کہ بدن کی حیات تو روح کی زندگی سے قائم ہے۔ مگر روح کے لئے کسی اور روح کی حاجت نہیں۔ وہ خود اپنے ہی معدنِ حیات کی ایک موج ہے، تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ عالموں کی زندگی تو ذات بابرکات کی حیات سے قائم ہے اور خود اس کی حیات کے لئے کسی اور ذات کی حاجت نہیں بلکہ وہ اپنی ذاتی حیات سے حی ہے جس میں کوئی فرق نہیں آسکتا اور اس طرح ہم پر اللہ کی صفتِ حیات کے ذاتی اور خانہ زاد ہونے کا اندازہ بھی اپنے ہی اندر سے ہو گیا۔

بہرحال روح کو ذاتِ بابرکات سے مناسبتیں ہی نہیں بلکہ فی الجملہ مماثلتیں حاصل ہیں، جس سے حق تعالیٰ کے لامحدود کمالات کی مثالیں ہمارے نفوس میں پہنچ گئی ہیں اور ہم اپنے اندر ہی سب کچھ عیانًا دیکھنے پر قادر ہو گئے، اس لئے روح کی اس سے زیادہ جامع تعریف اور کچھ نہیں ہو سکتی، جو قرآنِ کریم نے فرمائی کہ: ﴿قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ وَمَآ اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا﴾. ①

غرض روح اس ساری تفصیل سے ایک لطیفۂ ربانی ثابت ہو جاتی ہے اور جسم محض ایک کثیفۂ ظلماتی۔ لیکن جب یہ بدنی عناصر جو عالم خلق کی چیزیں ہیں، اس روح سے تھوڑی سی مناسبت اور واجبی سا لگاؤ پیدا کر کے ایسے قوی ہو سکتے ہیں کہ ساری دنیا ان کی طاقت پر ناچنے لگتی ہے، تو خود روح جو عالم امر کی چیز ہے اور اس کی مناسبت مع اللہ بلکہ مماثلت کی گہرائیوں کی کوئی حد نہیں۔ اللہ جل ذکرہ، سے اس قوی مناسبت و مماثلت کی بدولت کیا کچھ قوی اور غالب و متسلط نہ ہوگی۔ اگر ڈھنگ سے اس کی قوتوں کو استعمال کیا جائے تو کیا پھر کائنات اس کا تحمل کر سکے گی؟

پس بچۂ شیر کے قول کے مطابق انسان اگر پانی اور مٹی سے کہیں زیادہ قوی ہے تو وہ بدن کی بدولت نہیں کہ

---

① پارہ: ۱۵، سورۃ الاسراء، الآیۃ: ۸۵.

بدن تو وہی آگ پانی کا ایک مختصر مجموعہ ہے۔ یہ بے چارہ قلیل وحقیر بدن اپنے عظیم وکثیر مخزن پر کیا غالب آ سکتا ہے۔ بلکہ انسان کی یہ غیر معمولی قوت اور قوت کی یہ غیر معمولی کرشمہ آرائیاں درحقیقت اس کی روح کی بدولت نمایاں ہو رہی ہیں کہ روح کی لطافتوں کی کوئی حد نہیں اور وہ مجموعۂ لطافت سفلی وعلوی ہے، جس سے یہ ثابت ہو گیا کہ روح تمام مادیات اور تمام عناصر سے اقویٰ والطف ہے، پس جہاں ذاتِ بابرکاتِ حق نے عالمِ آفاق میں اپنی مثالیں رکھی تھیں تاکہ اس کے کمالاتِ ظاہرہ در آیاتِ چیدہ کا کسی حد تک ادراک واحساس ہو سکے۔ اسی طرح بلکہ ان سے بدرجہا زائد جو مخصوص مثالیں ہمارے انفس میں رکھ دیں تاکہ ان شئون باطنیہ اور کمال بطون در بطون تک ہم بقدرِ استعداد کچھ رسائی پا سکیں۔

﴿سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ ۗ أَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ أَنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ﴾ ① ”ہم عنقریب ان کو اپنی نشانیاں ان کے گرد ونواح میں دکھائیں گے اور خود ان کی ذات میں بھی یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ وہ حق ہے۔ کیا آپ کے رب کی یہ بات کافی نہیں کہ وہ ہر چیز کا شاہد ہے“۔

غرض مادی سائنس کی یہ کرشمہ سازیاں جن کی طرف تمہید میں میں اشارہ کر چکا ہوں، دیکھنے میں بدن اور بدنی عناصر سے نمایاں ہو رہی ہیں۔ مگر بلحاظِ حقیقت یہ سب کچھ روح کا طفیل ہے جس کی مخفی طاقتیں اس چورنگ مادہ کو نچاتی رہتی ہیں اور مزدور کی طرح چین سے نہیں بیٹھنے دیتیں۔

روح کی طاقتوں کا غلط استعمال...... لیکن سوال یہ ہے کہ روح نے اپنے یہ باطنی کمالات صرف کرنے میں جس قدر جدوجہد کی اور ترکیب وتحلیل کے ذریعہ آگ پانی، ہوا، مٹی کے جس قدر بھی عجائبات موالید ثلاثہ میں نمایاں کئے۔ اس سے خود روح کو کیا نفع پہنچا؟ اور روح کو بحیثیتِ روح اس جدوجہد سے کیا شرف حاصل ہوا؟

ظاہر ہے کہ اول تو ان تمام سائنسی ایجادات کا نفع روح کو کچھ نہیں، صرف بدن ہی کو پہنچا۔ بدن کی راحت اور جسمانی عیش ہی میں اضافہ ہوا۔ سردی میں آگ کی حرارت گرمی میں پانی کی تبرید، برسات میں ہوا تفریح بدن ہی کے لئے ہے، روح نہ سردی کی محتاج نہ گرمی کی کہ حرارت وبرودت روح کے اوصاف ہی نہیں، اسی طرح ہوائی جہاز نے اگر فضا میں اڑایا تو بدن کو، ورنہ روح جیسی لطیف چیز اڑنے کے لئے اس وزنی اور کثیف طیارہ کی حاجت ہی نہ تھی۔ مرنے کے بعد وہ نامعلوم کہاں کہاں اڑتی ہے تو کون سے ہوائی جہاز اس کے لئے جاتے ہیں، پھر سوچو کہ خود ہوا کو اڑنے کے لئے کسی ہوائی جہاز کی ضرورت ہے؟ ہوا تو خود ہی جہاز کو اڑاتی ہے۔ تو جو روح ہوا سے بھی لطیف تر ہے اور جس نے خود ہوا ہی کو مسخر اور قید کر رکھا ہے بلکہ ہوا کے خلافِ طبع اسے جگہ جگہ اڑا رکھا ہے، وہ اپنے اڑنے میں اس کی کیا محتاج ہوتی؟ اور جب اس کی محتاج نہیں تو اس کے بھی محتاجوں یعنی طیاروں کی محتاج کیسے ہو سکتی ہے؟

---

① پارہ: ۲۵ ، سورۃ فصلت ، الآیۃ: ۵۳ .

اس طرح ریلوں اور موٹروں سے روح کو کیا فائدہ؟ ریل اور موٹر اپنے وجود و ظہور میں خود ہی روح کے محتاج ہیں تو روح کو ان کی احتیاج کیا ہو سکتی ہے۔ اس لئے ان تمام مادی کرشمہ آرائیوں اور سائنسی ایجادات کا نفع اگر ہو سکتا ہے تو صرف بدن ہی کے لئے، نہ کہ روح کے لئے۔ ریل اور موٹر میلوں کو منتقل کر سکتے ہیں تو بدن کو، برق اور گیس اگر ضیا پاشی کر سکتے ہیں تو اجسام پر، نہ کہ ارواح پر، جن کے نور سے خود ہی وہ ظہور میں آئے۔ گراموفون، ٹیلی فون، ٹیلی گراف اور لاسلکی وغیرہ اگر منقطع کر سکتے ہیں تو اجسام کو، ورنہ روح اپنی حقیقی قوتوں کے لحاظ سے ان اپنے پروردوں کی کیا محتاج ہو سکتی ہے۔

پس ان تمام اسباب راحت کی راحت رسانی بدن تک محدود نکلی اور بدن کیا ہے؟ وہی عناصر اربعہ کا مجموعہ اور آگ، پانی، ہوا، مٹی کا گھروندہ، تو یوں کہو کہ آپ نے ان آگ پانی کی ایجادات کے ذریعہ آگ پانی ہی کو نفع پہنچا دیا۔ بالفاظ دیگر آپ نے باہر کا آگ پانی لیا اور اندر کے آگ پانی تک پہنچا دیا اور اب روح کا کام یہ رہ گیا کہ وہ اپنے علم و ادراک کا سرمایہ آفاقی آگ پانی پر خرچ کرتی رہے اور یہ بیرونی آگ پانی بدن کے آگ پانی کو دیتی رہے۔ یعنی جسم کی خدمت گزاری میں ہر وقت مصروف رہے، اس کے صاف معنی یہ نکلتے ہیں کہ آپ نے روح کو جو ان عناصر سے لطیف تر اور بالاتر تھی اور جو ان پر حکمرانی کر رہی تھی، آپ نے دھوکہ دے کر اسے جسم جیسی کثیف چیز یا بعنوان دیگر عناصر کا غلام بنا دیا۔ ایک لطیف چیز کو کثیف کے تابع کر دیا اور بہ تعبیر دیگر آپ نے لطیف روح کو خود اسی کی لطافت مٹانے میں استعمال کیا جو قلب موضوع ہے، پس اب اس مسکین روح کی مثال ایسی ہوگی، جیسے ایک عالم و فاضل بادشاہ جس سے ملک و قوم کو بڑے بڑے منافع کی توقع ہو اور جس کے حسن سیاست ورکمال تدبیر سے ملک کے رفاہ و بہبود کی ہزارہا امیدیں وابستہ ہوں، باوجود اس علم و فضل کے اس کے مزاج میں کوئی چالاک اور کمینہ غلام دخیل ہو کر رسوخ پالے اور اپنی ذاتی اغراض و منافع میں بادشاہ کو استعمال کرنے لگے اور ملک کا پیٹ کٹوا کر صرف اپنا تنور شکم بھرنے کی فکر میں لگا رہے، ادھر بادشاہ غلام کی چکنی چپڑی باتوں میں آ کر اسی کا کہا کرنے لگے، وزراء لاکھ سمجھائیں، نصائح کریں اور منت و سماجت سے بادشاہ کو راہ راست لانے کی کوشش کریں لیکن یہ کمینہ غلام کسی کی نہ چلنے دے بلکہ الٹا وزراء سے بدظن کر دے اور بادشاہ کے وسیلے اور ذرائع معلومات کو چہار طرف سے مسدود کر کے صرف اپنے ہی ڈھنگوں پر لگا لے یا گویا زمام سلطنت بظاہر تو بادشاہ کے ہاتھ میں ہو۔ لیکن حقیقتاً بادشاہ کے پردہ میں یہ کمینہ غلام حکومت کر رہا ہو۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں حکومت کا قضیہ برعکس ہو جاتا ہے۔ جو حاکم تھا محکوم ہو گیا اور جو محکوم تھا وہ حاکم ہو گیا۔

اور سب جانتے ہیں کہ ایسی مملکت جس میں کمینے برسر اقتدار آ جائیں اور اشراف دھکے کھاتے پھریں، دیرپا نہیں ہو سکتی بلکہ ایسے ملک کی تباہی کے آثار جلد سامنے آنے لگیں گے اور نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ بادشاہ معزول کر دیا جائے گا اس کی امارت و سلطنت چھن جائے گی۔ ادھر آپ خود سمجھ لیں کہ انقلاب سلطنت کے بعد اس کمینہ ملازم کا

کیا حشر ہوگا؟ وہی اس کے وسائلِ عمل اور اعضاءِ کار جو ان خود غرضیوں میں اس کے ہمنوا اور مددگار تھے، خود اسی کے خلاف گواہی دیں گے اور اپنے کو تباہ ہوتے دیکھ کر پہلے خود اسی کو تباہ کرنے کی کوشش کریں گے جس سے ہر صورت میں سب سے زیادہ یہی کمینہ قابلِ گردن زدنی قرار پائے گا اور اس کے لیے ملک کے کسی گوشہ میں پناہ نہ ہوگی۔

ٹھیک اسی طرح سمجھ لو کہ روح ایک عالم فاضل ہے، جس میں محسوسات معقولات اور وجدانیات کے پاکیزہ ملکات ودیعت ہیں جو کائنات بدن ہی میں نہیں بلکہ اس کے واسطہ سے کائنات عالم پر حکمرانی کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے، عقل اس کا وزیرِ اعظم ہے اور نقل اس کا قانون ہے، مگر ساتھ ہی اس کا ایک کمینہ اور بدذات خادم بھی ہے، جس کے واسطے سے ملک میں شاہی احکام جاری ہوتے ہیں تاکہ وزراء وعمائد ان کا نفاذ کریں۔ وہ کمینہ خادم یہ بدن ہے جو عناصرِ اربعہ کا مجموعہ ہے۔ کمینہ اس لئے ہے کہ جس قدر بھی اس کے اجزاء ترکیبی ہیں، سب بے شعور، ناعقل، جاہل، اور بے تمیز ہیں۔ جن میں اچھے برے کا کوئی امتیاز نہیں۔ کمینگی کی یہ حالت کہ جو ان سے زیادہ محنت کرکے ان کا قرب حاصل کرے، اسی کے سب سے زیادہ دشمن اور قاتل بن جاتے ہیں۔

ایک انسان مٹی کی مورتوں اور پتھر کے وزنی بتوں کے سامنے کتنے ہی طویل زمانہ تک سجدے کرتا جائے، لیکن اگر وزنی مورت اوپر سے آگرے تو پہلے اپنے اس مقرب پجاری کا سر پھوڑے گی، اسے قطعاً خیال نہ ہوگا کہ یہ میرا محب اور عبادت گزار بندہ ہے، مجھے اس کا سر نہ کچلنا چاہئے بلکہ میرا یہ معاملہ صرف ان لوگوں کے ساتھ ہونا چاہئے جو مجھ سے بعید تر ہیں، اور معبودانہ عظمت کو تسلیم نہیں کرتے۔

اسی طرح ایک شخص اگر سینکڑوں برس بھی کسی دریا کے پانی کے سامنے ڈنڈوت کرے، ناک رگڑے اور عابدانہ التجائیں کرے کیونکہ جب بھی سیلاب کی رو آئے گی تو پہلے اسی کو غرق کرے گی جو اس سے زیادہ قرب حاصل کئے ہوئے ہوگا۔ اسے قطعاً یگانے اور بیگانے کی تمیز نہ ہوگی۔ ایک مجوسی برسہابرس بھی آتش کدہ میں سربسجود رہے۔ لیکن آگ اس کی اعانت نہیں کرسکتی بلکہ اس کی پہلی لپیٹ اپنے اسی مقرب کو پہلے پھونکے گی۔ ہوا پرست ہزار ہوائی باتوں میں رہیں لیکن ہوائے نفس کے جھکولے پہلے صاحبِ ہوا ہی کو غارت کریں گے، دوسروں تک نوبت کہیں بعد میں آوے گی۔ آپ تمدن کے سلسلہ میں ہی دیکھ لیں کہ جو زیادہ سے زیادہ مادیات کے عاشق ہیں، وہی مادیات کے ہاتھوں میں زیادہ تباہ و برباد بھی ہیں۔ مشینوں کی لپیٹ میں وہی زیادہ آتے ہیں۔ جو مشینری میں رات دن مبتلاء عمل ہیں، ہوائی جہازوں سے زیادہ وہی تباہ ہوتے ہیں، جو ان سے زیادہ مزاولت اور مقاربت رکھتے ہیں۔

ڈریڈنات اور وزنی آلات جنگ سے وہی لوگ زیادہ ختم ہورہے ہیں، جو ان آلات کے سامنے سربسجود ہیں، گیس اور زہریلے ٹینک رائفلیں اور ریوالور، کارتوس اور بارود سے انہیں کا خاتمہ زیادہ ہورہا ہے جو ان کے عشق میں جان باختہ ہیں اور کبھی بھی مادیت کے ان روشن آثار کو ادھر التفات نہیں ہوتا کہ جو ہمارے موجد اور غلام بے درہم ہیں اور جنہوں نے اپنی جانوں ہی کو نہیں بلکہ ایمانوں کو بھی ہم پر نثار کردیا ہے، کم از کم انہیں تو اپنا نشانہ نہ

بنائیں، انہی کو جا کر تباہ کریں جو بے لگاؤ رہ کر ہم سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔

پس اس سے زیادہ مادیات کی کمینگی اور سفلہ پن اور کیا ہوسکتا ہے کہ انہیں نہ صرف دوست دشمن کا کوئی بھی امتیاز نہیں بلکہ جوان کا زیادہ دوست ہے، اس کے زیادہ دشمن ہیں، سفلہ پن کی اسی پر حد نہیں، بلکہ مزید برآں یہ بھی ہے کہ جو ان کا دشمن ہے، اسلئے اس کے قدموں میں پڑ کر دعوی دوستی کرتے ہیں، پس ان کی اطاعت شعاری علم وشعور سے نہیں، فاضلانہ اخلاق سے نہیں، بلکہ جوتے کے زور سے ہے اور یہ واضح رہے کہ اخلاق کے جہاں میں دباؤ کو اطاعت نہیں کہا جاتا، پس جن عناصر کے سفلہ پن کی یہ حالت، ہو ان سے مرکب شدہ بدن سے کب کسی خیر کی توقع کی جاسکتی ہے؟! او ایسے بدن کے لئے اگر کمینہ کا لقب اختیار کیا جائے تو کیا حرج ہے؟

قوائے روح کے غلط استعمال کا نتیجہ حرمان وخسران ہے...... بہرحال اس نالائق اور کمینہ غلام (بدن) نے اپنے ذاتی تعیش کی خاطر روح کو اپنے ڈھب پر لگالیا، عقل و دور اندیشی سے برسر پیکار کردیا، قانونِ نقل کو طاق نسیان پر پھینکوا دیا حظوظ نفس کی تحصیل اور عاجل منافع سے لاپرواہ بنادیا اور اس غفلت زدہ روح نے اپنی تمام کمالاتی قوتوں سے وہ حظوظ حاصل کرنے شروع کردیے، جن کا نفع فقط اس چورنگ مادہ یا کمینہ غلام ہی کو پہنچ سکتا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بدن کو تو کچھ مل گیا، مگر روح خالی ہاتھ رہ گئی بلکہ جو کچھ بھی اس نے حاصل کرنے کا عزم باندھا تھا اس میں بھی خود اس غلام ہی کی محتاج ہوگئی۔ وہ روح جو کہ کمالاتِ ربانی کا نمونہ ہونے کے سبب استغناء کی اعلیٰ شان رکھتی تھی اور کسی کی محتاج نہ تھی، وہ اپنے اس لاعقل بدن کی محتاج ہوگئی جو ہر جہت سے خود اس کا محتاج تھا۔ وہ غنی روح جس سے ان تمام وسائل کار کا وجود تھا، وہ اپنے ہر عمل میں خود ان وسائل کے ہاتھوں کو دیکھنے لگی ور وہ روح جو کبھی مسجود ملائک بنی تھی، آج عبدالاسباب بن کر اپنے ہی باندی غلاموں کو سجدے کرنے لگی اور اس درجہ عناصر کی غلام بن گئی کہ اگر مادی وسائل اس کے ہاتھ میں نہ ہوں تو وہ بیکار اور اپاہج ہے۔ اندریں حالات اس روح نے اپنی علمی طاقتوں سے مادی منافع کا ایک تمدن تو قائم کیا مگر اپنے ان جوہری کمالات کو کھو کر جو اس کے جزو نفس ہوتے اور ہر موقع پر اس کے ساتھ رہتے، وہ شہر میں ہوتی یا جنگل میں، اسباب کے ہجوم میں ہوتی یا بے وسیلہ، ہر جگہ اپنا جوہر نمایاں کرسکتی۔ لیکن یہ غلام اور غلام پسند روح محتاجگی کے اس درجہ پر آگئی کہ اگر شہر میں ہے اور شہر بھی وہ جہاں بجلی سسٹم اور ایٹم کی طاقت مہیا ہو تو باکمال ہے۔

ریڈیو سے خبر بھی دے سکتی ہے، ٹیلیفون کرسکتی ہے، ٹیلیگراف سے آواز بھی پہنچا سکتی ہے، کیمرہ ہو تو فوٹو بھی اتار سکتی ہے، لیکن اگر وہ دیہات میں ہو، جہاں ان مادی وسائل کا وجود نہ ہو یا شہر ہی میں ہو مگر بجلی فیل ہوجائے یا دشمن بڑھ کر برقی تاروں کو کاٹ دے تو یہ پھر روح اپاہج اور لنگی ہے۔ اس کا حاصل بجز اس کے اور کیا نکلتا ہے کہ یہ روح اپنے اصلی اور جوہری کمالات تو بے عقل کے حوالہ کرکے خود کوری ہو بیٹھی، جو محتاجگی اور غلامی کی بدترین مثال ہے۔

حالانکہ روح تو وہ تھی جو شئونِ ربانیہ کی جامع تھی، وہ علم اور معرفت کا ایک حظ وافر لے کر آئی تھی، وہ

لطافتوں اور طاقتوں کا خزانہ تھی، اس کا استغناء اور کمال غیرت تو یہ ہونا چاہئے تھا کہ وہ اپنے کسی فعل میں بھی اپنے باندی غلاموں اوران بے شعور اور اپاہج مادوں کی محتاج نہ ہوتی۔ وہ اگر دیہات میں بیٹھ کر جہاں نہ بجلی نہ فون ہوتا نہ گیس کا خزانہ، اگر وہ آواز نکالتی تو وہ آواز مشرق سے مغرب تک پہنچ جاتی، وہ اگر ایسی جگہ نقل وحرکت پر آتی، جہاں نہ ریل ہوتی نہ موٹر اور طیارہ، تو سیکنڈوں میں ہزار ہا میل کا سفر طے کر لیتی۔ وہ اگر دیکھنے پر آتی تو ایک تنگ و تاریک کونہ میں بیٹھ کر ساری دنیا ہی کی نہیں عرش عظیم تک کی کائنات کا معائنہ کر لیتی۔ زمین اس کے لئے سمٹ جاتی ہوائیں اس کے لئے مسخر ہوتیں، زمانہ اس کے لئے سمٹ جاتا، وہ سیرابی وتری میں دریاؤں کے رحم وکرم کی محتاج نہ ہوتی بلکہ دریا خود ہی اپنی روانی اور طغیانی میں اس کے اشاروں کو دیکھتے۔ وہ جنگ وقتال میں لوہے اور ہتھیاروں کی محتاج نہ ہوتی بلکہ جس پر ہاتھ ڈالتی وہی اس کے لئے ہتھیار ہو جاتی اور یہ سب کچھ اس لئے ہوتا کہ یہ مادی اور عنصری آلات جب کہ اس عنصری لطافت پر ایسی طاقتوں کے کام کر سکتے تھے۔

تو روح نہ صرف ان سب لطافتوں کی جامع ہی تھی بلکہ ان سے ہزار ہا گنا بڑھ چڑھ کر لطافتوں کا ایک عمیق خزانہ تھی اور انہی لطافتوں کے سبب اس مالک الملک کی ذات پاک سے مناسبت تامہ رکھتی تھی۔ جو اپنے کسی کام میں وسائل کی محتاج نہیں بلکہ وسائل ہی اپنے وجود میں اس کے محتاج ہیں، تو ضروری تھا کہ روح ربانی کی شان بھی ایسی ہوتی ہو کہ وہ اپنے کاروبار میں ایک لمحہ کے لئے بھی ان مادی وسائل کی محتاج نہ ہو۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ بجلی تو پل بھر میں آسمانوں پر چڑھ جائے، اور جو روح بجلی کو مسخر کرنے کی طاقت رکھے، وہ زمین سے ایک انچ بھی بجلی کی مدد کے بغیر اوپر نہ اٹھ سکے۔ کیا وجہ ہے کہ ایک انجن تو اپنی آگ پانی کی اندرونی طاقت سے مشرق ومغرب کو ایک کر ڈالے اور جو انسان خود انجنوں میں یہ طاقت مہیا کرنے کی قدرت رکھتا ہے، وہ ایسی سریعانہ حرکتوں میں ایک قدم بھی نہ اٹھا سکے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ تار اور ٹیلیفون کی برقی رو تو ہزار ہا میل کی خبریں منٹوں میں لے آئے اور وہ انسان جو مشینریوں میں خود بجلی کی روح کو پھونکتا ہے، ایک میل بھی از خود اپنی آواز نہ پہنچا سکے۔

بہر حال اگر مادیات سے ایسے عجائبات کا ظہور ہو سکتا ہے اور وہ بھی بہ طفیل روح، تو خود روح اور روحانیت سے تو ایسے ہی نہیں، بلکہ ان سے کہیں بڑھ چڑھ کر عجائبات کا کارخانہ کھل جانا چاہئے تھا، تاکہ اس غیر محتاج روح کے استغناء وغیرت کا پورا پورا ظہور ہو سکتا ورنہ یہ کیسی الٹی بات ہے کہ مسخر تو طاقتور اور مالک کلیۃً ضعیف ولاچار غلام تو حکمران اور بادشاہ مجبور وبے بس۔

روحانی طاقتوں کے محیر العقول کارنامے..... آپ اسے کوئی خیالی بات یا محض کوئی علمی نظریہ نہ سمجھیں، بلکہ حقیقتاً روح جب بھی اپنی اصل فطرت پر چلی ہے تو اس سے بلاواسطۂ اسباب ایسے ہی عجائبات کا ظہور ہوا ہے اور اس نے مادوں سے اپنی غلامی کرا کر انہیں اپنی روحانیت کے بل بوتے پر خوب نچایا۔

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے منبر نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر خطبہ پڑھتے ہوئے اچانک "یَا سَارِیَةُ الْجَبَلَ" ① کی صدا مدینہ سے نہاوند کی پہاڑیوں تک عراق میں پہنچادی حالاں کہ اس وقت تک لاسلکی کا خواب بھی کسی کو نہ آیا تھا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مقام ابراہیم پر کھڑے ہوکر اعلان حج کی ندا دی تھی، وہ عالم کے گوشہ گوشہ میں ہی نہیں بلکہ ماؤں کے رحموں میں چھپے ہوئے بچوں کے بھی کانوں میں گونج گئی حالاں کہ وہ کسی مکبر الصوت آلہ کے ذریعہ نہیں دی گئی تھی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آسمان کے ایک نئے دروازہ کے کھلنے کا تڑاکہ زمین پر بیٹھے بیٹھے سن لیا جو کہ یقیناً کسی برقی آلہ کے ذریعہ نہیں سنایا گیا تھا۔ آپ نے جہنم کے قعر میں ایک پتھر کے گرنے کا دھماکہ دنیا ہی میں سن لیا جو ستر برس میں اس کی تہ تک پہنچا تھا حالانکہ یہاں بھی کوئی حسی اور مادی آلہ صوت استعمال میں نہیں لایا گیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حارث ابن ابی خرار کے فدیہ کے اونٹ اور لونڈیاں مع تعداد، اس کے بتلانے سے پیشتر ہی بتلا دیں حالاں کہ وائرلیس کے ذریعہ بعید کی خبریں دینے کی کوئی بھی ایجاد اس وقت تک نہ ہوئی تھی۔

آپ نے وحی الٰہی سے پتہ دیا کہ کسی بشر کی زبان سے کوئی کلمہ نہیں نکلتا کہ وہ محفوظ نہ کر لیا جاتا ہو ﴿مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ﴾ ② حالاں کہ اس وقت ریڈیو کی برقی لہروں کے ذریعہ ہوا کی آوازیں جذب کرنے والوں اور ان کے نظریوں کا کوئی نشان بھی نہ تھا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ موتہ کے پورے نقشۂ جنگ کو مسجد نبویؐ کے منبر ہی سے معائنہ فرما کر حاضرین کو پتہ دے دیا حالانکہ وہاں آج کے آلات خبر رسانی کی بود و نمو نہ تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مکے کے حرم میں بیٹھے ہوئے مسجد اقصیٰ کی محرابیں اور طاق تک دیکھ کر گن دیئے حالاں کہ اس وقت تک دوربین کی کوئی ایجاد کسی کے حاشیہ خیال میں نہ تھی۔ اس سے آگے بڑھ کر صلوٰۃ خوف میں انہی عرب کی وادیوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت ونار کا مشاہدہ فرمالیا۔ عرفات کے میدان میں شیطان کو ویل وثبور کرتے ہوئے دیکھ لیا۔ یوم بدر میں ملائکہ مسومین کی فوجوں کے پرے مشاہدہ فرمالئے اور ایک شب تار میں غیبی حقائق یعنی فتن وآلام کے نزول تک کا معائنہ فرمالیا، حالانکہ وہاں مادی شیشوں کی کوئی دوربین درمیان میں نہ تھی۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے تخت سلیمانی پر فضا میں پروازیں کیں اور ہوائیں ان کے اشاروں پر چلیں حالاں کہ آج کے ہوائی جہازوں کی ساخت کی طرف اس وقت کوئی ادنیٰ التفات بھی کسی کے ذہن میں نہ تھا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف فضاء آسمانی بلکہ سارے ہی آسمانوں کا سفر لمحوں میں طے فرمالیا۔

---

① احیاء علوم الدین، باب فی اکتساب المعرفة لامن التعلم... ج: ۳ ص: ۲۲۷۔ مرقاة المفاتیح شرح مشکاة المصابیح، کتاب المناقب، باب مناقب عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، ج: ۱۷، ص: ۳۷۳۔

② پارہ: ۲۶، سورۃ ق، الآیۃ: ۱۸۔

حالانکہ وہاں کسی پیٹرول وغیرہ کو واسطہ اس سیر میں نہ تھا کہ طیاروں کا تخیل بھی کسی کے ذہن میں نہ تھا اور طیارے ہوتے بھی تو انہیں آسمانی سیر سے کیا علاقہ ہوتا۔ اس طرح کے ہزارہا واقعات بطون تاریخ میں منضبط ہیں، جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ روحانی قوتوں کے مالک مادوں کے محتاج بھی نہیں ہوتے۔ بلکہ مادیات ہی نے ان کے اشارۂ چشم ابرو پر ہمیشہ کام کیا اور ان کی غلامی کی۔

خلاصہ یہ ہے کہ روح کی اصل شان استغناء ہے کہ وہ اپنے منبع وجود ذات حق سے وابستہ رہ کر اور اسی کے ساتھ اپنی مناسبتوں اور متعلقوں کو معمول رکھ کر اپنے کسی فعل میں ان مادیات کی جو اس سے بدرجہا کمتر ہیں محتاج نہ ہو جیسا کہ اس کی فطری لطافتوں کا تقاضا ہے۔ اور جس کی متعدد مثالیں انبیاء علیہم السلام کے معجزات، اور اولیاء اللہ کے کرامات وخوارق سے پیش کی گئیں، جن میں ایک لمحے کے لئے مادیت سے کوئی مدد نہیں لی گئی بلکہ وہ محض روحانی آثار کے مظاہرے ہیں جن میں مادیات کو روحانیت کے سامنے جھکنا پڑتا ہے۔

مادی تصرف کوئی حقیقی کمال نہیں…… بہرحال روحانی اقتدار کے ان ثابت شدہ نمونوں اور خوارق کی ان سچی مثالوں سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ایک باکمال روح کا اصل کمال درحقیقت مادیت سے مستغنی ہونے اور مادی وسائل کی گرفت سے آزاد ہو جانے میں پنہاں ہے، ورنہ کسی روح کا مادیات میں مادی وسائل کے ذریعہ تصرفات کر لینا خود روح کا کوئی مخصوص کمال اور ممتاز کارنامہ نہیں ہے۔ یوں تو ایک مادہ بھی مادہ میں بلا واسطۂ روح تصرف کر لیتا ہے۔

کہیں مٹی اور غبار اڑ اڑ کر بھی چند صدیوں میں دریا کو خشکی بنا دیتا ہے۔ رواں پانی نشیب میں نئے نئے نکاس نکال کر برّ کو بحر اور بحر کو برّ کر دیتا ہے۔ کوہ آتش فشاں پھٹ کر خشک فضا کو کرۂ نار بنا دیتا ہے۔ ہوائیں چل چل کر تالابوں اور جھیلوں کو خشک کر دیتی ہیں۔ پس مادہ میں تصرفات کر لینا اگر کوئی کمال ہے تو یہ کمال تو خود مادی قوتیں بھی کر دکھاتی ہیں، جہاں روحانیت کا کوئی توسط نہیں ہوتا، پس اگر انسان کی افضلیت ان عناصر سے بدرجہا افضل ہے اور ضرور ہے اور اگر وہ عناصر کے تینوں موالید میں اعلیٰ واشرف ترین نوع ہے، اور بلاشبہ ہے تو اس کا مابہ الفخر یا مابہ الامتیاز کمال وہ نہیں ہو سکتا، جو اس سے ارذل ترین اشیاء سے بھی سرزد ہو سکتا ہے۔ خصوصاً جب کہ روح کے یہ تصرفات بھی ان مادیت ہی کے واسطے سے ہوں، گویا روح ان کی وساطت کے بغیر اس تصرف پر بھی قادر نہ ہو تو پھر روح کے لئے یہ کمال ہی نہیں بلکہ ایک کھلا ہوا عیب ہوگا کہ اپنے سے ارذل ترین اشیاء کی محتاج بن جائے اور اپنا کمال ان سے ڈھونڈنے لگے۔ کیوں کہ کسی کامل کے لئے عیب کی جڑ استکمال بالغیر ہے۔ جب کہ وہ غیر اپنے سے ارذل اور کمتر ہو، ہاں اپنے سے برتر سے استکمال کرنا عیب کی بجائے ایک بہترین ہنر ہے۔ کیوں کہ بلا استکمال بالغیر اپنی ذات سے خود بخود باکمال ہونا صرف ذاتِ بابرکات حق ہی کی شان ہو سکتی ہے جو ہر عیب سے منزہ اور ہر کمال کا منبع ومخزن ہے۔ مخلوق کسی حال میں بھی بے عیب محض نہیں ہو سکتی اور کچھ بھی نہیں تو مخلوقیت کا عیب تو اس سے ہٹ ہی نہیں سکتا۔ جس کی حقیقت عدم اصلی لاحقہ ہے اور جب کہ مخلوق ذات کے درجہ میں معدوم تھی تو گریز

ہے کہ درجۂ ذات میں کمالات سے عاری بھی ہو کہ عدم ہی تمام نقائص وعیوب کا منبع ہے اور ظاہر ہے کہ پھر اس عیب دار کے باکمال بننے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ وہ اسی منبع وجود ذات (یعنی حق جل مجدہٗ) کی طرف رجوع کر کے استکمال کرے، جو کمالات کا مخزن اور عیوب سے مبرا ہے۔ نہ یہ کہ حصول کمال کے لئے اپنے سے ارذل ترین چیز (مادہ) کی طرف جھکنے لگے کہ محصول کمال کے لئے اپنے بدن یا مادّیت کی طرف جو مجموعہ عناصر ہے، رجوع کرے گویا آگ پانی ہوا مٹی سے کمال کا جویا ہو تو وہ استکمال نہیں بلکہ ازالۂ کمال اور استحصالِ نقص ہے کہ اپنے سے ارذل کی احتیاج وغلامی ہے اور گویا سلاطین کا غلاموں کی بندگی کرنا ہے جو خود ایک بدترین اور شرمناک عیب ہے، پس اگر سائنس کی حقیقت یہی ہے کہ انسان مادہ کے ذریعہ مادوں میں تصرفات کرنے پر قادر ہو جائے تو اس صورت میں انسان آگ پانی کے گھروندہ سے باہر ہی نہیں نکلتا کہ اسے حقیقی انسانیت کا حامل بھی کہا جائے بلکہ ایک ناقص اور عیب دار انسان ثابت ہوتا ہے، جس کا عیب بھی حد سے گزر کر شرمناک ہو، ورنہ کم سے کم کوئی ایسا ہنر تو کسی سے بھی ثابت نہیں ہوتا جس سے انسانیت کی کوئی امتیازی شان ہویدا ہوتی ہو۔

انسان میں محتاجگی کا اصل مادہ ہے...... ہاں اگر مادہ میں کچھ بھی استغناء کی شان ہوتی تب بھی ممکن تھا کہ اس کی غلامی سے تھوڑا بہت استغناء ہی ہاتھ لگ جاتا۔ لیکن جب کہ خود اس کی اصل اور ذاتی صفت ہی محتاجگی اور پابستگی ہے اور گویا مجبوریت ہی اس کی شانِ امتیاز ہے تو اس کی غلامی سے استغناء تو کیا حاصل ہوتا، حاصل شدہ استغناء بھی فنا ہو جائے گا، اور مجبوری در مجبوری پیدا ہو جائے گی جو تمام ذلتوں کی جڑ ہے، پس روح جیسے مستغنی، جوہر کا مادہ جیسے مجبور ومحتاج عنصر کی دہلیز پر جھکنا حقیقتاً اپنی امتیازی شان کو فنا کر دینا ہے۔

عناصر اربعہ کے اخلاق اور ان کی محتاجانہ خاصیتیں...... ہاں اب یہ معمہ حل طلب رہ جاتا ہے کہ اس چورنگ مادہ میں ذاتی محتاجگی کیوں ہے اور کہاں سے آئی ہے؟ سو ظاہر ہے کہ ہر چیز کی خیر وشر اس کے طبعی اخلاق سے پھوٹتی ہے، اس چورنگ مادہ کے جبلّی اور طبعی اخلاق ہی سراپا احتیاج وغلامی ہیں، اس لئے انسانی نفس جس حد تک بھی مادّہ اور مادّیات کا شغل قائم رکھے گا۔ اسی حد تک محتاجگی اور غلامی کا اکتساب کرتا رہے گا چونکہ انسان کے نفسِ امارہ کی نشو ونما اور امتزاج انہی عناصر اربعہ سے ہے۔ اس لئے وہ انسان کو پستی ودنائیت اور محتاجگی کی طرف سے لے چلتا ہے، جو درحقیقت عناصر کی طبعی اور خاموش رہنمائی ہوتی ہے۔ اگر اس انسانیت پر روحانیت کا نور فائز نہ کیا جائے یا وہ اپنی روحانیت کی پناہ میں نہ آئے تو یہ چورنگ مادہ اور اس کے جبلی اخلاق ایک لمحہ کے لئے بھی اسے محتاجگی اور بے بسی کی دلدل سے نہیں نکلنے دے سکتے کہ مادہ کی خلقت وجبلت ہی بے بسی اور محتاجی ہے۔

مٹی اور اس کے جبلّی اخلاق...... چنانچہ اولاً مٹی ہی کو لے لیجئے اور غور کیجئے کہ اس کی جبلّی اور بنیادی خاصیت کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ اس کی حسی خاصیت تو پستی اور تسفل ہے اور معنوی یا اخلاقی خاصیت قبض اور بخل ہے، چنانچہ جو چیز بھی زمین میں رکھ دی جائے اسے دبا لے گی اور جب تک آپ اس کا جگر چاک کر کے خود ہی نہ نکالیں، نہ دے گی،

آدم کی اولاد کے نامعلوم کس قدر خزانے اور کتنے دفینے اس نے اپنے بطن حرص وآز میں چھپا رکھے ہیں اور اس کا پیٹ چاک کر کے نکال لو تو فبہا، ورنہ از خود اطلاع نہ دے گی، نہ چیز دے گی۔ آپ زمینی کشت زار کو دیکھ کر خیال نہ کریں کہ زمین تو بڑی فیاض ہے، جو ایک کے سو کر دیتی ہے اور کھیتوں کے ذریعہ اس کے جود وسخا کی داستانیں سنانے لگیں، کیوں کہ دانہ خود آپ کا ہے جس میں زمین کا دخل نہیں اور اگر وہ زمین سے حاصل شدہ بھی ہے تو وہ بھی کسی ڈالے ہوئے دانے کا طفیل ہے نہ کہ خود زمین نے دانے اور بیج کی ایجاد کی ہے، اس سے واضح ہے کہ سب سے پہلی اور ابتدائی کھیتی کا بیج یقیناً باہر سے زمین میں ڈالا گیا ہے نہ کہ زمین نے ابتداء کی ہے، پس دانہ یقیناً آپ کا ہے نہ کہ زمین کا، اس لیے داد و دہش کی ابتداء زمین سے نہیں ہوئی بلکہ انسان سے ہوئی۔ پھر دانہ ڈال کر اس کو محفوظ رکھنے، بڑھانے اور پھر نکالنے کے سامان بھی آپ ہی کی طرف سے ہیں، اگر پانی نہ دیا جائے تو زمین اصل بیج کو بھی سوخت کر دیتی ہے، چہ جائیکہ اسے باقی رکھ کر بڑھائے، پس پانی دینا درحقیقت بیج کو باقی رکھنا، بڑھانا اور بڑھا کر اس میں سے دوسرا دانہ کھینچ لینے کا ایک آلہ ہے، اس لیے زمین نے نہ محض از خود بیج کو بڑھا نہ دیا، بلکہ پانی کا لشکر بھیج کر آپ نے جبراً اس سے راس المال مع سود کے منگوا لیا۔ اس لئے زمین کا ذاتی خاصہ قبض و بخل بحالہٖ ثابت شدہ رہا۔

اب جب کہ یہی قابض اور بخیل مادہ انسان کا جزو اعظم ہے اور وہ مشت خاکی کہلایا۔ تو جبلی طور پر اس کے نفس میں پہلا خلق یہی قبض اور بخل کا سرایت کرتا ہے چناں چہ پیدا شدہ بچہ کو ذرا بھی ہوش آتا ہے تو وہ قبض اور بخل یعنی لینے اور ہضم کرنے کے لئے چیختا ہے نہ کہ دینے اور ترک کرنے کے لئے، آپ جو چیز بھی بچہ کے سامنے ڈال دیں گے، اسے اٹھائے گا اور طبعی تقاضے سے منہ کی طرف لے جائے گا تا کہ اسے قبض کر کے ہضم کر جائے، اسے دیتے رہو تو خوش رہے گا، چھیننے لگو تو چلائے گا۔ پس جبلی طور پر اس کی طبیعت سخا اور ایثار کی طرف نہیں جاتی، بلکہ قبض اور بخل کی طرف کہ اس میں عنصر خاکی کا غالب خلق یہی قبض و بخل ہے اور ظاہر ہے کہ قبض و بخل جس کا منشاء حرص و طمع ہے، محتاجگی اور غلامی پیدا کرتے ہیں، غنا و استغناء سے انہیں کوئی واسطہ نہیں۔ کیوں کہ بخیل اول تو خود اس شے کا محتاج ہوا جس میں بخل ظاہر ہوا، پھر اس شخص کا محتاج ہوا جس کی شے ہے، پھر اس کی عطا کا محتاج جس کی بدولت یہ شے اس کے پاس آئے گی، پھر اگر معطی اور عطا اور عطیہ نہ ہو تو بخیل اس درجہ محتاج ہے کہ اپنے بخل کا بھی پوری طرح اظہار نہیں کر سکتا، اس لیے ایک بخیل کسی چیز کے لینے سے پیشتر تو معطی کا محتاج اور لینے کے بعد اس عطیہ کا محتاج ہو جاتا ہے کہ اپنے قلب وقالب کو اس سے جدا کر لینے کی قدرت نہیں رکھتا۔ اس لئے بخیل کے لئے اول و آخر محتاجی اور غلامی ہی نکلتی ہے اور زمین میں چوں کہ یہی وصف ایک امتیازی وصف ہے۔ اس لئے اس کی محتاجگی و ذلت بھی سارے ہی عناصر سے زائد ہے، اس لئے یہ خاکی انسان خاکی رہتے ہوئے جبلی طور پر بخل کے رذیلہ میں گرفتار رہتا ہے۔ جو سراپا احتیاج (نمایاں ہو) ذلت ہے اور قبض و بخل کے بجائے سخا و ایثار پیشہ بن جائے تو اس کا ثمرہ استغناء ہے جو سراپا عزت و محبوبیت ہے اور اس میں کسی غیر کی احتیاج و غلامی نہیں بلکہ غیر ہی سے اپنی غلامی کراتا ہے۔

آگ اور اس کے جبلی اخلاق ...... اسی طرح آگ کو لو تو اس کی طبعی خاصیت اور جبلت ترفع ہے کہ سر نیچا ہی نہیں کرتی۔ کسی واجبی مصلحت سے بھی دباؤ تو نہیں دیتی۔ گویا آگ خاک کی ضد ہے کہ وہ ہمہ تن پستی ہے اور یہ سراپا تعلّی، ناری شیطان نے یہی کہہ کر حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے سر جھکانے سے انکار کر دیا تھا کہ: ﴿خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِیْنٍ﴾① ظاہر ہے کہ انسان میں آگ کا ایک کافی حصہ رکھا گیا ہے چنانچہ اس کی بدنی حرارت اور بعض اوقات بخار کا ہیجان اس کی کافی دلیل ہے۔ اس لئے ہوش سنبھالتے ہی اس میں جبلی طور پر وہی ترفع و تعلّی، شیخی اور انانیت کا جذبہ ابھرتا ہے جو حقیقت میں ناری اثر ہے، چنانچہ تعلّی اور شیخی سے مغلوب ہو کر جب انسان میں جوش و غضب اور غصہ کی لہر دوڑ جاتی ہے، اس کی رگیں پھول جاتی ہیں اور چہرہ پر آگ کی سرخی آ جاتی ہے، تو عرف میں یہی کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص آگ بگولا ہو گیا، فلاں میں غصہ کی آگ بھڑک اٹھی۔ یہ نہیں کہا جاتا کہ فلاں میں غصہ کا پانی بہہ گیا یا غصہ کی مٹی بکھیرنے لگا، بلکہ مٹی ہو جانا، اس کے ٹھنڈے ہو جانے کی علامت شمار ہوتی ہے کہ مٹی درحقیقت آگ کی ضد ہے، بہرحال انسان کا یہ ترفع و تعلّی اور انانیت درحقیقت وہی ناری خلق ہے، اب اس خلق پر غور کرو تو یہ بھی سراپا احتیاج و ذلت نظر آئے گا کیوں کہ تعلّی اور ترفع کا حاصل دوسرے پر بڑا بننے اور اپنے آپ کو ان کی نظروں میں بڑا دکھانے یا ان کے خیال پر نکلا، جس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ اگر دوسرے ہی نہ ہوں یا ان کا خیال اس کی بڑائی کی طرف نہ آئے یا اگر ہٹ جائے تو اس کی بڑائی کی عمارت منہدم ہو جائے، ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ محتاجگی اور کیا ہوگی کہ عزت ہماری ہو اور قابو میں دوسرے کے ہو، رفعت ہماری ہو اور دوسرے کے خیالات کی بہنے والی رو میں بہتی جا رہی ہو کہ دوسرے کے پاس بھی اسے تمکن اور استقرار نصیب نہیں۔ اسی بنا پر تعلّی و تفاخر کے لئے مدارات ناس اور تملّق بھی لازمی ہے تاکہ ان کا خیال بدلنے نہ پائے اور یہ ترفع کا بھوکا ان کی نظروں میں سبک نہ ہونے پائے۔

پس جو خلق ایک انسان کو ہزار ہا انسانوں کا محتاج بناتا ہو اس سے زیادہ ذلت آمیز اور احتیاج خیز خلق اور کون سا ہوگا؟ ہاں اس کے بالمقابل تواضع کا خلق ہے، جس کی حقیقت بلا مجبوری و پابندی محض اپنے قصد و ارادہ سے کسی کے سامنے جھکنا ہے، جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم آپ کے اس خیال کے محتاج نہیں کہ آپ ہمیں کیا سمجھتے ہیں؟ آپ جو کچھ بھی ہمیں سمجھیں وہ سمجھیں مگر ہم تو اپنی اصلیت پر ہیں، جو آپ کے سمجھنے نہ سمجھنے سے کسی حال بھی تبدیل نہیں ہو سکتی۔ پس تواضع کا حاصل استغناء اور ترفع کا حاصل محتاجگی اور غلامی نکل آیا۔ نیز تواضع کے سلسلہ میں بلند اور رفیع ہوتے ہوئے قصد و ارادہ سے جھکنا اعتماد علی النفس کی دلیل ہے کہ اس پر خود کو قابو ہے اور وہ اپنی ذریت سے مرتفع ہونا چاہتا تھا اور ہم اسے حاکمیت سے جھکا دیتے ہیں اور ظاہر ہے کہ نفس پر قدرت اور قابو مالکیت کی دلیل ہے جو محتاجگی کے منافی ہے۔ کیونکہ ہمیشہ مملوکیت میں ہوتی ہے نہ کہ مالکیت میں، ادھر شیخی میں انسان کو اپنے اوپر قدرت نہیں رہتی جو مجبوری اور

---

① پارہ: ۸، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۲۔

محتاجگی ہے، پس تواضع سے استغناء اور ترفع ونخوت سے احتیاج وغلامی پیدا ہوتا اس جہت سے بھی تواضع ہے۔

غرض جب تک انسان اس ناریت کے جال سے رہا نہ ہو، یہ ناری خلق اسے محتاج اور ذلیل ہی بنائے رکھتا ہے کہ احتیاج کی خاصیت ہی ذلت ومسکنت ہے۔ حاصل یہ نکلا کہ آگ بھی اپنی جبلت سے محتاجگی کا ثمرہ پیدا کرتی ہے نہ کہ غناء کا۔

ہوا اور اس کے جبلی اخلاق...... اسی طرح ہوا کو لیجئے کہ اس میں انتشار اور پھیلاؤ کی خاصیت ہے کہ وہ ہر جگہ موجود رہے، ہر جگہ گھسی رہے، ہر جگہ بھری رہے، ذرّہ ذرّہ اس سے وابستہ رہے۔ گویا اسے پھیلتا رہے۔ انسان میں ہوائی جزو بھی ہے۔ جیسے ریاح اور سانس وغیرہ سے نمایاں ہے تو وہ بھی چاہتا ہے کہ میں ہر جگہ موجود رہوں، ہر جگہ گھسا رہوں، ہر زمان اور ہر مکان میں میرا وجود رہے۔ مگر چوں کہ اس کا مادی نفس اتنا پھیلاؤ نہیں رکھتا کہ وہ خود ہر جگہ رہے۔ اس لئے وہ انتشاریت، شہرت اور ہوا بندی چاہتا ہے کہ لوگ جگہ جگہ میرا چرچا کریں۔ میرا ذکر پھیلائیں اور اپنے ذکر وتذکرہ کے ذریعہ میں ہر جگہ موجود رہے۔ پس ہوائے شہرت انسان میں اسی ہوائی جزو کا اثر ہے۔ غور کرو تو اس شہرت پسندی کے خلق کا حاصل بھی وہی محتاجگی ہے۔ کیوں کہ انسان کی یہ خواہش بھی اس کے بغیر پوری نہیں ہوسکتی کہ پہلے دوسرے ہوں پھر وہ اسے پھیلائیں اور اس کے بعد اس کی ہوا بندی بھی کریں، اس کا پروپیگنڈہ بھی کریں اور چرچا بھی کریں اور اسے اڑاتے بھی رہیں۔ بس اس خلق کا حاصل بھی وہی غیروں کی احتیاج نکل آئی۔ اس لئے شہرت پسندی بھی کوئی عزت آفرین نہیں بلکہ ایک ذلت افزا ملکہ ہے جو اپنے مقاصد کو دوسروں پر معلق کر دیتا ہے، برخلاف شہرت پسندی کی ضد کے، جسے اخفاء وتستر کہتے ہیں، کہ اس کی حقیقت میں خود بخود گمن رہنا اور دوسروں سے ہمہ تن مستغنی اور بے پرواہ ہو جانا ہے حالانکہ اس اخفاء پر جو قدرتی شہرت کا ثمرہ مرتب ہوتا ہے وہ اس مصنوعی اور جعلی شہرت سے بدرجہا بہتر ہوتا ہے۔ بہرحال ہوا کے خلق کا حاصل بھی وہی محتاجگی اور جگہ جگہ مارے مارے پھرنا آیا۔

پانی اور اس کے جبلی اخلاق...... اس طرح پانی کو لو تو اس کا طبعی فعل ہے، عدم التکلف اور عدم الضبط، یعنی پانی میں اعتماد علی النفس کا نشان نہیں۔ وہ اپنے نفس کو خود نہیں روک سکتا۔ ہر طرف سے آپ روک لگائیں، رک جائے گا اور جہاں بند ٹوٹا برتن پھوٹا، وہیں پانی بکھرا، سیدھا چل رہا ہے اور جہاں ذرا نشیب آیا وہیں بہ گیا، ذرا کسی نے زمین کھود ڈالی، اور وہ اپنا مستقر چھوڑ کر وہیں آ رہا۔ انسان میں بھی چوں کہ پانی کا جزو موجود ہے، جیسا کہ تھوک، سنک، بلغم، پیشاب وغیرہ سے واضح ہے۔ اس لئے اس میں بھی ضبط نفس کا پیدائشی طور پر نشان نہیں ہوتا، ذرا کسی کی اچھی چیز دیکھی بکھر پڑے، کسی کی عورت پر نظر پڑ گئی تو گھورنے لگے، کوئی قبول صورت چیز نظر پڑ گئی، اس کے پیچھے ہو لئے، کوئی عمارت اچھی دیکھ لی تو وہیں للچائی نظروں سے اسے دیکھنے لگ گئے کہ کاش یہ بلڈنگ ہماری ہوتی۔

غرض ذرا سا نشیب سامنے آنے سے بکھر پڑنے کا مادہ انسان میں آبی جزو سے آیا ہے۔ مگر اس کا حاصل

بھی وہی احتیاج اور بے بسی ہے۔ کیوں کہ غیر کو دیکھ کر قابو میں نہ رہنا اور اپنے نفس کو سنبھال نہ سکنا، عدمِ قدرت اور عجز کی دلیل ہے۔ ورنہ عجز جڑ ہے محتاجگی کی۔ ہاں ضبطِ نفس اور اچھی سے اچھی چیز دیکھ کر بھی اس سے بے نیاز رہنا، خود کو قابو میں رکھنا اور حرص نہ کرنے سے یہ اپنی قدرت کی دلیل ہے، جس کا حاصل بھی وہی استغناء نکلتا ہے۔ اس لئے پانی کی طبعی خاصیت بھی وہی احتیاج اور غلامی نکل آئی۔

رذائلِ نفس کے چار اصول ...... یوں اس طرح ان مادی یا رذائلِ نفس کے چار اصول نکل آتے ہیں۔ قبض، بخل، تعلّی و ترفّع، شہرت پسندی اور انتشاریت، عدمِ ضبطِ نفس یعنی حرص و ہوا جو آدمی کو سراپا احتیاج و غلام بنا دیتے ہیں۔

فضائلِ نفس کے چار اصول ...... ہاں پھر یہیں سے استغناء و خودداری کے اصول پر روشنی پڑ جاتی ہے کہ وہ ان اخلاق چارگانہ کی ضد ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ قبض و بخل کی ضد سخاوت و ایثار ہے، کبر و نخوت کی ضد تواضع و فروتنی ہے۔ شہرت پسندی اور نام آوری کی ضد اخفاء و تستر ہے۔ حرص و ہوا اور بکھر پڑنے کی ضد ضبطِ نفس اور قناعت ہے اور جب یہ چارگانہ اضداد مادہ کے چارگانہ اخلاق کی ضدیں ہیں تو یقیناً انہیں مادی اخلاق بھی نہیں کہا جا سکتا، بلکہ اس روح کے روحانی اخلاق شمار کئے جائیں گے جو مادہ کی ضد ہیں اور اس طرح اگر مادہ کے جوہر میں سے رذائلِ نفس کے چار اصول نکلے تھے تو روح کے جوہر میں سے فضائلِ نفس کے بھی چار ہی اصول نکل آئے، ایثار، تواضع، اخفاء، قناعت۔

اخلاق کا ظہور اعمال کے بغیر ممکن نہیں ...... لیکن یہ بھی ایک واضح حقیقت ہے کہ اخلاق کے جبلی آثار افعال ہی کے ذریعہ ظاہر ہو سکتے ہیں۔ اگر ان اخلاق کے مناسب افعال سرزد نہ ہوں تو اخلاق کے طبعی آثار ظہور پذیر ہی نہیں ہو سکتے، جیسے مثلاً خلقِ شجاعت کی تاثیرات بغیر فعلِ مقاتلہ و مقابلہ کے کبھی نہیں کھل سکتیں۔ خلقِ تواضع کی کیفیات بغیر انکساری کے اور جھکاؤ کے سامنے نہیں آ سکتیں۔ یہی حال اور تمام اخلاق کا بھی ہے۔ اس لئے ناگزیر ہے کہ ان مادی اخلاق کے اثرات محتاجگی اور روحانی اخلاق کے آثار کو ظاہر کرنے والے افعال کون سے ہیں؟

مادی اخلاق کا مظہر فعلِ امساک ہے ...... سو مادی اخلاق کے آثار پر جہاں تک غور کیا، ان کا حاصل بجز خود غرضی اور خود طلبی کے اور کچھ نہیں نکلتا۔ بخل ہو یا حرص، شہرت پسندی ہو یا تعلّی، سب کی بنیاد نفس کی اس خواہش پر ہے کہ مال و جاہ سب کا سب ساری دنیا سے کٹ کر تنہا اسی کے دامنِ ہوس میں سمٹ آئے۔ گویا ہر چیز کو اوروں سے روک کر اپنے لئے مختص کر لینا ان نفسانی اخلاق کا مقتضیٰ ہے۔ چناں چہ قبض اور بخل میں اپنی مقبوضہ چیز اوروں سے روکی جاتی ہے۔ حرص و ہوس میں دوسروں کی مقبوضہ چیز ان سے روک کر اپنے لئے پسند کی جاتی ہے۔ تعلّی و ترفّع میں ہر درجۂ کمال کو دوسروں سے منفی کر کے اپنے سے مختص ظاہر کیا جاتا ہے۔

شہرت پسندی اور نام آوری میں اوروں کی نمود روک کر صرف اپنا نام چاہا جاتا ہے، بس ان سب اخلاق میں کسی نہ کسی جہت سے اوروں سے رکاوٹ اور اپنا اختصاص کارفرما رہتا ہے۔ اس لئے واضح ہو جاتا ہے کہ اخلاق کے طبعی آثار کو جو فعل بطور قدرِ مشترک کے کھولتا ہے، وہ امساک ہے، بخل و حرص میں یہ امساک مالی ہوتا ہے اور تعلّی

ونام آوری میں امساکِ جاہی۔ مگر حبِ جاہ ہو یا حبِ مال، دونوں کا مظاہرہ اس فعل امساک ہی سے ہوتا ہے۔ گویا ان اخلاق کے طبعی آثار خود غرضی و محتاجگی، بغیر فعل امساک کے نمایاں نہیں ہو سکتے۔

روحانی اخلاق کا مظہر فعل انفاق ہے...... ادھر روحانی اخلاق چونکہ ہر حیثیت سے مادی اخلاق کی ضد ہیں، اس لئے ان کے طبعی اثرات اور ان اثرات کو ظاہر کرنے والے افعال بھی مذکورہ افعال کی ضد ہی ہو سکتے ہیں چنانچہ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ جیسے مادی اخلاق کا اثر خود غرضی تھا۔ روحانی اخلاق کا اثر بے غرضی ہے۔ چنانچہ ایثار و تواضع ہو یا اخفاء و قناعت، ان میں سے کسی ایک خلق کی بنیاد بھی نفس کی اس خود غرضانہ خواہش پر نہیں ہے کہ سب کچھ تنہا اسی کو مل جائے۔ بلکہ اس پر ہے کہ اپنا واجبی حق بھی دوسروں کے لئے چھوڑ دیا جائے۔ چنانچہ سخاوت میں اپنی چیز دوسروں کو دی جاتی ہے۔ قناعت میں دوسروں کی چیز انہی کے لئے چھوڑ دی جاتی ہے۔ تواضع میں اپنی عزت دوسروں پر نثار کی جاتی ہے اور اخفاء میں دوسروں کی عزت کے لئے پورا میدان دے دیا جاتا ہے۔

غرض ان تمام اخلاق کی بنیاد دوسروں سے روکنے یا چھیننے پر نہیں، بلکہ دوسروں کو دینے اور عطاء و نوال پر ہے، اس لئے واضح ہوتا ہے کہ جو فعل ان روحانی اخلاق کے طبعی آثار کو کھولتا ہے، وہ فعل امساک نہیں بلکہ اس کی ضد، انفاق ہو سکتا ہے، سخاوت و قناعت میں یہ انفاق مالی ہوتا ہے اور تواضع و اخفاء میں انفاق جاہی، مگر استغناء مالی ہو یا استغناء جاہی بغیر فعل انفاق کے کھل نہیں سکتا اور یہ ایک مشاہدہ ہے کہ جاہ و مال سے یہ بے نیازی ایک طرف تو غیروں سے غنی بنا دیتی ہے اور دوسری طرف اپنے میں بے غرضی مستحکم کر دیتی ہے، جس سے وسعتِ صدر اور فراخ دلی کا پیدا ہو جانا ایک قدرتی امر ہے، اس لئے ان روحانی اخلاق کا اثر وسعتِ حوصلہ، استغناء، وقار، خودداری و بے نیازی اور بے احتیاجی نکلتا ہے، جس کے ظہور کا ذریعہ انفاق ثابت ہوتا ہے، شریعت کی اصطلاح میں اس انفاق ہی کا نام صدقہ ہے جس کے معنی جان و مال، آبرو اور قول و عمل کو مالک الملک کے لئے دینے اور خرچ کرنے کے ہیں۔ پھر صدقہ کرنے میں چونکہ محبوباتِ نفس اور لذائذِ طبع کو ترک کرنا پڑتا ہے جو نفس پر بالطبع شاق ہے، اس لئے اس کا دوسرا نام مجاہدہ بھی ہے۔ اس لئے خلاصہ یہ نکلا کہ طبعی امساک کے ذریعہ انسان میں جو محتاجگی اور تنگی قائم ہوتی ہے، اس کے مٹانے اور اس کی جگہ استغناء و خودداری کی دولت جاگزین کرنے کا ذریعہ صرف صدقہ و مجاہدہ اور انفاق فی سبیل اللہ ہے۔

گویا انفاق کا جو درجہ بھی امساک کے مقابلہ پر آتا رہے گا اسی درجہ نفسِ انسانی میں محتاجگی و غلامی مٹ کر استغناء کے مراتب قائم ہوتے رہیں گے کیوں کہ صدقہ سے وہ مادی اخلاق مضمحل اور کمزور پڑتے جائیں گے، جن کی بدولت امساک کے افعال نمایاں ہوتے تھے۔

صدقہ سے غنا کس طرح حاصل ہو سکتا ہے...... چنانچہ ایک صدقہ دینے والا جب اپنے محبوب مال متاع کو اپنے سے کھو دیتا ہے۔ تو ظاہر ہے کہ اس نے قبض و بخل کی تو جڑ کاٹ دی، جو ارضی خلق تھا، ورنہ غلبہ بخل کے ہوتے ہوئے یہ متاع جدا ہی کب کی جا سکتی تھی اور ظاہر ہے کہ جس حد تک بھی قبض و بخل کا رذیلہ ست پڑے گا جو محتاجگی کی

جڑ تھی، اسی حد تک سخا و ایثار کا غلبہ راسخ ہوگا، جو ذریعہ استغناء ہے اور اس طرح استغناء کے ایک بڑے درجہ پر فتح ہو جائے گا۔ پھر جب کہ ایک صدقہ دہندہ کو عطاء و نوال میں لطف محسوس ہونے لگا تو ظاہر ہے کہ اب وہ دوسروں کی چیز پر نہ نگاہِ حرص ڈال سکے گا نہ کسی چیز کو دیکھ کر بکھر سکے گا بلکہ اس کے عطاء و تصدق کے معنی ہی یہ ہیں کہ وہ کم سے کم پر اپنے نفس کو تھامے رکھنے کا خواہشمند ہے، جسے قناعت کہتے ہیں۔ پس اسی صدقہ و انفاق کے ذریعہ حرص کا بھی خاتمہ ہو گیا جو آبی خلق تھا اور اس طرح استغناء کا ایک دوسرا مقام طے ہو گیا۔

فرق اگر ہے تو یہ کہ پہلے مقام پر پہنچ کر اپنی چیز کی محبت قطع ہوئی تھی، جس سے بخل قائم تھا اور دوسرے مقام پر پہنچ کر غیر کی چیز سے محبت جاتی رہی جس سے حرص قائم تھی، اور اس طرح ایک انسان مالی سلسلہ میں نہ اپنا غلام رہا نہ دوسروں کا، پھر جب کہ یہ صدقہ اخفاء کے ساتھ کیا گیا، جس میں نام و نمود کی کوئی خواہش نہیں ہو سکتی، ورنہ چھپانے کی کیا ضرورت تھی تو اس سے شہرت پسندی اور نام آوری کی جڑ کٹ گئی جو ہوائی خلق تھا، اس عظیم محتاجگی کی جڑ کٹ جانے سے جس کی تفصیلات آچکی ہیں، استغناء کا ایک اور مقام میسر آگیا۔

پھر ظاہر ہے کہ یہ صدقہ دہندہ اپنے اس عمل کو چھپانے کی سعی جب ہی کر سکتا ہے جب کہ اسے اپنا یہ عمل دوسروں کے عمل سے کم نظر آئے اور وہ اپنے عمل کی دوسروں کے عمل کے مقابلہ میں کوئی برتری اور بڑائی اپنی نگاہوں میں محسوس نہ کرے۔ ورنہ وہ اس عمل کو مخفی رکھنے کی بجائے دوسروں کے عمل سے برتر اور فائق تر ظاہر کرنا اور جابجا اس کا چرچا کرنا پسند کرتا، لیکن جب کہ وہ اپنے صدقہ کو دوسروں کے صدقات سے نسبت تک دینے سے رک رہا ہے تو صاف ظاہر ہے کہ وہ اپنے عمل کے تفوق و برتری کے خیال سے بھی جدا ہو چکا ہے، اور اس طرح دوسروں کی نسبت خود اپنی ذات کی برتری اور تعلّی سے بھی بیزار ہے۔ ظاہر ہے کہ اس اخفاءِ صدقہ سے تعلّی اور ترفع کی جڑ بھی کٹ گئی، جو آتشی خلق تھا اور اس طرح استغناء کا ایک چوتھا مقام میسر ہو گیا۔

پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ نیکی کے اخفاء میں مبالغہ اور وہ بھی اس حد تک کہ اپنے بائیں ہاتھ کو بھی پتہ نہ چلے کہ دائیں ہاتھ نے کیا دیا اور کس کو دیا گیا، خود اپنے نفس کو بھی خبر نہ ہو۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ اس نیکی پر خود اپنے ضمیر میں بھی اسے کوئی فخر و ناز محسوس نہ ہو، وہی کر سکتا ہے جس کے دل میں اس نیکی کی بمقابلہ غیر ہی نہیں بلکہ بحیثیت اپنے فعل ہونے کے بھی ذرہ برابر وقعت و عظمت نہ ہو، بلکہ وہ اسے محض ادائے فرض کہہ کر کرے، نہ کہ ادائے حق جان کر کرے، ظاہر ہے کہ صدقہ کے اس اخفاءِ تام سے خود پسندی اور عجب کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ جس سے استغناء کا ایک بہت ہی دقیق اور اہم مقام میسر آجاتا ہے۔ استغناء کے یہ آخری تین مقامات جاہ کے سلسلے میں محتاجگی سے بچاتے تھے۔ ان تین مقامات میں باہمی فرق و تفاوت ہے، تو یہ کہ پہلے مقام پر پہنچ کر صدقہ دہندہ دوسروں سے طالب جاہ نہیں رہتا۔ دوسرے مقام پر اپنے عمل سے کاسب جاہ نہیں رہتا اور تیسرے مقام پر خود اپنے نفس سے بھی تخیل جاہ قائم کرنے کا روادار نہیں رہتا اور اس طرح ان پانچوں مقامات کے ذریعہ مال و جاہ دونوں

کے سلسلہ میں اس محتاجگی اور پابستگی سے آزاد ہو کر جس نے اسے ذلت وپستی کے حضیض میں گرا رکھا تھا، غیر سے بھی غنی ہو جاتا ہے اور خود اپنے سے بھی مستغنی۔

مادیات سے استغناء ہی تعلق مع اللہ کی بنیاد ہے...... الحاصل اس مادہ پرست اور مادی نفس کے دو رذیلے بخل اور حرص تو نفس صدقہ ہی سے ختم ہو گئے اور تین رذیلے، تملق، نام آوری اور خود بینی اخفاءِ صدقہ کی قید سے ختم ہو گئے اور ظاہر ہے کہ جب ایک شخص بخیل نہ رہا، سخی ہو گیا۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ اسے اپنی دولت کی بھی پروانہ رہی، حریص نہ رہا بلکہ قانع ہو گیا۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ اسے غیروں کی دولت کی بھی پروانہ رہی۔ شہرت پسند نہ رہا بلکہ عزلت پسند ہو گیا۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ اسے لوگوں کی مدح وذم کی بھی پرواہ نہ رہی، شیخی پسند اور خود بین نہ رہا بلکہ خود گزار ہو گیا، جس کے یہ معنی ہیں کہ اسے اپنے نفس کی بھی پرواہ نہ رہی۔ تو اس کا صاف نتیجہ یہ ہے کہ وہ ان روحانی اخلاق کی بدولت جو اس نے صدقہ سے حاصل کئے ہیں، عالم میں کسی کا غلام نہ رہا اور اسے ہر چیز سے کامل آزادی اور حریت میسر آ گئی اور یہ سب جانتے ہیں کہ ساری کائنات سے بے پرواہ ہو کر اب اگر اس کا رشتۂ نیاز کسی سے جڑ سکتا ہے تو صرف اسی خالق کائنات سے جس کی خاطر اس نے یہ اپنا مال، اپنی آبرو اور اپنا نفس سب کچھ تج دیا تھا اور جس کے اخلاق سے اس نے یہ تخلیق کیا، اندریں حالات اسے مناسبت پیدا ہوئی تو اسی غنی عن العالمین سے اور لگاؤ پیدا ہوا تو صرف اسی ذات بے نیاز سے جو اپنے کاموں میں کسی کی محتاج نہیں، بلکہ ہر چیز اپنے وجود وظہور میں اسی کی دست نگر ہے۔

تعلق مع اللہ کی قوت ہی سے روحانی عجائبات اور خوارق کا ظہور ہوتا ہے...... اور اس صورت میں ضروری ہے کہ اس مرد متصدق اور بندہ مجاہد یا تارک ماسوی اللہ سے بھی۔ جس نے اس غنی مطلق سے نسبت قائم کر لی ہے۔ غناءِ کامل کا ظہور ہو اور وہ بھی اپنے کسی کام میں ان مخلوقاتی وسائل۔ یعنی مادی ذرائع کا محتاج نہ رہے بلکہ خود یہ وسائل ہی اس کی چشم و ابرو کو دیکھنے لگیں، اس کے تصرف بلا وسائل زمین تک ہی نہیں آسمانوں تک بھی پہنچنے لگیں۔ وہ اوپر جائے تو طیاروں کا محتاج نہ ہو اور زمینی مسافت طے کرے تو ریلوں او موٹروں کا پابند نہ ہو۔ وہ عالم میں اپنی صدا پہنچائے تو ہوا و برق کا دست نگر نہ ہو اور عالم کی صدائیں سننا چاہے تو ریڈیو اور ٹیلیفون کا محتاج نہ ہو۔

غرض اس کے ہاتھوں پر وہ سب کچھ ظاہر ہو، جسے دنیا کے سارے فلسفی اور سائنس دان مل کر بھی ظاہر نہ کریں۔ ورنہ کم سے کم غنا کا یہ درجہ تو اسے ضرور حاصل ہو جائے کہ علم واعتقاد کے درجہ میں تو ان وسائل کو موثر حقیقی نہ سمجھے اور عمل کے درجہ میں اسے ان اسباب و وسائل سے کوئی شغف باقی نہ رہے بلکہ عادت کے طور پر محض حیلے کے درجہ میں اور وہ بھی امر خداوندی سمجھ کر انہیں استعمال میں لاتا رہے، پس پہلا درجہ توکل وغنا کا اعلیٰ مقام ہے، جس میں ترک اسباب پر پوری قدرت محسوس ہونے لگے اور دوسرا درجہ ثانوی ہے جس میں گویا قدرت نہ ہو، مگر معرفت صحیح ہو جائے اور اختیار اسباب میں غلو اور انہماک باقی نہ رہے۔

بہر حال اب پوری طرح کھل گیا کہ مادہ میں بجز محتاجگی اور ذلت نفس پیدا کر دینے کے کوئی جوہر نہیں کہ اس کے اخلاق کی خاصیت ہی احتیاج وگدائی ہے، جس کا ظہور فعلِ امساک سے ہوتا ہے اور روح میں بجز عزت نفس پیدا کرنے کے دوسرا کوئی جذبہ موجود نہیں کہ اس کے فطری اخلاق کی طبیعت ہی استغناء و غناء ہے، منشاء عزت وعظمت ہے۔ جس کا ظہور فعلِ انفاق سے ہوتا ہے، جسے صدقہ کہتے ہیں۔

اس سے آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ مادی اور روحانی اخلاق، ان کی رغبتوں اور ان کے خواص و آثار میں تضاد کی نسبت ہے کہ خود روح و مادہ ہی میں تضاد کی نسبت ہے۔

روح ایک لطیفۂ ربانی ہے اور جسم ایک کثیفۂ ظلمانی، وہ مائل بہ علو ہے، یہ مائل بہ سفل، وہ انسان کو عرشی بناتی ہے یہ فرشی، وہ اسے سر بلند کرتی ہے، یہ سرنگوں، گویا ان دونوں کی مثال ترازو کے دو پلوں کی سی ہے کہ جتنا ایک کو جھکا دیا جائے دوسرا اسی قدر اٹھ جائے گا۔ اس لئے آپ ان مادی تصرفات کے ذریعہ مادی اخلاق کو جس قدر بھی قوت اور رسوخ دیں گے، روحانی اخلاق اس قدر مضمحل ہوتے رہیں گے اور اسی حد تک استغناءِ نفس مٹ کر احتیاج وذلت نفس کی زنجیریں مضبوط ہوتی رہیں گی، جس کو دوسری تعبیر سے یوں سمجھ لیجئے کہ روح جیسا فاضل بادشاہ جس حد تک جسم جیسے کمینہ اور بے شعور غلام کے زیر اثر بسر کرتا رہے گا، اسی حد تک اپنی ساری فرمانروائی کی عزت وشوکت برباد کرتا رہے گا اور نتیجۃً انجام کی تباہی وبربادی دونوں ہی کو گھیرتی رہے گی۔

لیکن اگر صدقہ ومجاہدہ یعنی مادیات اور مادی لذات سے بے نیازی کے ذریعہ ان روحانی اخلاق کو قوت ورسوخ کا موقع دیتے رہیں گے تو احتیاج وگدائی مٹ کر اسی حد تک استغناء وکمال کی جڑیں مضبوط ہوتی رہیں گی، جس سے کائنات بدن میں روح کی حکمرانی قائم ہو جائے گی اور بدن کا غلام ہر آن اس کے سامنے دست بستہ حاضر رہ کر محض بجا آوریٔ احکام کے لئے رہ جائے گا، جس سے دونوں اپنے اپنے منصبی کاموں میں بھی لگے رہیں گے۔ دونوں کی عزت بھی بقدر مرتبہ قائم ہوگی اور اقلیم جان کا عدل بھی استوار رہے گا۔

سائنس محض کبھی یہ غناء پیدا نہیں کر سکتی...... اور جب کہ یہ پہلے ثابت ہو چکا ہے کہ یہی مادی تصرفات جن سے احتیاج اور ذلتِ نفس کا ثمرہ پیدا ہوتا ہے، سائنس کا موضوعِ عمل ہیں اور یہی روحانی تصرفات یعنی صدقہ ومجاہدہ جن سے استغناء وعزت نفس کا نتیجہ ظاہر ہوتا ہے، اسلام کا موضوعِ عمل ہے، تو یہ نتیجہ خود بخود نکل آیا کہ سائنس تو انجام کار انسان کو ذلت نفس اور ہلاکت کی طرف لے جاتی ہے اور اسلام انجام کار اسے عزت وفلاح دارین کی طرف بڑھاتا ہے۔

پہلی صورت یعنی مادیات کا علو اور سائنس کا بحران روح کی پامالی اور مادہ کے غلبہ کی ہے، جس سے عزیز تو ذلیل، اور ذلیل عزیز ہو جاتا ہے، جو قلب موضوع اور دونوں کے لئے موجب ہلاکت ہے

اور دوسری صورت یعنی روحانیت کا شغل اور اسلام کا شغف روح کی سر بلندی اور مادہ کی محکومی کی ہے، جس سے عزیز مسندِ عزت پر اور ذلیل اپنی حدِ ذلت ومقہوریت پر باقی رہتا ہے جو عینِ عدل اور دونوں کے لئے دارین

میں موجب فلاح و بہبود ہے، بس یہ ہے سائنس اور اسلام کی باہمی نسبتوں کا اجمالی خاکہ جو اپنی بساط علم کی قدر، میں نے آپ کے سامنے عرض کر دیا ہے اور یہی اس تقریر کے تین مقاصد میں سے پہلا مقصد تھا جو الحمد للہ کہ اتمام کو پہنچ گیا۔ سائنس اور اسلام میں وسیلہ و مقصود کی نسبت ہے...... اب اس پر غور کیجئے کہ یہ چونکہ مادہ ہے اور اس سے تیار شدہ بدن ایک ڈھانچہ ہے۔ جس کی زندگی روح سے ہے اور روح اسے زندہ رکھ کر اپنے علوم و کمالات کو اسی کے ذریعہ عملاً نمایاں کرتی ہے، پس بدن کمالات روح کے ظہور کا ایک ذریعہ اور آلہ ہے۔ چنانچہ روح اپنے مقررہ عمل سے فارغ ہو کر جب اس مقام معلوم تک پہنچ جاتی ہے جو ازل سے اس کے لیے طے شدہ تھا، جب ہی اس ڈھانچہ اور وسیلہ کو روح سے جدا کر دیا جاتا ہے۔ پس جسم حقیقتاً فاعل نہیں بلکہ محض قابل ہے اور اصل نہیں محض وسیلہ ہے۔

اگر اس جسم کو بالاستقلال مقصودیت کا درجہ دے دیا جائے تو یہ فی الحقیقت لاشہ کو مقصود بنا لینا ہے، جس کا انجام سڑنے، گلنے اور دماغوں کو پراگندہ کرنے کے سوا کچھ نہیں۔ اور جب کہ سائنس کا موضوع محض یہ جسمانیات اور مادی چیزیں ہی ہیں اور مادیات ڈھانچہ اور وسیلہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں، تو خود بخود حل ہو گیا کہ سائنس کے تمام کرشمے بھی اصولاً وسائل سے زیادہ کوئی وقعت نہیں رکھ سکتے اور جب کہ اسلام کا موضوع بالاصالہ روحانیت اور روحانی افعال ہیں اور روح اصل ہے، تو یہ بھی خود ہی واضح ہو گیا کہ اسلام کے تمام امور بھی مقصودیت کے درجہ سے کسی طرح نہیں گر سکتے۔ ان دونوں صورتوں کے ملانے سے یہ نتیجہ صاف نکل آتا ہے کہ جیسے بدن روح کے لئے وسیلۂ عمل ہے ایسے ہی سائنس اصولی طور پر اسلامی کارناموں کے لئے ایک وسیلہ و ذریعہ اور ایک ڈھانچہ ہوگی۔ جس کی زندگی اور روح اسلامی اخلاق و افکار اور اسلامی اقوال و افعال ہوں گے اگر یہ روح اس ڈھانچہ میں نہ ہو تو یہ پوری سائنس اور اس کی تشکیلات ایک لاشہ ہوں گی، جس کا انجام بجز پھولنے پھٹنے اور سڑ گل کر تیج دماغوں اور بچے قلوب کو پراگندہ کرنے اور صاف فضاء کو خراب کر دینے کے اور کچھ نہیں ہو سکتا۔

چنانچہ ایسی سائنس جس کا حاصل تعیش محض اور عناصر اربعہ کے خزانوں کو بلا دینی روح کے استعمال میں لانا ہے اور جسے اصطلاح میں دنیوی زندگی پکارا جاتا ہے، قرآن کی زبان میں لاشے بے جان اور چند دن اپنی سطحی چمک دمک اور زینت دکھا کر خاک کا ڈھیر ہو جانے والا ایک لاشہ ہے۔ جس پر حقیقت سے بے بہرہ لوگ ہی ریجھ سکتے ہیں۔

ارشادِ حق ہے: ﴿اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ، كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطٰمًا﴾ ① ”تم خوب جان لو کہ دنیوی زندگی محض لہو و لعب اور زینت اور باہم ایک دوسرے پر فخر کرنا اور اموال و اولاد میں ایک دوسرے سے اپنے کو زیادہ جتلانا ہے، جیسے مینہ کہ اس کی پیداوار کاشتکاروں کو اچھی معلوم ہوتی ہے، پھر وہ خشک ہو جاتی ہے، سو تو اس کو زرد دیکھتا ہے، پھر وہ چورا چورا ہو جاتی ہے“۔

---

① پارہ: ۲۷، سورۃ الحدید، الآیۃ: ۲۰۔

اس غیر ضروری تحقیق یا تعیش محض اور جمع وسائل کا نام اسلام کی زبان میں دنیا ہے، جس کے دلدادہ کو احمق اور بے وقوف کہا جاتا ہے ارشاد نبویؐ ہے: "اَلدُّنْیَا دَارُ مَنْ لَّا دَارَ لَہٗ وَلَھَا یَجْمَعُ مَنْ لَّا عَقْلَ لَہٗ." ① "دنیا بے گھرے کا گھر ہے اور اس کی جمع پر وہی پڑے گا، جس میں عقل کا نشان نہ ہو"۔

بہر حال حسی، عقلی اور نقلی طور پر یہ واضح ہو گیا کہ جس طرح جسم اور مادہ روح کے لیے وسیلہ محض ہیں، خود مقصود واصل نہیں۔ اسی طرح مادی تصرفات، جن کا نام سائنس ہے، روحانی تصرفات کے لئے جن کا نام اسلام ہے، اصولاً محض وسیلہ اور ذریعہ کا درجہ پیدا کر سکتے ہیں، خود مقصودیت کی شان کبھی نہیں پیدا کر سکیں گے۔

اور ظاہر ہے کہ جب سائنس وسائل میں سے ہوئی تو پھر یہ ایک عقلی اصول ہے کہ وسیلہ مقصود میں معین ہو، یعنی بقدر ضرورت، ورنہ بلا وصال اس میں انہماک رکھنا، اس میں مقصودیت کی شان قائم کرنا ہے، جو قلب موضوع اور خلاف عقل ہے، اس لئے عقلاً ہی یہ بھی واضح ہوا کہ مقصود اصلی یعنی دین سے جدا رہ کر سائنس محض میں انہماک پیدا کرنا کوئی عاقلانہ فعل قرار نہیں پا سکتا بلکہ اسے وسیلہ کی حد تک اور بمقدار ضرورت ہی اختیار کرنا دانائی ہوگی۔

اس لئے دنیائے سائنس اور محفل چار عناصر کے تصرفات کو اسی حد تک حاصل کرنے کی اجازت زبان نبویؐ پر دی گئی ہے، جس حد تک مذہبی مقاصد میں ان کی ضرورت ہو۔

ابوبکر طرطوشی کا قول ہے "اِعْمَلْ لِلدُّنْیَا بِقَدْرِ مَقَامِکَ فِیْھَا وَاعْمَلْ لِلْاٰخِرَۃِ بِقَدْرِ بَقَائِکَ فِیْھَا." ② "دنیا کے لئے اتنا کرو جتنا دنیا میں رہنا ہے اور آخرت کے لئے اتنا کرو، جتنا وہاں رہنا ہے"۔

خلاصہ...... یہ ہے کہ سائنس کا درجہ وسیلہ کی حد سے آگے نہیں بڑھتا کہ اس کا معمول اصلی مادہ ہے اور مادہ روح کے لئے محض وسیلہ ہے اور اسلام کا درجہ مقصودیت سے گر نہیں سکتا کہ اس کا معمول اصلی روح ہے اور روح مادہ کے لئے اصل مقصود ہے۔

اس تقریر سے الحمدللہ پوری طرح سائنس اور اسلام کی درمیانی نسبت بھی واضح ہو گئی اور کھل گیا کہ ان میں وسیلہ و مقصود کی نسبت ہے، جو موضوع تقریر کا دوسرا مقصد تھا، اور جس کا حاصل یہ ہے کہ سائنس کے کارنامے جب تک مذہب کے لئے بطور وسیلہ استعمال ہوں گے، خواہ ترقی کی کسی حد پر ہی پہنچ جائیں، ان کا انجام خوش کن ہوگا اور جب اس سے جدا ہو کر خود مقصودیت کی شان لے لیں گے یعنی روحانیت ترک ہو کر مادیت محضہ مقصود کی جگہ لے لے گی، خواہ وہ کم سے کم بھی ہو، جب ہی انجام خطرناک اور ذلت آمیز نکلے گا۔

سائنس اور اسلام کی حقیقتوں کا اہم پر تقاضہ کیا ہے؟...... اسی سے آپ یہ بھی سمجھ لیں گے کہ آپ کی ترقی کا میلان کیا ہونا چاہئے؟ جس کے شور سے آج فضاء دنیا گونج رہی ہے۔ اس کا فیصلہ بھی وہی عقل سلیم کر سکتی ہے جس

---

① مسند احمد، حدیث السیدۃ عائشۃؓ ج: ۳۹ ص: ۳۳۹. ② تفسیر الثعالبی تحت قولہ تعالی وسیری اللہ عملکم، ج: ۲، ص: ۱۹۲، علامہ ثعالبی نے اسے استاذ ابوبکر الطرطوشی کا قول قرار دیا ہے۔

نے ان میں سے ایک کو وسیلہ اور ایک کو مقصود باور کرایا ہے کہ آیا ترقی وسائل میں کی جاتی ہے یا مقاصد میں؟ اور ترقی کی دوڑ راحت کے لئے ہوتی ہے یا منزلِ مقصود کے لئے؟

پس اگر سائنس وسیلہ ہے اور بہ شہادتِ عقل ونقل ضرور ہے، جیسا کہ ثابت ہو گیا تو پھر عقل ہی کی شہادت سے وہ بھی مطلقاً میدانِ ترقی بھی قرار نہیں پا سکتی کہ وہ تو راہِ محض ہے، منزلِ مقصود نہیں اور اگر اسلام مقصودِ اصلی ہے اور ضرور ہے جیسا کہ عقل ونقل سے ثابت ہو چکا ہے تو اسی کو دوڑنے اور ترقی کرنے کا میدان بھی بنایا جا سکتا ہے کہ وہ راہِ محض نہیں، شہرِ مطلوب ہے۔ جس میں پہنچنے کے لئے ساری جد وجہد تھی، چنانچہ قرآن کریم نے ترقی کو روکا نہیں بلکہ انسان کو دنیا میں بھیجا ہی ترقی کرنے کے لئے ہے۔ ہاں وسائل میں ترقی کرنے کو اضاعتِ وقت کہا ہے اور مقاصد میں جس کا عنوان خیرات ومبرات رکھا ہے، ترقی کرنا نہ صرف روا ہی بتلایا ہے بلکہ ضروری اور واجب قرار دیا ہے۔ ایک جگہ ارشادِ ربانی ہے ﴿وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ﴾ ① ”ہر قوم کے لئے ایک قبلہ مقصود ہے، جس کی طرف وہ رخ کرتی ہے۔ سو تم ایک دوسرے سے بھلائیوں میں سبقت کرو!“

دوسری جگہ نعیمِ آخرت کا ذکر فرمایا جو تمام خیرات ومبرات کا مقصودِ اصلی ہے، ارشاد فرمایا: ﴿وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ﴾ ② ”اور حرص کرنے والوں کو ایسی ہی چیز کی حرص کرنی چاہئے“

پس ایک جگہ سبقت باہمی اور ایک جگہ حرص باہمی کے عنوان سے مسلمانوں کو ترقی کے لئے ابھارا گیا اور مامور کیا گیا ہے، لیکن یہ ترقی اسی میدان کی ہے جس کی فطرۃً ہونی چاہئے، یعنی مقاصد کی، کیوں کہ وسائل میں ترقی ترقی نہیں بلکہ بے عقلی ہے۔ اس اصولی حقیقت کے پیشِ نظر اب آپ اپنا جائزہ لیجئے کہ آپ نے کس طرح اس موضوع کو الٹ دیا ہے۔ مقصود کو وسیلہ اور وسیلہ کو مقصود، بادشاہ کو غلام اور غلام کو بادشاہ بنا دیا ہے، مقصودِ اصلی کو تابع محض اور رسمی داعی کر ڈالا ہے اور سائنس کو مقصودِ حقیقی اور مطلوبِ اصلی قرار دے لیا ہے۔ پھر ساتھ ہی اس کے انجامِ بد کو بھی پیشِ نظر رکھئے کہ ان حالات میں یہ مادہ کا کمینہ غلام آپ کو حرمان وخسران کے کس گڑھے میں لے جا کر گرائے گا، جیسا کہ اب تک اقوام کو گراتا آیا ہے۔ اللہ کے نذیرِ مبین صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی خالص نمائشی کروفر اور مادیات کی اسی چمک دمک پر جس کا نام شریعت کی اصطلاح میں زینت اور زہرہ ہے، خوف کھاتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے۔ ”وَاللّٰهِ مَا أَخْشٰى عَلَيْكُمُ الْفَقْرَ وَلٰكِنْ مِمَّا أَخْشٰى عَلَيْكُمْ مِنْ بَعْدِيْ زَهْرَةُ الدُّنْيَا تُفْتَحُ عَلَيْكُمْ فَتُهْلِكُكُمْ كَمَا أَهْلَكَتْهُمْ۔“ ③ ”خدا کی قسم، مجھے اپنے بعد تم پر فقر وفاقہ پڑ جانے سے کوئی خوف نہیں، خوف ہے تو اس کا کہ میرے بعد تم پر دنیا کی چمک دمک کھلے گی۔ اور تمہیں اسی طرح ہلاک کر ڈالے گی جس طرح اس نے تم سے پہلوں کو ہلاک کیا ہے“۔

---

① پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۴۸۔ ② پارہ: ۳۰، سورۃ المطففین، الآیۃ: ۲۶۔

③ السنن لابن ماجۃ، کتاب الفتن، باب فتنۃ المال، ج: ۱۱، ص: ۴۹۹، رقم: ۳۹۷۸۔

مادیاتِ محضہ کی مضرتیں...... ہاں مادیات کی یہ ہلاکت آفرینیاں پہلے علم کے میدان میں قدم جماتی ہیں جس سے اعتقادات بگڑتے ہیں اور پھر عمل کے میدان میں چھا جاتی ہیں۔ جس سے ہمت عمل ختم ہو جاتی ہے۔ علمی میدان میں اس طرح کہ مادیات خود بے شعور ہیں، چنانچہ آگ، پانی، ہوا، مٹی میں سے کوئی ایک مادہ بھی عقل و ہوش نہیں رکھتا ورنہ انسانوں کے ہاتھ میں اس طرح بے بس ہو کر مسخر نہ ہوتا۔ اس لئے ان جہالت کے کھلونوں سے رات دن کھیلنا، ظاہر ہے کہ جہل سے آگے نہیں بڑھا سکتا۔ نیز یہ مادیات چونکہ خود محسوسات کی انواع ہیں، اس لئے ان کا دلدادہ انسان زیادہ سے زیادہ حس ہی کی گہرائیوں تک رسائی پا سکتا ہے اور جس کا تعلق حواسِ خمسہ آنکھ، ناک، کان وغیرہ سے ہے۔ اس لئے ایک چشم و گوش کا بندہ مشاہدات چشم و گوش ہی میں گھرا رہتا ہے۔ علوم قلب، علوم ارواح اور علوم حقائق تک اس کی رسائی ہونے ہی نہیں پاتی اور ظاہر ہے کہ جس علم کی راہ سے آدمی ناواقفِ محض ہو اور ناواقفی کے ساتھ ادھر کا رخ بھی نہ کرے تو اس کا مبلغ پرواز بجز اوہام و خیالات اور شکوک و شبہات کے علوم و معارف کب ہو سکتے ہیں؟

اسی لئے مادی انسانوں کو روحانی میدان میں شکوک و شبہات ہی گھیرے رہتے ہیں، جو درحقیقت مادیات میں انہماک و شغف رکھنے کا ایک معمولی ثمرہ ہے، اس کا علاج اس کے سوا کچھ نہیں کہ روحانیت کی طرف رجوع کر کے جو منشاء علوم وادراکات ہیں، قلب میں علم کی شمع روشن کی جائے، جس سے اوہام و وساوس کی یہ اندھیریاں رفع ہوں۔

طلبائے یونیورسٹی کو خطابِ موعظہ...... مجھے معاف کیا جائے، اگر میں نیاز مندانہ طریق پر یہ عرض کروں کہ آج مسلمانوں میں اور آپ برا نہ مانیں تو آپ جیسے فی ذہنیت کے افراد میں اس علمی اور عرفانی روشنی کا سرے سے ہی پتہ نہیں ملتا جو شکوک و شبہات کا تریاق اور وساوس واوہام کا بدرقہ ہے، بلکہ قلوب میں ریب وارتیاب اور تحیر نے جگہ پکڑ کر اصل حقیقت ہی سے بیگانہ بنا دیا ہے اور جب کہ ایمان کی وہ شفاف روشنی جو ظلمات جہل اور جہل سے پیدا شدہ شبہات کو دفع کرتی ہے اور مشاہدۂ حق کی وہ تجلی ریزی جو ہر سوال کا جواب بنتی ہے، قلوب میں پیوست ہی نہیں تو محض علمی تعبیرات سے آپ قلوب کو کب تک پھسلاتے رہیں گے؟

یہ علمی عجائبات جو تقریروں کے ذریعہ آپ سننا چاہتے ہیں، اس وقت کا مشغلہ ہیں، جب کہ اصل علم کا راس المال ہاتھ میں ہو یہاں ایمان ہی کی خیر نظر نہیں آتی تو یہ اسلام و عمل چہ رسد؟

مادیات کی مضرتیں رفع کرنے کا طریقہ...... اس لئے میری صلاح تو یہ ہے اور نہ میری صلاح بلکہ اسلام کی حقیقت کا تقاضا ہی یہ ہے کہ میرے عزیز بھائی اوپر کی ٹیپ ٹاپ اور مرہم پٹی کو چھوڑ کر اس مادۂ فاسد کا تنقیہ کریں، جو مادی سائنس کے غیر ضروری انہماک اور غلو نے پیدا کر دیا ہے۔ اور فلسفیہ کے علم نما جہل نے اس کی آبیاری کی ہے۔ ان حالات میں ان کا فرض ہے کہ وہ جسم کے بجائے روح کو ابھرنے کے قابل بنائیں کہ وہ ہی انسان میں علم کا منبع ہے جس کی پہلی کڑی یہ ہے کہ ہوائے نفسانی اور مادی خواہشات کے بے شمار مقاصد سے ذرا ایک

طرف ہو کر اس منبع جود و کمال ذاتِ حق کی طرف رجوع کریں۔ جس سے علم معرفت کی روشنی چلتی اور شبہات و وساوس کی دنیا کو تنگ بنا دیتی ہے۔

استحکامِ توحید..... گویا دوسرے لفظوں میں تعدد مطالب یا شرک کو چھوڑ کر توحید پر استقامت اختیار کی جائے جو اسلام کی روح اور اصل اصول ہے، اس کی تدبیر بجز اس کے اور کیا ہو سکتی ہی کہ کلمہ توحید کو بار بار اور بکرات و مرات دہرایا جائے تا کہ قول کا اثر قلب پر پڑے اور توحید راسخ ہو۔

ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے ”جَدِّدُوْا اِیْمَانَکُمْ بِقَوْلِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ“ ① پھر ”لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ“ میں ایک توحیدِ ذات ہی کا تصور نہ کریں بلکہ توحیدِ صفات کا دھیان بھی اسی کلمہ سے کریں۔ یعنی اللہ کے سو ناموں یا سو صفات کی توحید بھی اسی کلمہ سے حاصل کریں، گویا الوہیت کا اثبات و نفی اس ترکیب سے حاصل ہوتا ہے۔ ایسے ہی رحمانیت، نافعیت، ضاریت وغیرہ کا اثبات و نفی بھی اس طرح کیا جائے ”لَارَحْمٰنَ اِلَّا اللّٰهُ. لَامَالِکَ اِلَّا اللّٰهُ. لَانَافِعَ اِلَّا اللّٰهُ. لَامَلِکَ اِلَّا اللّٰهُ.“ وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ اس طور پر جب قلب میں یہ ذہن نشین ہو جائے گا کہ مالک بھی ایک وہی ہے. نافع بھی وہی اور ضار بھی وہی ہے عظمت و جبروت والا بھی وہی ہے اور ذوالجلال والاکرام بھی ایک وہی ہے تو اس کا قدرتی ثمرہ یہ ہوگا کہ قلب سے سب عظمتیں مٹ کر صرف ایک ذاتِ واحد کی عظمت رہ جائے گی اور یہی کسوئی اور یک رخی قلب کی قوت ہے۔ ایک غلام دو آقاؤں کو بیک دم خوش نہیں کر سکتا۔ وہ ہمیشہ مضطر متردد اور مذبذب رہے گا۔ جس سے قلب میں کمزوری پیدا ہو جائے گی۔ لیکن جو اس یقین پر ہے کہ میرا ایک ہی آقا ہے اور وہ بھی ایسا جو علی الاطلاق ہر چیز کا مالک اور اس پر قابض و متصرف ہے۔ تو وہ متردد رہنے کے بجائے متیقن اور مطمئن ہو جائے گا اور یقین و اطمینان ہی قوتِ قلب کی بنیاد ہے۔ جس سے اس کی قوتِ فکری سمٹ کر ایک مرکز پر جمع ہو جاتی ہے اور پھر اس سے عجائباتِ فکر اور غرائبِ علوم پیدا ہوتے ہیں اور انسان کی بصیرت و معرفت میں اضافہ کرتے رہتے ہیں۔ اسی قوتِ یقین کے ماتحت حضرات صحابہؓ اور سلف کے وہ محیر العقول کارنامے ہیں جنہوں نے متمدن دنیا کو آج تک حیرت میں ڈال رکھا ہے۔ ان کی ترقیات اور طوفانی کارنامے روپیہ پیسہ اور دھن دولت کے رہینِ منت نہ تھے بلکہ دولتیں خود ان کے کارناموں سے بنتی اور بگڑتی تھیں۔

اس لئے سب سے پہلے اپنے توحیدی اعتقاد درست کیجئے کہ یہی ہر خیر و کمال کی بنیاد ہے۔

یادِ حق اور اس کا ابتدائی آسان طریقہ..... ہاں پھر اس توحیدی فکر کو پختہ اور راسخ کرنے کے لئے طمانیتِ قلب کی حاجت ہے۔ ورنہ وساوس و خطرات اور تشویشاتِ فکر اس صاف حقیقت پر قائم نہیں رہنے دیں گے۔ اس لئے قرآن کریم نے طمانیتِ قلب پیدا کرنے کا موثر ذریعہ فرمایا کہ: ﴿اَلَا بِذِکْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ﴾ ②

---

① المسند للامام احمد، مسند ابی هریرةؓ، ج:۷، ص: ۳۷۲ رقم: ۷۳۵۳.

② پارہ: ۱۳، سورة الرعد، الآیة: ۲۸.

"یاد رکھو! اللہ کی یاد ہی سے دل چین پاتے ہیں" اس سے مقصود ذکر قلبی ہے۔ مگر ذکر قلب میں راسخ نہیں ہوتا، جب تک کہ زبان سے اس کا بار بار تکرار نہ کیا جائے۔ چنانچہ طالب علم اپنے سبق کو قلب میں محفوظ کرنے کے لئے زبان ہی سے اس کو بار بار دہراتا ہے اور رٹتا ہے، اس لئے اولاً زبان کو ذاکر بنانا چاہئے تاکہ قلب ذاکر بن جائے اور یہ ایمان و توحید دل میں اپنی جڑیں چھوڑ دے اور قلب اس پر قانع اور مطمئن ہو جائے۔

اس لئے شریعت نے ذکر حق کی مختلف صورتیں تجویز کی ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ آج ان کا استعمال تو بجائے خود رہا ان کا علم تک بھی مسلمانوں اور اس طبقہ کو نہیں ہے، جو تعلیم یافتہ کہلاتا ہے۔

شریعت نے سب سے پہلے فرائض رکھے جو ذکر اللہ کا اعلیٰ مظہر ہیں اور ہر چھوٹے بڑے پر لازم کئے۔ اس لئے فرائض علوم وصلوٰۃ وغیرہ کی پابندی کیجئے، پھر اوقات مخصوصہ کی دعائیں یاد رکھیں تاکہ چلتے پھرتے بھی خدا کی تسبیح و تہلیل آدمی کی زبان پر جاری رہے، اس لئے اس قسم کے اذکار کو یاد کرنے کی فکر کیجئے۔ پھر مختلف مواقع کلام کے محاورے اسلامی زبان نے ایسے رکھے ہیں کہ ان میں بلا ارادہ بھی ذکر اللہ زبان پر جاری رہے: "بِسْمِ اللّٰہِ. اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ. جَزَاکَ اللّٰہُ. اِنَّا لِلّٰہِ. مَاشَآءَ اللّٰہُ. اِنْشَآءَ اللّٰہُ. اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ. اِلَّا اللّٰہُ. سُبْحَانَ اللّٰہِ" وغیرہ۔ آپ کی زبان کے رات دن کے محاورے ہیں۔ اگر آپ استعمال کریں اور اغیار کی زبانوں سے شغف پیدا نہ کریں۔ آپ کی زندگی کا کوئی ایسا کام جس سے کلام کا تعلق ہو، ایسا نہیں ہے۔ جس کے متعلقہ کلام میں اللہ کا نام داخل ہی ورد نہ ہو۔

گویا اسلامی معاشرت میں رہ کر کلام کرنے والا بے ارادہ بھی ہر وقت اللہ کا نام لینے پر مجبور ہے۔ لیکن آج مسلمان اپنی دینی زبان سے جس کی بدولت وہ ارادہ اور بے ارادہ ہر وقت خدا کا نام لینے کی توفیق پاتے تھے، نہ صرف بے پرواہ ہی ہیں بلکہ اس کے مٹانے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں حالانکہ اسلام نے عربیت اور عربی محاورے قائم رکھنے پر اسی لئے کافی زور دیا تھا کہ زبان کا اثر تہذیب، کلچر، تمدن اور عام احوال زندگی پر پڑتا ہے۔

چنانچہ انگریزی اقتدار کے آغاز کے وقت علماء وقت اور خصوصاً اکابر دارالعلوم دیوبند نے مسلمانوں کی فہمائش کی تھی کہ وہ اپنی عربیت کو تھامے ہوئے غیر زبان کی ترویج و تقویت پر اس ذوق و شوق سے زور نہ دیں کہ وہی زبان ان کی بنیاد اور قبلۂ مقصود بن جائے۔ مگر مسلمانوں نے ان مبصروں کا کہنا نہ مانا اور بالآخر آج وہ اس کے نتائج بد سے دوچار ہوئے کہ ان کی تمدنی صورت و سیرت ہی مسلمانوں جیسی نہ رہی، چہ جائیکہ ان کا علمی دین اصلی رنگ میں محفوظ رہتا۔

مگر بہر حال رجوع کے لئے کسی وقت کی تخصیص نہیں۔ اگر آپ پوری تندہی سے آج ذکر اللہ کے پابند نہیں ہو سکتے تو کم از کم عربیت کو زبان ہی کی حیثیت سے باقی رکھنے کی سعی کیجئے اور اس کے دینی محاورات ہی کو زبان زد کرتے رہیے تاکہ اسی بہانہ سے خدا کا نام زبانوں پر جاری رہے۔ نام حق کی یہ زبانی مشق اگرچہ بے ارادہ بھی ہو پھر بھی انشاء اللہ قلوب میں ایک حد تک ذکر اللہ کو قائم کرتی رہے گی۔

صحبت صلحاء اور اہل اللہ سے رابطہ..... مگر ان امور کی توفیق اس کے بغیر مشکل ہے کہ اسباب توفیق بھی اس

کے ساتھ جمع کئے جائیں اور ان میں موثر ترین سبب سچوں کی صحبت و معیت ہے، اسی لئے حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ﴾ ① ''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچوں کی معیت اختیار کرو'' چنانچہ صحبت یافتہ جاہل بعض اوقات غیر صحبت یافتہ عالم سے بدرجہا زائد مقاصدِ دین کو سمجھتا ہے اور دینی رنگ سے رنگین اور متصبغ ہو جاتا ہے، اس لئے اہلِ علم اور اہل اللہ کے پاس آمد و رفت کو ایک مستقل مقصد کی حیثیت سے قائم رکھیے۔ بردِ یقین اور ثلجِ صدر استدلال سے پیدا نہیں ہو سکتا۔

اکبر نے خوب کہا ہے ؎

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں　　　ڈور کو سلجھا رہا ہے پر سرا ملتا نہیں

آگے حصولِ یقین و دین کی تدبیر کے بارہ میں کہتا ہے کہ ؎

نہ کتابوں سے نہ وعظوں سے نہ زر سے پیدا　　　دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

اس لئے میں نیاز مندانہ التماس کروں گا کہ میرے عزیز بھائی اہل اللہ اور اہل دین سے بیگانہ نہ رہیں، بلکہ ان سے وابستگی پیدا کرنے کی صورتیں نکالیں تا کہ ان سے دولتِ دین و یقین حاصل ہو اور شکوک و شبہات یا تردّدات کا مادۂ فاسدہ ختم ہو جائے۔ ورنہ محض تقریروں اور وہ بھی ایسے کلی مسائل کی تقریروں سے جو خالص علمی حقائق پر مشتمل ہوں، اصلاحِ نفوس کی راہیں استوار نہیں ہوتیں، یہ اس وقت کا مشغلہ ہے جب ذوقِ یقین سے قلوب معمور ہو چکے ہیں۔ دین کا رنگ قوتِ عمل اور صحبتِ صلحاء ہی سے قلوب پر چڑھ سکتا ہے۔ پس آپ حضرات کا فریضہ ہونا چاہئے کہ مادیت کے اس ہجوم میں روحانیت کو فراموشِ محض نہ کر ڈالیں۔

خلاصۂ بحث...... بہر حال اس تقریر سے اسلام کی حقیقت اور اس کی غرض و غایت بھی واضح ہو گئی کہ وہ انسان کو روحانی میدان میں دوڑا کر اسے دائمی رفعت و عزت اور طمانیت و بشاشت کی منزل تک پہنچا دیتا ہے کہ دائمی رفعت و عزت روحانیت ہی میں ہے اور پھر ساتھ ہی سائنس کی حقیقت اور اس کی غرض و غایت بھی سامنے آ گئی کہ وہ انسان کو مادی میدانوں میں چھوڑ کر انجام کار اسے ذلت و خسران کی طرف دھکیل دیتی ہے کہ محض مادیات کا انجام فنا و ذلت کے سوا کچھ نہیں اور آخر کار ایک سائنس زدہ نہ اپنے مادی منافع ہی کو باقی رکھ سکتا ہے اور نہ اسے روحانی منافع ہی نصیب ہوتے ہیں، نیز ''سائنس اور اسلام'' کی باہمی نسبت بھی واضح ہو گئی کہ ان میں وسیلہ و مقصود کی نسبت ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ جب تک سائنس کے کارنامے مذہب کے لئے خادم اور ذریعۂ تحصیل نہ بنیں گے، ان کا انجام خوش کن نہ ہوگا اور اسی کے ساتھ بطورِ ثمرہ یہ مقصد بھی حل ہو گیا کہ جب اسلام مقصود ہے اور سائنس اس کا وسیلہ، تو اسلام کی مقصودیت کا تقاضا یہ ہے کہ ترقی کا میدان اسلام کو بنایا جائے نہ کہ سائنس کو کہ ترقی ہمیشہ مقاصد میں کی جاتی ہے نہ کہ ذرائع اور وسائل میں، یعنی سائنس کے معمولات اسی حد تک اختیار کئے جائیں، جس

---

① پارہ: ۱۱، سورۃ التوبۃ، الآیۃ: ۱۱۹.

حد تک اسلام کو ان کی ضرورت ہے۔

مباحثِ تقریر کا ربط حدیثِ زیبِ عنوان سے……یہی وہ مقاصدِ سہ گانہ تھے، جن کی تشریح کا حدیثِ زیبِ عنوان کے دائرہ میں رہتے ہوئے میں نے ابتداءِ تقریر میں وعدہ کیا تھا کہ الحمدللہ ان مقاصد کی ایک حد تک توضیح و تشریح ہو چکی ہے۔ اب میں چاہتا ہوں کہ ان مقاصد کی اس طولانی بحث کو سمیٹ کر اور حدیثِ عنوان پر منطبق کر کے یہ واضح کر دوں کہ تقریر کی یہ تمام تفصیلات جو عرض کی گئی ہیں، اسی حدیث کے چند جامع اور بلیغ جملوں کی شرح ہیں اور صرف اسی کی تعبیرات سے مستنبط ہیں

سو بغور سنیئے کہ اس حدیث کی ابتداء میں اولاً تو ملائکہ کے سوال پر عناصرِ اربعہ کا تذکرہ فرمایا گیا ہے۔ جو عالم کا مادہ اور اس کے موالیدِ ثلاثہ (جمادات، نباتات، حیوانات) کی اصل ہے۔ جن سے یہ دنیا پیدا کی گئی ہے۔ پھر یہ تذکرۂ عناصر ایک ایسے بلیغ پیرایہ میں فرمایا گیا کہ ان کی شدت وضعف کے باہمی مراتب پر بھی ایک سیر حاصل روشنی پڑ گئی ہے کہ ان میں سے مثلاً مٹی سب سے زیادہ ضعیف ہے۔ اس سے قوی لوہا ہے، جو اجزاءِ ارضیہ میں سے ہے۔ اس سے اشد آگ ہے، اس سے اشد پانی ہے اور اس سے اشد ہوا ہے۔ یہ بیان "قَالَ نَعَمْ اَلرِّیْحُ" تک چلا گیا ہے۔

پھر ان مادی عنصروں سے منتقل ہو کر ان کے مرکب موالید کی طرف رخ فرماتے ہوئے موالید کے اعلیٰ ترین جزو انسان کی طرف توجہ فرمائی گئی اور بتلایا گیا کہ ان سب سے زیادہ اقویٰ اور اشد انسان ہے، جس کا ذکر "قَالَ نَعَمْ اِبْنُ اٰدَمَ" کے جملے سے فرمایا گیا ہے۔ جیسا کہ میں نے انسان کے افعال دکھلا کر واضح کر دیا ہے کہ انسان ہی وہ نوع ہے، جس کے اشاروں پر تمام مادیات اور سارے ہی موالید ناچ رہے ہیں۔

پھر ان مادیات سے منتقل ہو کر روحانیت کی طرف حدیث مبارک کا رخ ہوا اور بتلایا گیا کہ ابن آدم علی الاطلاق اشد اور اقویٰ نہیں بلکہ اس شرط کے ساتھ ہے کہ وہ روحانی بنے اور مادی نہ رہے، یعنی مادیات کو ترک کرتا ہو جس کا بیان تصدق صدقة میں فرمایا گیا ہے۔ کیوں کہ صدقہ ہی ترکِ ماسوا یا ترکِ مادیات کا نام ہے۔

پھر روحانیت سے منتقل ہو کر روح کے بھی اعلیٰ مقامات تجردِ خالص اور غوائلِ نفسانیہ سے برأت اور کثافتِ اخلاق سے پاکی، پھر لطافتِ اخلاق سے آراستگی کی طرف حدیث کا رخ ہوا اور بتلایا گیا کہ انسان کا محض صدقہ دے دینا، مادیات سے انقطاع کر لینا بھی کوئی چیز نہیں جب تک کہ اس میں خلوص اور قطعِ ریاء نہ ہو اور اسی کا نام اخفاءِ صدقہ ہے۔ جس کا بیان یُخْفِیْهَا میں فرمایا گیا ہے۔ یعنی محض صدقہ دہندہ سے وہ مخلص صدقہ دہندہ قوی اور شدید ہوتا ہے جس کے صدقہ میں ریاء ونمود کا دخل نہ ہو۔ گویا یہ صدقہ یا ترکِ مادیات محض حِسْبَةً لِلّٰهِ ہو اور یہ متصدق بجائے مادی ہونے کے روحانی بن کر صدقہ دے رہا ہو۔

پھر فرمایا گیا کہ مخلوق سے چھپا کر صدقہ کرنا بھی قوت وشدت کے لئے کافی نہیں جب تک کہ خود اپنے نفس سے بھی اس کو مخفی نہ رکھا جائے۔ یعنی اس میں خود بینی اور اعجاب وناز بھی شامل نہ ہو اور خود اپنے نفس میں اس کو کوئی

چیز بھی نہ سمجھ رہا ہو۔ گویا صدقہ دہندہ نفسانی ہونے کے بجائے نفس ربانی بن کر صدقہ کرے، تو وہ تمام عناصر اربعہ، تمام موالید، تمام انسانوں، تمام صدقہ دہندہ انسانوں پھر تمام مخلص اور بے ریا صدقہ دہندوں سے بھی اشد و اقویٰ ہوگا۔ اسی مقام کی طرف "یُخْفِیْهَا مِنْ شِمَالِهٖ" میں اشارہ فرمایا گیا ہے۔ یعنی اس درجہ مخفی صدقہ ہو کہ بائیں ہاتھ کو بھی خبر نہ ہو کہ دائیں ہاتھ نے کیا دیا اور کسے دیا؟ ①

پھر ظاہر ہے کہ استغناء اور ترک کی یہ کامل شان کہ آدمی نے دنیا ہی کو نہیں خود اپنے نفس کو بھی چھوڑ دیا ہو۔ جب کہ دنیا اور اپنے نفس کے دکھاوے کے لئے نہیں تو ظاہر ہے کہ بجز خدا کے اور کس کے دکھلانے کے لئے ہو سکتی ہے؟ اور جب کہ خدا کے لئے ہوئی، یعنی اس کامل للہیت نے یا بالفاظ دیگر صدقہ کی نسبت خدا کی طرف ہو جانے نے اس ضعیف البنیان صدقہ دہندہ میں وہ غیر معمولی طاقت پیدا کر دی کہ اس نے ساری مادیات اور اس کے عناصر و موالید کو مسخر کر لیا۔ تو اس سے صاف واضح ہو گیا کہ حقیقتاً قوی مطلق اور شدید مطلق صرف خدا ہی کی ذات ہے اور یہ کہ اسی کی طرف دوڑنے یا اسی کی نسبت پیدا کرنے میں ساری قوتیں اور شدتیں پنہاں ہیں۔

ادھر حدیث ہی کی ترتیب بیان سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ قوت و طاقت بقدر لطافت ہوتی ہے۔ تو یہ بھی حدیث ہی کی دلالت سے نکل آیا کہ جو خدا قوت و طاقت اور شدت کا مخزن ہے وہی لامحدود لطافت کا بھی مخزن ہے۔ چنانچہ اس کی لامحدود لطافت کا یہ عالم ہے کہ اسے نگاہیں بھی نہیں پا سکتیں۔

﴿لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ﴾ ② اس کو تو کسی کی نگاہ محیط نہیں ہوتی اور وہ سب نگاہوں کو محیط ہو جاتا ہے"۔ اس لئے حدیث سے گویا یہ اصول بھی مستنبط ہو گیا کہ قوی و متین صرف اللہ کی ذات ہے۔ پھر اس سے مناسبت پیدا کرنے کا طریقہ مادیات سے ہٹ کر روحانیت کی طرف آنا ہے، جس کا طریق صدقہ ہے۔ چوں کہ مخلص مصدق جو بلا عجب نفس اور بلا ریاء خلق صدقہ دے رہا ہے۔ اس سے کامل مناسبت پیدا کر لیتا ہے۔ اسی لئے وہی کامل لطافت کا حامل اور سب سے بڑھ کر طاقت ور ہو جاتا ہے۔

مباحث حدیث سے لطیف نتائج...... بہر حال حدیث کے اس مرتب بیان سے کہ ہر کثیف کو پہلے بیان کیا اور ہر لطیف کو اس کے بعد اور پھر ہر پچھلے کو پہلے سے اشد اور اقویٰ فرمایا۔ یہ ثابت ہو گیا کہ معیار شدت و قوت یہ وصف لطافت ہی ہے اور اس کی ترتیب طبعی یہی ہو سکتی تھی کہ مٹی سے لطیف لوہا، لوہے سے لطیف آگ، آگ سے لطیف پانی، پانی سے لطیف ہوا، ہوا سے لطیف انسان، عام انسانوں سے لطیف تارک الدنیا اور عام تارکین دنیا سے لطیف وہ تارک مخلص اور زاہد بے ریا انسان ہے، جس کا قلب شغل دنیا سے پاک، مادیات کی محبت سے بالاتر، مادی مشاقوں سے نفور، اور روحانی لطافتوں کا محور ہو، گویا وہ روحانی اور ربانی انسان ہی کامل لطافت کے حامل بن

---

① السنن للترمذی، کتاب التفسیر، باب ومن سورۃ المعوذتین، ج: ۱۱، ص: ۹۵، رقم: ۳۲۷۱.

② پارہ: ۷، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۱۰۳.

سکتے ہیں۔ جو بدنوں کے پالنے میں منہمک نہ ہوں بلکہ روحوں کی تکمیل میں لگے ہوئے ہوں اور مادی تصرفات کے بجائے روحانی اعمال ان کا شعار بن گئے ہوں۔

لطافتِ روح مذہبی بننے میں مضمر ہے...... اور یہ سب جانتے ہیں کہ ربانی بننے کے طریقے اور روحانی شعائر برپا کرنے کے ڈھنگ سکھلانا مذہب کا موضوع ہے نہ کہ سائنس کا۔ اس لئے اسی حقیقت کو دوسرے لفظوں میں یوں بھی ادا کر سکتے ہیں کہ لطیف تر اور قوی تر انسان وہی ہو سکتا ہے جو مذہبی ہو اور جس کا اوڑھنا اور بچھونا مذہب ہی مذہب ہو چکا ہو۔ اس لئے حدیث سے جہاں قوت وشدت کا معیار مستفاد ہوا کہ وہ لطافت ہے، وہیں حصول لطافت کا طریقہ بھی مستفاد ہوا کہ وہ مذہب ہے جو روحانیت کو مستحکم کر کے لطافت پیدا کر دیتا ہے اور اس طرح روح بادشاہ ٹھہر جاتی ہے۔ جو اس کا حقیقی منصب ہے۔ نفس اس مملکت کا خاکروب ٹھہرتا ہے، جو تقویٰ کے وسیلے سے سیئات کا کوڑا کرکٹ صاف کرے۔ چوریاں اور ڈکیتیاں کرتا نہ پھرے۔ عقل اس کا وزیر ٹھہر جاتی ہے جو مفید مشورے دے۔ وحیِ الٰہی اس کا حتمی قانون ٹھہر جاتی ہے جس سے راہ ملے اور اس طرح روح کی منظم حکمرانی سے روحانیت کا عدل چار دانگ اقلیم بدن میں پھیل جاتا ہے۔ چور اور ڈاکو مقید ہوتے ہیں، جن سے بدامنی پھیلی تھی، پھر ایسے مامون اور مضبوط ملک میں جس کا فرمانروا بیدار، وزیر دانشمند، قانون روشن اور عدل وانصاف کے سبب پوری اقلیم منظم ہو، نہ تو بیرونی دشمنوں کو حملہ کی ہمت ہوتی ہے کہ اس اقلیم میں گھس کر فتنہ وفساد مچائیں اور نہ اندرونی خائنوں اور چوروں کی جرأت ہوتی ہے کہ بدنظمی پھیلائیں، بیرونی دشمن، یعنی شیطان کے بارہ میں تو قرآن نے فرمایا کہ:

﴿إِنَّهُ لَيْسَ لَهُ سُلْطَانٌ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَلَى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ﴾① "یقیناً اس (شیطان) کا قابو ان لوگوں پر نہیں چلتا جو ایمان رکھتے ہیں اور اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں"۔ اور اندرونی دشمن یعنی نفس امارہ کے بارے میں فرمایا کہ وہ اپنی سرکشی چھوڑ کر خود ہی قانون کے تابع ہو جاتا ہے اور اسی پر مطمئن اور راضی بن جاتا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے: ﴿يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝ ارْجِعِي إِلَى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَرْضِيَّةً﴾② "اے اطمینان والی روح تو اپنے پروردگار کی طرف چل، اس طرح سے کہ تو اس سے خوش اور وہ تجھ سے خوش"۔

اسلام کی بنیادی حقیقت...... اب اس تمام مضمون کا حاصل یہ نکل آتا ہے کہ یہ سارا عالم دو حصوں میں تقسیم شدہ ہے، "مادیت اور روحانیت، یا سائنس اور اسلام" اسلام اور روحانیت کی بنیاد بحوائے حدیث دو اصول پر ہے۔ ایک ترک ماسوی اللہ جسے صدق سے تعبیر کیا گیا ہے، ایک اخلاق جسے اخفاء سے تعبیر کیا گیا ہے۔ پہلے اصول کا حاصل یہ ہے کہ خدا کے سوا دنیا ہو یا اپنا نفس اور ہوائے نفس سب کی وہ الفت قلب سے نکال پھینکنا جو الفتِ حق میں خلل انداز ہو، اور دوسرے اصول کا حاصل یہ ہے کہ اس ترک ماسوی میں خالص اسی ایک محبوب حقیقی کے راضی کرنے کا جذبہ کام کر رہا ہو جو اس ارض وسماء کی محفل کا خالق ہے۔ اس بارے میں، نہ خود بینی ہو، نہ خود نمائی، نہ خودی ہو، نہ خود ستائی۔

---

① پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۹۹۔ ② پارہ: ۳۰، سورۃ الفجر، الآیۃ: ۲۷۔۲۸۔

سائنس کی جڑ بنیاد کیا ہے؟...... اس کے بالمقابل سائنس کی بنیاد جو اسلام کے متقابل ہے۔ خود بخود ان دو اصولوں کی ضدوں پر نکل آتی ہے۔ ترکِ ماسوی کی ضد حبِ ماسوئی ہے اور اخلاص کی ضد نفاق ہے۔

جب ماسوئی کا حاصل یہ ہے کہ ہر غیر اللہ اور ہر باطل کی محبت ہو اور نہ ہو تو خدا اور حق کی محبت نہ ہو۔ چونکہ غیر اللہ کی محبت کے سلسلہ میں اپنا نفس سب سے مقدم ہے۔ اس لئے گویا سب سے پہلے اور سب سے زیادہ محبت اپنے نفس سے ہو اور نفس کو چونکہ تمام مادی لذائذ سے محبت ہے۔ اس لئے بواسطۂ نفس سارے مادی لذائذ سے محبت ہو جس کا نام دنیا ہے۔ گویا حبِ ماسوئی کا حاصل یہ ہے کہ نفس جاہل بوجہ حقیقت ناشناسی کے انہی مادی لذائذ کو جن کی صورت آراستہ ہے اور انجام گندہ ہے، اپنا منتہائے مقصود ظاہر کرنا چاہتا ہے۔

لیکن جب کہ فی نفسہ یہ مادی لذائذ کسی برتری اور انجام کی خوبی نہ رکھنے کے سبب اہل بصیرت کی نگاہوں میں باوقعت نہیں بنتے اور وہ ایسے دنی مانوں کو قابلِ ملامت ہی سمجھتے رہتے ہیں۔ اس لئے یہ نفوس اپنے خسیس مطلوبات پر اصول اور شائستگی کا پردہ ڈال کر انہیں معقول باور کرانے کی سعی کرتے ہیں۔

اور اس قسم کے تمام نفسانی جذبات کو جن سے مذاقِ سلیم کتراتا ہے، کمالات کا لباس پہنا کر سامنے لاتے ہیں تا کہ اپنے ان خسیس مطلوبات کو عام نگاہوں میں کچھ باوقعت بنا سکیں۔ مثلاً عام لہو و لعب اور بازاری رقص و سرور کو فنونِ لطیفہ کے عنوان سے پیش کرتے ہیں۔ منظم عیاشیوں اور بدکاریوں کو قانونی رنگ میں لے کر تہذیب و تمدن کا عنوان دیتے ہیں۔ استعمار اور جوع الارض کو خوشنما الفاظ میں پیش کر کے ترقی کا عنوان دیتے ہیں۔ جنگی آلات کی بے پناہ خون ریزیوں اور تباہی انسانیت کو جنگِ حق و صداقت اور قیامِ امن کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ وسائلِ عیش و طرب کی فراہمی کو سوسائٹی کی بلندی اور برتری سے تعبیر کرتے ہیں، پرستش اپنے نفس اور ہوائے نفس کی کرتے ہیں اور الفاظ کے چکر سے اسی کو حق کی پرستش دکھلاتے ہیں۔ عقیدت و اطاعت اپنے جذبات کی ہوتی ہے اور نام سچائی کی عقیدت کا لیتے ہیں۔

غرض یہ مادی نفوس اچھے عنوان سے فائدہ اٹھا کر اپنی ہوسناکیوں کو چھپانے اور انہیں خوبصورت لباس میں دکھلا کر باوقعت بنانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں حالانکہ حقیقت اس کے خلاف ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ نفاق کی حقیقت اس کے سوا اور کیا ہے کہ اندر کچھ ہو اور دکھلایا کچھ جائے، باطن گندہ ہو اور ظاہر کو آراستہ کیا جائے اور دیکھنے والوں کی نگاہوں کو دھوکہ اور فریب دیا جائے۔ مادی تمدن کی انہی خوشنمائیوں اور گندم نما جو فروشیوں کو قرآن کریم نے زینت کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے، جس کی حقیقت یہی ہے کہ اندر کچھ نہ ہو، مگر ٹیپ ٹاپ اور سطحی آرائش سے اس میں دلفریبی کافی پیدا کر دی جائے۔

ارشادِ حق ہے ﴿زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ، وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ

حُسۡنُ الۡمَاٰبِ﴾ ① ''خوشنما معلوم ہوتی ہے لوگوں کی محبت، مرغوب چیزوں کی عورتیں ہوئیں، بیٹے ہوئے، مویشی ہوئے، ڈھیر ہوئے سونے اور چاندی کے، نمبر لگے ہوئے گھوڑے ہوئے، مواشی ہوئے اور زراعت ہوئی، یہ سب استعمال کی چیزیں ہیں دنیوی زندگی کی اور انجام کار کی خوبی تو اللہ ہی کے پاس ہے''۔

اس میں شہوت پرستیوں، مالی ہوسناکیوں، اسباب مفاخرت و ریاست، غرض مالی تکاثر اور جاہی تفاخر کو زینت دنیا فرما کر بتلایا گیا ہے کہ ان تمام چیزوں زن، زر، زمین وغیرہ میں محض سطحی، عاجل اور ناپائیدار لذت ہے۔ ورنہ ان کی اندرونی حالت تیرہ و سیاہ ہے اور ان سب کی وابستگی کا انجام کدورت اور تلخی ہے۔ اگرچہ اس پر کتنے ہی پردے خوشنما اور دلفریب عنوانات کے لباس پڑے ہوئے ہوں۔ جس کا حاصل وہی بے حقیقت دکھلاوا ہے، جسے اصطلاحی لباس میں نفاق کہتے ہیں۔

اب اگر آپ غور کریں تو سائنس کے ان دونوں اصولوں حب ماسوی اور نفاق کی حقیقت باطل نکلتی ہے۔ نفاق کا باطل ہونا تو اس لئے ظاہر ہے کہ باطل کے معنی ہی یہ ہیں کہ دیکھنے میں بہت کچھ ہو اور حقیقت میں کچھ بھی نہ ہو۔ اوپر سے چمک رہا ہو اور اندر سے تاریک ہو۔ پس جب کہ نفاق کی بھی یہی کیفیت ہے کہ اندر کچھ ہو اور اوپر کچھ ہو تو نفاق کا باطل ہونا واضح ہے۔

ادھر ماسوی اللہ بھی باطل ہی کا ترجمہ ہے۔ کیوں کہ ہر ماسوی اللہ کی ہستی ظاہر ہے کہ اللہ ہی کے وجود دینے سے قائم ہوتی ہے۔ نہ وہ از خود قائم ہے اور نہ از خود موجود ہے۔ اس لئے حقیقتاً ماسوی اللہ کی ذات میں کوئی وجود یا کوئی کمال نہیں ہوتا بلکہ اس کے ذریعہ محض وجود حق اور کمالات حق کا مظاہرہ ہوتا ہے اور جب کہ ماسوی اللہ کا خواہ وہ نفس انسانی ہو یا دوسرے موالید عناصر اربعہ ہوں یا دوسرے اجزائے کائنات، خود ہی کوئی وجود نہ نکلا، تو وہ بظاہر تو موجود ہیں مگر کوئی ہستی ہی نہیں رکھتے۔ اس لئے کل کا کل ماسوی اللہ بھی اپنی ذات سے باطل ہی نکلا:

أَلَا كُلُّ شَيْءٍ مَا خَلَا اللّٰهَ بَاطِلٌ

اور جب کہ سائنس کی بنیاد انہی دو باطلوں پر تھی، ایک خدا سے قطع ہو کر ماسوی اللہ پر جو آفاقی باطل ہے۔ ایک نفاق پر جو نفسی باطل ہے تو پوری سائنس کی حقیقت بجز باطل ہونے اور باطل پسندی کے اور کچھ نہ ہوئی۔ جس پر سائنس دانوں کا یہ ناز اور شور و شغب ہے کہ اس سے ساری زمین اور آسمانی فضا گونج رہی ہے۔

ہاں اس کے بالمقابل اگر ماسوی اللہ کو ترک کر کے اللہ کو اختیار کیا جائے تو وہ حق ہے اور نفاق کو ترک کر کے اخلاص کو اختیار کیا جائے تو وہ بھی حق پر ہے اور اللہ کے ساتھ اسی مخلصانہ تعلق قائم کرنے کا ہی نام اسلام ہے، تو اسلام کی بنیاد ایسے حق پر نکلی ہے جس میں باطل کا نشان نہیں۔ اس لئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ سائنس تو ایک شور بے بنیاد اور باطل کا نام ہے، اور اسلام ایک حقیقت ثابتہ اور حق کا نام ہے، جس کی جڑیں مستحکم اور دائمی ہیں۔ باطل کا کلمہ

---

① پارہ: ۳، سورۃ آل عمران، الآیۃ ۱۴.

بے بنیاد، حق کا کلمہ اپنی بنیادوں پر راسخ ہے۔

﴿أَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ ○ تُؤْتِي أُكُلَهَا كُلَّ حِينٍ بِإِذْنِ رَبِّهَا ۗ وَيَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ○ وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيثَةٍ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْأَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ﴾ ① "کیا آپ کو معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کیسی مثال بیان فرمائی ہے کلمہ طیبہ کی کہ وہ مشابہ ہے ایک پاکیزہ درخت کے، جس کی جڑ خوب گڑی ہوئی ہو اور اس کی شاخیں اونچائی میں جا رہی ہوں، وہ خدا کے حکم سے ہر فصل میں اپنا پھل دیتی ہوں اور اللہ تعالیٰ مثالیں لوگوں کے واسطے اس لئے بیان فرماتے ہیں تا کہ وہ خوب سمجھیں، اور گندے کلمہ کی مثال ایسی ہے جیسے ایک خراب درخت ہو کہ وہ زمین کے اوپر سے اکھاڑ لیا جائے، اس کو کچھ ثبات نہ ہو"۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ...... مگر اس سے یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہئے کہ میں نفس سائنس اور اس کی ایجادات کو روک رہا ہوں یا سائنس کی تعلیم پر حرمت کا فتویٰ دے رہا ہوں یا اس میں اشتغال کلیتہً باطل ہے بلکہ مقصد وہی ہے جو مختلف عنوانوں سے تقریر کے ذیل میں آ چکا ہے کہ میں اسے قبلہ مقصود اور کعبہ مطلوب بنانے سے منع کر رہا ہوں۔ اگر یہ ساری جدوجہد جو آج سائنس کے سلسلہ میں کی جا رہی ہے، کسی حقیقی مقصود کے لئے ہو، وہ نہ صرف جائز ہی ہے بلکہ آج کے دور میں مطلوب ہے اور وہ مقصود نہ ساری دنیا ہے کہ وہ تو خود وسیلہ ہے، نہ مادی راحت و آرام ہے کہ وہ بھی وسیلہ ہے بلکہ ایک مسلمان کے لئے آخرت اور اس کی مذہبی دیانت ہی مقصود ہو سکتی ہے کہ وہی مقصود اصلی ہے اور اسی کے لئے انسان کی تخلیق عمل میں آئی ہے۔

پس سائنس مذہب سے بے تعلق رہ کر کلمہ خبیثہ ہے جس کے لئے کوئی ثبات و قرار نہیں اور مذہب کے ساتھ بحیثیت ایک خادم اور بطور ذریعہ مطلوب کے وابستہ ہو کر وہ بلاشبہ نافع اور کارآمد ہوگی اور کلمہ طیبہ ہی کے ذیل میں آ جائے گی جس کی جڑیں مضبوط اور شاخیں آسمان سے باتیں کر رہی ہوں

لیکن میں جہاں تک محسوس کرتا ہوں، آج سائنسی جدوجہد ایک حقیقی مقصود کی سی نظر آ رہی ہے، لوگ اس پر اسی کی خاطر جھک پڑے ہیں اور نہ صرف یہی کہ اس کے رد و قبول کا معیار مذہب کو نہیں بنایا گیا بلکہ بیشتر مواقع میں اسے مذہب کے خلاف استعمال کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ سائنس نے مذہب کی بنیادیں ہلا دی ہیں۔ اور گویا سائنس ایک ایسا مقصود ہے کہ مذہب اس کا وسیلہ تک بھی بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ چہ جائیکہ اس کا مقصود قرار پائے۔

بہت ممکن ہے کہ دنیا کے قدیم مذاہب کے لئے سائنس نے کوئی ایسا ہی تخریبی اقدام کیا ہو۔ مگر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ دنیا کے جس مذہب کے ایک ایک جزو کے ساتھ سائنس ساتھ رہ کر چل سکتی ہے، وہ نہ صرف مذہب فطرت یعنی مذہب اسلام ہے۔ اگر اس کی تفصیلات دیکھنی ہوں تو میں نے اس پر ایک مستقل رسالہ

---

① پارہ۔ ۱۳، سورۃ ابراھیم، الآیۃ: ۲۴-۲۶۔

''تعلیمات اسلام اور مسیحی اقوام'' لکھا ہے۔ جسے ''ندوۃ المصنفین'' دہلی نے شائع کیا ہے۔ جس میں دلائل واضحہ سے دکھلایا گیا ہے کہ سائنس کی تمام ایجادات درحقیقت اسلام کی معنویتوں کا مادی رخ ہیں اور اس دور میں اسلام کے تفہیم اور اس کے اقرب الی الفہم کرنے کے لئے ہی تکوینی طور پر سائنسی ترقیات کا وجود عمل میں آیا ہے۔ پس جو شخص سائنس کو اسلام کا وسیلہ بنا کر استعمال کرے گا وہ اسلام کو قوت پہنچائے گا اور جو اسے مستقلاً مقصود بنا کر عمل میں لائے گا وہ اپنے نفس کو ضعف اور ضرر پہنچائے گا، مگر اسلام کا اس سے کچھ نہیں بگڑ سکتا۔

طلبائے یونیورسٹی کے لئے مقامِ عبرت...... بہرحال جب کہ سائنس محض یعنی بلاتوسط مذہب کلمۂ خبیثہ ہے جس کی کوئی بنیاد نہیں اور اسلام کلمۂ طیبہ ہے جس کی جڑیں مستحکم اور ہستی پائیدار ہے تو ٹھیک نہاد اسلام فرزندوں کے لئے اس میں سے عبرت و موعظت پیدا ہوتی ہے کہ وہ اپنے اوقاتِ عزیز کو سائنس محض کی معلومات میں اس طرح نہ گنوائیں کہ وہ مقصودِ اصلی قرار پائے اور اس کی فانی لذات اصل ہو جائیں کہ یہ انجام کی ندامت کا سبب ہوگا۔ نیز وہ ان اقوام کی ظاہری چمک دمک اور ٹیپ ٹاپ پر فریفتہ نہ ہوں جنہوں نے آگ، پانی، ہوا اور مٹی کے گھروندوں میں سے کچھ چمکیلی چیزیں بنا کر دنیا کے لہو و لعب میں اضافہ کر دیا ہے کہ اس کی چمک دمک کی عمر بہت قلیل اور ہمیشہ قلیل ہی رہتی ہے۔

یہ سائنسی تمدن اور شہریت کی کر چاندنی ایک متاعِ قلیل اور اس تمدن میں منہمک رہنے والی اقوام کی زندگی بہت محدود اور چند روزہ ہے۔ وہ وقت بہت جلد آنے والا ہے کہ چمکیلی تہذیب اپنے ہی تمدن سے ٹکرائے اور اپنے ہی متمدنوں کو اس اندرونی تصادم اور ٹکر سے ختم کر ڈالے۔ ﴿لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِي الْبِلَادِ ۝ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ثُمَّ مَاْوٰهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمِهَادُ﴾ ①. ''تم کو ان کافروں کا شہروں میں چلنا پھرنا مغالطہ میں نہ ڈال دے، چند روزہ بہار ہے۔ پھر ان کا ٹھکانا دوزخ ہوگا اور بری ہی آرام گاہ ہے''۔

دیکھنے میں عناصرِ اربعہ بھی نہایت نظر فریب ہیں۔ آگ نہایت چمکیلی با کروفر اور حرارت کے دور رس اثرات کی مالک ہے۔ پانی دیکھنے میں چاندی کی طرح شفاف اور نمناکی کے پھیلنے والے اثرات کا حامل ہے۔ ہوا بظاہر لطافت کے سبب نہایت رقیق الجسم اور ہر جگہ بذاتِ خود منتشر اور موجود ہے۔ کرۂ زمین بحیثیت مجموعی نگاہوں میں نہایت باعظمت اور باشکوہ اور تاحدِ نظر پھیلا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ مگر اپنے جبلی اخلاق و آثار کی بدولت یہ چاروں ہی عناصر محتاج پسماندہ اور بے حد ذلیل ثابت ہوئے اور ان کی یہ ظاہری چمک دمک ان کی جوہری پستی کو نہ مٹا سکی جیسا کہ مفصل ثابت ہو چکا ہے۔

ٹھیک اسی طرح سمجھو کہ جس قوم یا سوسائٹی یا فرد پر ان مادی اخلاق کا غلبہ ہو اور وہ رات دن مادیات ہی کے جوڑ توڑ میں لگی رہے تو وہ قوم یا سوسائٹی گو بظاہر آگ کی سی چمک، پانی کا سا گوارا رنگ، ہوا کی سی دوررسی اور پھیلاؤ اور زمین کی سی ٹھوس عظمت کی مالک نظر آ رہی ہو۔ مگر اپنے ان مادی اخلاق کے سبب جو اس میں مادی اشغال کی

---

① پارہ: ۳، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۱۹۶، ۱۹۷۔

بدولت رہ چکے ہوں، اپنے کو انجام کی ذلت وخواری سے کسی طرح نہیں بچا سکتی جو آخرت سے پہلے دنیا میں اس کے سامنے آ کر رہے گی۔ کیوں کہ جس مادہ کی قسمت میں بدفطرت ہی سے کوئی عزت نہیں لکھی گئی، اس کی بنائی ہوئی قومی عمارتیں جتنی بھی زیادہ سر بفلک ہوں گی، اتنی ہی جلدی منہدم ہو جائیں گی۔

خاتمۂ کلام اور خلاصۂ نصیحت...... پس اے عزیزانِ ملت! آج کی نام نہاد متمدن اقوام کی ظاہری شوکت پر نہ جاؤ۔ ان کا ہلاکت آفرین انجام عنقریب ہی سامنے آنے والا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ خدا نہ کرے ان کی نقالی و تقلید سے تم بھی اس انجام کی لپیٹ میں آ جاؤ۔ ان اقوام کی طاقت آپ کے ضعف میں مضمر ہے نہ کہ خود ان کے کسی جوہر میں۔ روحانیوں نے میدان چھوڑ دیا تو مادیوں نے اسے آ دبایا۔ ورنہ جب دورِ اسلاف میں روحانیوں کی کثرت اور روحانی قومیت قائم تھی تو دنیا جانتی ہے کہ انہوں نے مادی عظمتوں کو کس طرح نیچا دکھایا اور مادی رفعتوں کی کیا گت بنائی ہے۔ اگر آج بھی آپ اپنی حقیقت پہچان کر حقیقت پسند بن کر جائیں تو وہ سابقہ عظمت لوٹ سکتی ہے ورنہ یہ صورتوں کی نمائشیں زیادہ دیرپا ثابت نہ ہو سکیں گی۔ بہرحال حدیث کی ایک حد تک شرح ہو چکی ہے اور سائنس اور اسلام کے موضوع کے عوارض یعنی دونوں کی حقیقت، دونوں کی غرض وغایت، دونوں میں مقصود و وسیلہ کی تعیین، دونوں کے طبعی اخلاق وخواص، دونوں کا انجام اور پھر دونوں کا مقتضا میں نے اپنی بساط کے موافق اس حدیث سے استنباط کر کے آپ کے سامنے پیش کر دیا اور جس عنوان کا بیان آپ حضرات نے مجھ پر عائد فرمایا تھا۔ الحمد للہ کہ میں اس سے ایک حد تک عہدہ برآ ہو چکا ہوں۔ اس لئے دعائے توفیق واستقامت پر اس بیان کو ختم کرتا ہوں۔

وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ اَوَّلًا وَّاٰخِرًا

احقر محمد طیب غُفِرَ لَهٗ وَلِوَالِدَيْهِ
مہتمم دارالعلوم دیوبند